متاعِ درد

رضیہ فصیح احمد

مقبول اکیڈمی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

طبع اوّل ——— ۱۹۶۹ء

طابع ——— ملک مقبول احمد

مطبع ——— اشرف پریس

قیمت ———

مقبول اکیڈمی لاہور

آپا کے نام

(۱)

ماجد صبح سے چپ تھا، بالکل چپ۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ پاس کی میز پر گلدان میں رات کی رانی کی شاخ کے ساتھ گلاب کے دو گلابی پھول اٹکے ہوئے تھے۔ یہ سسٹر گل نے صبح لگائے تھے۔ وہ اسے آپریشن کے لیے تیار کرنے آئی ہے تو کتنی اُداس تھی۔ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تپائی پر پڑے ہوئے ٹرانسسٹر میں نور جہاں گا رہی تھی۔

وطن کے سجیلے جوانو.......... میرے نغمے تمہارے لیے ہیں۔

رات دن ریڈیو میں قومی نغمے اور ملّی ترانے گائے جا رہے تھے اے عزیز ملّت.......... بڑھے چلو مجاہدین صف شکن ...... اور میرے ہوا باز.......... یہ نغمے کیسے جوشیلے تھے۔ کیسا خون میں

اُبال سا آجاتا تھا ابھی کل تک۔ ان نغموں کے بغیر بھی ان میں بلا کا جوش تھا۔ اس نسل کے اکثر سپاہیوں اور افسروں نے کسی جنگ میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ ہندوستان کا یہ حملہ ان کے لیے لڑائی کا بالکل پہلا تجربہ تھا۔ انہوں نے سُن رکھا تھا کہ جب تک پہلا فائر نہ ہو، پہلا بم نہ گرے سپاہی خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ان دھماکوں کے عادی ہو جاتے ہیں مگر ان کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ دشمن کے سامنے جاتے ہوئے انہیں ذرا بھی خوف اور جھجک نہیں تھی۔ جانے کیسے خدا نے ان کے دلوں کو جوش سے یوں بھر دیا تھا کہ انہیں (ایسا) خوف کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ چاروں طرف بم پھٹ رہے تھے اور وہ مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک بم ان کے مورچے میں آن کر گرا۔ وہ مٹی اور دھول میں اَٹ گیا۔ ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے کپڑے جھاڑے اور دیکھا کہ اس کے تو خراش بھی نہیں آئی مگر اس کے دو ساتھی خاک و خون میں لت پت پڑے تھے۔ موت کتنی سستی، کتنی عام ہو گئی تھی اور اس نے جسے ساتھی جذباتی اور شاعر ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے کتنے اطمینان سے ان کی نبض دیکھی تھی۔ ایک شہید ہو چکا تھا مگر دوسرے کا سانس چل رہا تھا۔ اس نے اسٹریچر بیرر کو زور زور سے پکارا کہ وہ آ کر زخمی کو لے

جائیں مگر برستی گولیوں کی آگ میں کوئی نہ نکلا۔ تب بڑے اطمینان سے
وہ مورچے سے باہر نکل آیا۔ اس کو دیکھ کر ایک سپاہی بھی لپکا۔ اس
کی مدد سے اس نے زخمی کو اُٹھایا اور مزے سے پیچھے خیمے میں جہاں
فرسٹ ایڈ کا انتظام تھا چھوڑا اور پھر آکر اپنے مورچے میں ڈٹ گیا۔
دل کو کیسا اطمینان اور سکون سا تھا یا اس وقت یہ دل بے حس ہو گیا
تھا کہ اس میں محسوس کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ چاروں طرف
آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ مشین گن کی آواز ڈھڑ ڈھڑ ڈھڑ ڈھڑ ڈھڑ۔
سنسناتی ہوئی گولیوں کی آواز چیوں چیوں، مارٹر کی آواز جس کے بعد
وہ سانس روک کر انتظار کرتے کہ دیکھیں کہاں گرتا ہے اور بموں کے
دھماکے۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے یہ ساری آوازیں وہ ازل سے سُنتے
آئے ہوں۔ آس پاس گرتے ہوئے اور شہید ہوتے ہوئے لوگ
بھی بس دل کو یونہی سا مسوس دیتے تھے۔ کتنے دن اسے ماں اور
بہنوں میں سے کوئی بھی تو یاد نہ آیا تھا۔

پھر وہ دشمن کے علاقے میں گھس گئے۔ دشمن نے پہلے ڈٹ
کر مقابلہ کیا پھر بھاگ نکلا۔ رات کا وقت تھا کیسی افراتفری پھیلی
ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ ان کے جوان دشمنوں کی جیپوں
پر قبضہ کر کے انہیں بھگائے لیے چلے جا رہے تھے۔ انہیں میں اس نے

اپنی جیپ بھی دیکھی جسے اس کے ڈرائیور کے بجائے کوئی اور سپاہی چلا رہا تھا۔ جیپ روک کر اس نے جوان سے پوچھا کہ اسے ایسی کی جیپ کہاں سے ملی۔ جوان سمجھا کہ صاحب مفت ایسی جیپ ہتھیانے کی فکر میں ہے۔ اس نے کہا۔ صاب اُدھر بہت جیپ پڑا ہے آپ بھی لے آؤ جاکر۔ اور اُسے غصہ آگیا۔ کیا بکتے ہو تم! یہ میری جیپ ہے یہ میرا بریف کیس ہے یہ میرا تھرماس ہے، نیچے اُتر کر دیکھو، یہ تمہیں کہاں سے ملی؟

جوان گھبرا کر نیچے اُتر گیا اور ایک زوردار سلیوٹ کے بعد بتایا کہ یہ جیپ دشمن کی جیپوں کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنی چیزیں دیکھیں اور شکر کیا کہ اس کے نقشے اور سارا سامان جوں کا توں موجود تھا۔ پھر وہ اس جوان کو لے کر اس جگہ گیا جہاں سے جیپ ملی تھی۔ واقعی وہ دشمن کا علاقہ تھا جو اس نے ابھی خالی کیا تھا شاید ڈرائیور راہ بھول کر گڑبڑ میں دشمن کے علاقے میں چلا گیا تھا۔ ڈھونڈنے پر اسے ڈرائیور کی نعش ایک تھری ٹن کے سائے میں پڑی مل گئی تھی۔ اس دن اس کی آنکھ سے دو آنسو نکلے تھے یا شاید ایک۔ اپنے ڈرائیور، اپنے ہر وقت کے ساتھی کو دفن کرنے کے بعد وہ جیپ لے کر اپنے ٹھکانے پر آگیا تھا۔ انہوں نے دشمن کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور اس دن وہ پھولے نہیں

سمائے تھے۔ اُس رات کتنے ہی دن بعد وہ تھک ہار کر سویا تھا، یوں سویا تھا جیسے مر گیا ہو۔ رات کو گولیوں کی اکا دکا آواز آتی رہی تھی مگر وہ سوتا رہا تھا۔

دوسرے دن جانے کیسے یہ خبر پھیل گئی تھی کہ دشمن کی ایک جیپ ان کے علاقے میں پھر رہی ہے۔ اس کا راستہ روک کر اسکے آدمیوں کو گھیرنا ہے۔ وہ اپنے کمانڈر سے ہدایات لینے ہیڈ کوارٹر جا رہا تھا کہ اچانک سڑک پر ایک کٹا ہوا درخت اس کی جیپ کے سامنے آگیا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اُتر کر اسے ہٹانے کی کوشش کی تو دھڑا دھڑ گولیاں آنے لگیں۔ وہ وہیں لیٹ گئے مگر وہ جگہ بہت خطرناک تھی۔ شور مچا کر یہ بتاتے ہوئے کہ وہ دشمن کے آدمی نہیں ہیں وہ واپس جیپ میں جا بیٹھے۔ جیپ کے ٹائر چھلنی ہو چکے تھے۔ ہوا نکلے پہیوں کو اسی طرح گھسیٹتے وہ آگے بڑھے۔ تھوڑی دور پر سڑک پھر بند تھی اور ان کی یہ صدائیں کہ وہ دشمن نہیں ہیں صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اُتر کر زمین پر لیٹیں گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی ٹانگ کو چیر دیا اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ چکنے فرش اور چکنی دیواروں والے اسپتال میں چمڑے کی اس نیچی سی پلنگڑی پر پڑا تھا جس میں چار

پہیے لگے ہوئے تھے اور جسے اسپتال والے ٹرالی کہتے تھے۔ اس کے پاس ہی اور بہت سے زخمی ایسی ہی ٹرالیوں پر پڑے تھے۔ ان کے ہیورسیک فرش پر رکھے تھے۔ ان کی رائفلیں دیوار سے لگی کھڑی تھیں ان کے چہرے زرد اور ستے ہوئے تھے۔ بعض کی پیشانیاں پسینے سے تر تھیں۔ سرنگ جیسے لمبے پتلے کوری ڈور میں جہاں روشنیوں کی ٹیوبوں پر کالے پردے لٹکے ہوئے تھے وہ سب عجب غیرانسانی مخلوق نظر آرہے تھے۔ عام زخمیوں کی طرح کسی زبان پر آہ ربکا نہیں تھی سب تکلیف وہ حد تک خاموش تھے جیسے وہ زندہ نہیں مردہ ہوں۔ وہ خود بھی خاموش تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور سفید سفید پٹیاں خون سے گلنار ہو رہی تھیں۔ اس کے نزدیک لیٹے ہوئے شخص کے پیٹ میں پہلی طبی امداد کے طور پر ٹھونسی ہوئی سفید گاز اب خون سے سرخ ہو کر یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی بے حد بڑا سا گلاب کا پھول کھلا ہوا ہو۔ ایک طرف دشمن کے زخمی سپاہی بھی تھے جو چپ چاپ پڑے چھت کو تک رہے تھے اور باری باری اپنا نام نمبر لکھوا رہے تھے، ان کے چہروں پر عجب دکھ بھری مایوسی تھی۔

اس اسپتال میں تین آپریشن تھیٹر تھے اور تینوں بھرے ہوئے تھے۔

تینوں سرجن تھے اور تینوں بے حد مصروف۔ لڑائی کے ان دنوں میں انہوں
نے ہزاروں آپریشن کر ڈالے تھے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی مریض تیار
رہتا تھا۔ انہیں کھانا کھانے کا وقت بھی نہ ملتا تھا۔ کبھی دو بجے رات
کو شام کا کھانا کھاتے تو چھ بجے شام کو دوپہر کا۔ سارے اسپتال میں
ہر شخص ہر وقت مصروف رہتا تھا مگر کام پھر بھی نہیں نمٹتا تھا۔ کتنی
ہی نرسیں دوسرے ہسپتالوں سے آگئی تھیں، چند خواتین اور لڑکیاں بھی
مدد کرنے آتی تھیں مگر کام بھی تو بے حد تھا، بے حد و بے حساب۔ زخمی
ایسے ایسے زخمی جن کو دیکھا نہ جاتا اور جلے ہوئے ایسے ایسے جلے ہوئے
جن کے پورے انگ میں ایک پور بھی ایسی جگہ نہ تھی جو جلنے سے رہ
گئی ہو۔ جہاں ہاتھ رکھ کر ڈریسنگ کی جا سکتی ہو یا انجیکشن لگایا جا سکتا
ہو۔ تین تین گھنٹے ایک آدمی کی مرہم پٹی میں لگتے تھے۔ نرسوں کی
نازک کمریں جھکے جھکے تھک جاتی تھیں مگر وہ بھی انتھک محنت سے
دن رات کام کر رہی تھیں۔ ہزار ہر طرح کے مریض ان کی نظر سے
گزرے تھے مگر اپنے وطن کے ان جیالے سپوتوں کی ایسی حالت میں
دیکھ کر ان کا دل آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ ہٹے کٹے کڑیل خوبصورت
جوان مگر اب کسی کی ایک آنکھ غائب ہے تو کسی کا چہرہ جھلس کر پہچانا
نہیں جاتا اور کسی کا سارا بدن جلے ہوئے داغوں سے چھینٹم چھانٹ

ہو رہا ہے ۔ کسی کے سارے جسم سے کھال کھنچ گئی ہے اور سرخ سرخ گوشت کا ملبہ سفید بستر پر دھرا ہے جیسے روسٹ کی ہوئی مرغی ۔ کسی کا بازو نہیں ہے کسی کی ٹانگیں نہیں ہیں اور کسی کا سب کچھ ہے مگر نہ ہونے کے برابر۔

اُس وقت ماجد کا شمار ان زخمیوں میں نہیں تھا جن کی حالت خطرناک ہو اس لیے ایک ڈاکٹر نے اس کی ٹانگوں کی پٹیاں کھولیں۔ از سر نو مرہم پٹی کی اور اسے آفیسر وارڈ میں بھیج دیا گیا ۔ دوسرے دن اس کی آنکھ دیر سے کھلی ۔ آنکھیں پٹپٹا کے اس نے دیکھا ۔ اسپتال میں صبح کی گہما گہمی کے بعد جو سکون سا ہوتا ہے کمرے میں وہی سکون تھا ۔ کوئی کسی طرف بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا، کوئی آنکھیں بند کیے آرام سے لیٹا تھا ۔ اس نے کروٹ لے کر برابر کے پلنگ کو دیکھا اور اس کا دل اچانک زور سے دھڑک اُٹھا ۔ ارے رہی .... بعض وقت کی کہی ہوئی باتیں کیسی صحیح ہو جاتی ہیں، اس دن مذاق ہی میں اس نے کہہ دیا تھا " شاید میں کبھی بیمار ہو کر یہاں آؤں "، اور آج وہ واقعی یہاں موجود تھا ۔ پتہ نہیں گل اسے پہچانی تھی یا نہیں اس وقت تو ایک نئے زخمی افسر کے پاس بیٹھی تھی، جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی ۔ اور اصرار کر رہی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے کھانا کھائے

اور وہ لڑکا شرما کر کہہ رہا تھا کہ وہ خود کھا لے گا........ مگر گل کے اصرار کے آگے وہ ہار گیا۔ مسز گل اسے انڈا کھلانے لگیں اور وہ چپ چاپ بچوں کی طرح منہ کھول کر کھاتا رہا۔ ماجد کا دل چاہا کاش یہ لڑکا وہ خود ہوتا اور گل اسے یوں اصرار کر کے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی۔ وہ بڑے غور اور دکھ سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ لڑکا شاید سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوگا یا لیفٹیننٹ، بالکل کالج اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ جانے بیچارے کی آنکھیں رہیں یا ختم ہوگئیں اور پھر گل کتنے پیار سے اسے ناشتہ کروا رہی ہے۔ شاید اسے اس نوجوان پر بڑا ترس آ رہا ہے ناشتہ ختم کروا کے وہ اس کے پاس آئی۔

"آپ بڑی دیر سے اُٹھے، کیسی طبیعت ہے؟"

"آپ مجھے پہچانیں؟" جواب میں ماجد نے اس سے سوال کیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا شاید آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو، شاید میں کبھی بیمار ہو کر یہاں آؤں۔"

"اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے آئیے اُٹھیے میں آپ کا منہ ہاتھ دھلوا دوں۔"

ماجد نے اس کی طرف دیکھا اور تعمیل حکم میں اُٹھ بیٹھا۔ آج بھی اس لڑکی کی آنکھیں اسی طرح سلگ رہی ہیں۔ ایسی سلگتی ہوئی آنکھیں

تو اس نے کسی اور کی نہ دیکھی تھیں۔ آنکھیں ہی نہیں اس کا جسم بھی تو سلگتا تھا۔ اس دن وہ سارے راستے اس دھیمی آنچ میں جلتا آیا تھا۔ یہ کئی مہینے پہلے کی بات تھی۔ وہ لاہور سے بس میں آ رہا تھا۔ وہ سب سے آگے کی تنہا سیٹ پر بیٹھی تھی، صرف اس کی پیٹھ اور بال دکھائی دے رہے تھے۔ پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ راستے میں حسبِ معمول بس خراب ہو گئی اور ڈرائیور، کلینر اور کنڈکٹر سب اس کے ٹھیک کرنے میں جٹ گئے۔ مسافر کچھ اُتر کر حوائج ضروری سے فارغ ہونے لگے، کچھ چل پھر کر ٹانگیں سیدھی کرنے لگے۔ وہ بھی اُتر گیا اور ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ جب خاصی دیر گزر گئی اور بس ٹھیک ہوتی نظر نہ آئی تو اس نے سوچا کہ اب کچھ اور بندوبست کرنا چاہیئے۔ وہ اپنا چھوٹا سا بیگ اُٹھا ذرا فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ ایک سفید جیپ گزری تو اس نے ہاتھ دیا۔ اس بھلے مانس نے جیپ روک لی۔ یہ شخص کراچی سے آ رہا تھا اور پنڈی ہی جا رہا تھا۔ جیپ کے پچھلے حصّے میں جانے کیا انٹمبار بھرا تھا۔ وہ بڑی خوشی سے ماجد کو اپنے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گیا۔ اس وقت بڑے پر وقار قدموں سے چلتی ہوئی گل وہاں آئی اور ماجد سے مخاطب ہوئی کہ کوئی حرج نہ ہو تو وہ اسے بھی ساتھ لے چلے۔ صبح اس کا ڈیوٹی پر پہنچنا ضروری ہے، اسی وقت اس نے

اپنا نام بتایا اور یہ کہ وہ .... کے ملٹری اسپتال میں سسٹر ہے۔
ماجد کو یہ بات عجیب بھی لگی تھی اور اچھی بھی کہ اس نے جیپ کے مالک کے بجائے اسے مخاطب کیا تھا۔ اخلاقاً اس نے کہا تھا "جیپ ان کی ہے ان سے پوچھ لیجئے۔" گل کے پوچھنے سے پہلے ان صاحب نے بچھنے کے انداز میں کہا تھا "ہاں ہاں ضرور، راستے ہی میں تو ہے، ہم آپ کو چھوڑتے جائیں گے۔" جیپ میں پیچھے بالکل جگہ نہیں تھی اس لیے سب کو آگے ہی بیٹھنا پڑا۔ جب صاحب جیپ اسٹیرنگ پر بیٹھ گئے اور اس نے گل سے بیٹھنے کو کہا تو اس نے بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہا "آپ بیٹھئے میں کنارے پر بیٹھوں گی۔" ماجد کو اس کی یہ بات بھی بڑی اچھی لگی تھی کہ اس نے درمیان میں بیٹھنے کے بجائے اس کے پاس بیٹھنا پسند کیا تھا۔ سڑک کے رحمدل موڑوں پر گل کا جسم اس کے جسم سے مس ہو جاتا تھا اور اس کے سلگتے ہوئے بدن سے خود اس کے جسم میں چنگاریاں سی سلگ اٹھتی تھیں۔ وہ سکڑی سمٹی نہیں بلکہ بڑے اطمینان اور بردباری سے بیٹھی تھی جیسے دو اجنبی مردوں کے ساتھ بھی اسے اپنے تحفظ کا پورا پورا یقین ہو۔ وہ خود سے کیے گئے سوالوں کے جواب بھی دیتی اور کبھی کبھی ان کی باتوں میں شریک بھی ہو جاتی۔ اور جب وہ خالص مردانہ قسم کی یعنی اپنے اپنے کاموں کی باتوں میں مشغول ہوتے تو

وہ خاموش بیٹھی سیدھ میں دیکھتی رہتی۔ بظاہر معلوم ہوتا جیسے دونوں مردوں نے اس کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر توبہ کیجئے اس کی آنکھیں اور اس کا جسم کہیں نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہر لمحہ سامنے دیکھتی ہوئی وہ لمبی لمبی پلکوں والی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں ہم یہاں ہیں اور ہر لحظہ وہ جسم پکار رہا تھا میں یہاں ہوں، میں یہاں ہو۔ خاص سڑک کو چھوڑ کر......

چھاؤنی کی نئی چوڑی خوبصورت سڑک پہ مڑ کر وہ ملٹری اسپتال کے علاقے میں سسٹرز میس کے سامنے جا ٹھہرے تھے۔ مغرب کا وقت گزرے دیر ہو چکی تھی، ہر طرف تاریکی تھی جس میں اسپتال اور گھروں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میس کے نوکروں کے آتے آتے خود ماجد نے گل کا سامان اتار کر میس کے دروازے کے نزدیک رکھ دیا تھا۔ "معاف کیجئے ہمیں دور جانا ہے۔" اس نے کہا تھا۔

"ارے آپ نے کیوں تکلیف کی....... آپ کی بڑی عنایت۔" اس نے اپنی میٹھی آواز میں کہا۔ اسی میٹھی آواز کی شہ پاکر اس نے کہا تھا۔ "دیکھیے شاید پھر کبھی ملاقات ہو...... شاید کبھی بیمار ہو کر میں یہاں آؤں۔"

"ضرور، بڑی خوشی سے......." اس نے شرارت اور مٹھاس سے کہا تھا۔ اور آگے بڑھ کر جیپ والے کا شکریہ ادا کیا تھا۔ فوجی افسر

کو یوں بے تکلفی سے بات کرتے دیکھ کر اس سویلین کی ہمت بھی بڑھ گئی تھی: "مجھ بے چارے کے لیے تو بیمار پڑ کر یہاں آنے کی گنجائش بھی نہیں، آپ لوگ ہم سویلین لوگوں کو تو داخل ہی نہیں کرتے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں، حادثہ شدید ہو اور نزدیک کوئی اور اسپتال نہ ہو تو ہم دوسرے لوگوں کو بھی داخل کر لیتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا، پھر دفعتہً وہ سنجیدہ ہو گئی تھی اور اس نے کہا تھا۔ "بری باتیں منہ سے نہیں نکالنی چاہئیں، آپ کو معلوم ہے بعض دفعہ کی کہی ہوئی بات سچ ہو جاتی ہے۔" پھر وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی۔ اور باقی سارے راستے اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اب بھی وہاں بیٹھی ہے، اس کے جسم کی آنچ اب بھی اس تک پہنچ رہی ہے اور اس کی سلگتی ہوئی آنکھیں اب بھی سامنے دیکھ رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان آنکھوں میں کوئی دکھ بھرا راز چھپا ہو۔ اس دن بھی اس نے سوچا تھا اور آج بھی جب وہ جھک کر اس کا بستر ٹھیک کر رہی تھی اسے یہی خیال آیا تھا۔ واقعی بعض وقت کی کہی ہوئی بات سچ ہو جاتی ہے اور آج وہ زخمی ہو کر اسی اسپتال میں موجود تھا۔ اس کا بستر ٹھیک کر کے اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر دروازے کی طرف بڑھی: "میں ابھی آپ کا ناشتہ بھجواتی ہوں۔" چلتے چلتے

اس نے ماجد سے کہا۔

گل کے چلے جانے کے بعد اس نے اس خوش قسمت لیفٹیننٹ
کی طرف دیکھا جسے گل نے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا تھا۔ وہ سفید
تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھوں پہ بندھی ہوئی سفید پٹی کے
اوپر اور نیچے اس کا سرخ و سفید رنگ جھلک رہا تھا اور اس کی
قدرے بڑھی ہوئی شیو اسے اور کم عمر بنا رہی تھی۔ ماجد کا دل اس سے
بات کرنے کو چاہا۔ اس نے کہا کہ وہ ہل نہیں سکتا ورنہ اس کے پاس
آتا۔ وہ نوجوان ہنسا اور بولا "میری آنکھوں پہ پٹی بندھی ہے ورنہ میں
ہی آپ کے پاس آجاتا سر" اس کا سر کہنا ماجد کو بڑا اچھا لگا۔ لفظ
"سر" جو ہر فوجی افسر کی کمزوری ہے۔ گل کے اس اصرار سے کھانا کھلانے
کے بُرے اثرات تھوڑے سے اور ڈھل گئے اور اس نے بڑی
دلچسپی سے پوچھا "آپ کس محاذ سے آئے ہیں؟ کچھ اپنا حال سنایئے"

"میں چونڈہ سے آرہا ہوں۔ اصل میں ہم لوگ جسڑ کی طرف جا
رہے تھے مگر جب ۷ اور ۸ کی درمیانی رات کو چونڈہ پہ حملہ ہوا تو
ہماری پیشقدمی روک دی گئی اور کمانڈنگ افسر کو ہیڈ کوارٹر میں
بلایا گیا۔ اس وقت بوڑھے جوان، بچے اور عورتیں اپنے اپنے گاؤں سے
نکل کر چیختے چلاتے سیالکوٹ کی طرف جا رہے تھے۔ سی، او ہیڈ

کوارٹر سے آرڈر لے کر لوٹے تو انھوں نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ کے سپرد بڑا مشکل اور اہم کام کیا گیا ہے، ہمیں دشمن کی پیشقدمی کو روک کر آگے بڑھنا ہے۔" ذرا دیر بعد ہم چونڈہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے اور وہاں کے لوگ ہماری فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے اور جوش سے نعرے لگا رہے تھے۔ ہم بڑی تیزی سے دشمن پر جھپٹے اور شام تک اسے روندتے ہوئے چوبارہ گاؤں پہنچ گئے۔ یہاں پر دشمن کے ہیڈ کوارٹر سے ہمیں اس کا آپریشن آرڈر اور چند دوسرے کاغذات ملے۔ پھر ہم نے چوبارہ سے ذرا ہٹ کر دفاعی پوزیشن لی، یہاں دشمن نے بھرپور حملہ کیا مگر بری طرح مار کھائی، سینکڑوں نعش چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اسی حملے میں ایک گرینڈ میرے نزدیک آکر پھٹا گرمی اور دھوئیں سے میری آنکھیں جھلس گئیں اور مجھے یہاں بھیج دیا گیا۔"

ماجد کا پہلے بھی دل چاہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے بارے میں پوچھے مگر وہ اس خیال سے ٹال گیا تھا کہ اس تکلیف دہ موضوع کا نہ چھیڑنا ہی اچھا ہے جب اس نے خود ہی ذکر کیا تو ماجد سے نہ رہا گیا۔

"کیا کہتے ہیں ڈاکٹر آپ کی آنکھوں کے بارے میں؟"

"کہتے ہیں زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی، میں بھی بس چینی سے واپس جانے کا انتظار کر رہا ہوں..... آپ کہاں تھے؟"

"میں چھمب اور جوڑیاں کی فتح اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں"۔

"بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔"

اسی وقت سسٹر گل ہاتھ میں ایک ٹرانزسٹر اور چند کتابیں تھامے آئی۔ ماجد نے اسے متوقع انداز میں دیکھا مگر وہ آگے بڑھ کر لیفٹیننٹ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ "آج تحفوں میں بہت سی چیزیں آئی ہیں، یہ ٹرانزسٹر میں آپ کے کمرے کے لیے لے آئی ہوں، آپ کچھ پڑھ بھی نہیں سکتے نا، بور ہوتے ہوں گے۔"

"شکریہ۔" لیفٹیننٹ نے ہاتھ پھیلا کر خوشی سے ریڈیو تھام لیا آنکھوں پہ پٹی بندھے ہونے کی وجہ سے اس کا ہاتھ گل کے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ گل نے بغیر کچھ محسوس کیے اپنا ہاتھ آہستہ سے الگ کر لیا اور ٹرانزسٹر اسے دے دیا۔ ماجد یہ منظر بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ لیفٹیننٹ نے لمحہ بھر اسے تھامے رکھا پھر کچھ سوچ کر بولا "سسٹر اسے درمیانی میز پر رکھ دیجیے اور گیارہ بج گئے ہوں تو خبریں لگا دیجیے۔" ماجد کو اس لیفٹیننٹ کا گل کو سسٹر کہنا بڑا اچھا لگا۔ لڑکا معقول ہے۔

اس نے دل میں سوچا۔ گل نے اپنی نازک سی گھڑی دیکھی اور کہا۔ "ابھی گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ اس نے ٹرانزسٹر درمیانی تپائی پر رکھ دیا اور پھر وہ اس کے پاس آئی۔

"آپ کے لیے میں کتابیں لائی ہوں، آپ کو پڑھنے کا شوق ہے؟"

"بہت، کہاں سے آئی ہیں یہ کتابیں؟"

"لوگوں نے دی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے ٹو۔ آئی۔ سی کے دفتر میں تحفوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، کھانے پینے کی چیزیں، کپڑے، روزمرہ استعمال کی چیزیں اور کتابیں بھری پڑی ہیں، یہ میں وہیں سے لا رہی ہوں ابھی میجر حق سے بات ہو رہی تھی کہ ناول وغیرہ تو خیر لوگ پڑھ لیں گے مگر یہ شعر و شاعری کی کتابیں کون لے گا۔"

"شعر و شاعری کی کتابیں آپ مجھے لا دیا کریں۔"

"آپ کو شاعری سے دلچسپی ہے؟"

"جی ہاں، آپ کو معلوم ہے میرے ساتھی کہا کرتے تھے تم اتنے جذباتی ہو تمہیں فوج میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہیں تو شاعر ہونا چاہیے تھا۔"

"اچھا۔" گل ہنسی۔ "کیا آپ واقعی جذباتی ہیں؟"

"بہت!"

گیارہ بج گئے تھے سب خاموشی سے خبریں سُننے لگے۔ خبریں تو آجکل ایسی خاموشی اور دلجمعی سے سُنی جاتی تھیں کہ بڑے سے بڑے آدمی کی تقریر نہ سنی جاتی ہوگی۔ ریڈیو اور اخبار زندگی کی اہم ترین ضرورت بن گئے تھے بلکہ اخبار کی وہ پہلی اہمیت اس لیے نہیں رہی تھی کہ خبریں پل پل میں بدلتی تھیں اور ایک دن پرانی خبریں یوں لگتی تھیں جیسے کوئی برسوں پرانی بات دہرا رہا ہو، اسی لیے اس کمرے کے سارے مریض سسٹر گل کے احسان مند تھے جو ان کے لیے وقت کی سب سے اہم چیز لے کر آئی تھی وہ خود بھی خبریں سُننے کے لیے کمرے میں کھڑی ہوئی تھی اور ساتھ ہی مختلف چیزیں ترتیب سے رکھتی جارہی تھی، ماجد کی نظریں بڑی خاموشی سے اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ خبریں ختم ہوئی ہی تھیں کہ ہوائی حملے کا سائرن ہونے لگا۔

"سائرن ہو رہا ہے سسٹر، آپ ٹرنچ میں جائیے۔" کرنل بخاری نے کمرے کے دوسرے سرے سے کہا۔

گل مسکرائی۔ "ہم تو آج تک کبھی ٹرنچ میں نہیں گئے۔"

"تو کیا سائرن بجنے پر نرس اور ڈاکٹر خندقوں میں نہیں جاتے؟" ماجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں جاتا، سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

آپ لوگوں کو چھوڑ کر ہم کیسے چلے جائیں، دوسرے کسی کے پاس اتنا وقت بھی تو نہیں کہ بار بار جا کر کئی کئی منٹ کے لیے وہاں بیٹھا رہے۔"

"خندقیں کھدی ہوئی بھی ہیں؟" لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

"جی ہاں بڑی گہری پکی خندقیں ہیں، جنہیں اُترنے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ ہم سب ایک دفعہ تفریحاً انہیں دیکھنے گئے تھے پھر کبھی جا کر جھانکا تک نہیں۔"

"کمال ہے۔" کرنل بولے۔ "میں آپ کو یہ بتا دوں سسٹر کہ یہ ہسپتال بہت بڑا اور بہت اونچا ہے، دُور سے نظر آتا ہے اور ہمارے دشمن اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ جہاں وہ بم برسا رہے ہیں وہ شہری آبادی ہے یا اسپتال ہے۔"

"آپ مجھے کیوں ڈرا رہے ہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "جو سب کا حال ہو گا وہی ہمارا ہو گا، یہ کتنی بری بات ہو کہ جو لوگ چل نہیں سکتے ان کو چھوڑ کر ہم بھاگ جائیں۔" اس کے اس جملے میں بڑائی یا غرور نہیں تھا عام سے لہجے میں یہ بات کہہ کر وہ اطمینان سے باہر چلی گئی۔ اس وقت ہوائی حملے کا خطرہ ٹل جانے کا سائرن بج رہا تھا۔ اس دن سارا دن ان کے کمرے میں ٹرانزسٹر بجتا رہا، جوشیلے نغمے، کارآمد اعلانات اور اہم خبریں ہوتی رہیں۔ ریڈیو نے بھی سب کی طرح سرتاپا روپ بدل لیا تھا اور

لوگ اس کے گرد ایسے بیٹھے رہتے تھے جیسے شمع کے گرد پروانے جب تک ریڈیو خدا حافظ کہہ کر سو نہ جاتا سب اس کے پروگراموں میں کھوئے رہتے۔ اس ریڈیو نے ان کے دلوں میں ہمت اور حوصلے کی بڑی بڑی قندیلیں جلا دی تھیں۔ ریڈیو انہیں بتاتا تھا کہ لوگ کس طرح تن من دھن سے فوجیوں کی سیوا کر رہے ہیں اور ان کے فوجی کیا معرکے مار رہے ہیں۔ فلمی گانے، پکچر دیکھنا اور چوری ڈاکے کے قصے زمانہ جاہلیت کی باتیں معلوم ہونے لگی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب وہ پہلے دن لوٹ کر نہ آئیں گے۔ رات کا اندھیرا ہی افسوں بن گیا تھا، جیسے جگمگاتی روشنیاں کبھی خوابوں میں دیکھی ہوں۔ کس طرح ایک بات پورے ملک اور قوم کی زندگی کا محور بن جاتی ہے۔۔ ...... ماجد اس رات بہت دیر تک سوچتا رہا۔

دوسرے دن ۲۲ ستمبر کا دن تھا، سلامتی کونسل کی میٹنگ پھر ہو رہی تھی اور لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ اس دن لوگوں کی نظریں گھڑی پر اور دل ریڈیو میں پڑا ہوا تھا کیونکہ صدر پاکستان کے اعلان کا انتظار تھا اور اعلان کا وقت بار بار تبدیل ہو رہا تھا۔ آخر صدر پاکستان نے قوم سے خطاب کیا اور جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ اس کا ردِ عمل مختلف تھا۔ بعض خوش تھے، بعض ذہنی

طور پر فائر بندی کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہر جگہ اس کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں لوگ اپنے اپنے دلائل دے رہے تھے اور دوسروں کے سُن رہے تھے۔ ایسے بھی تھے جو اس فیصلے کے بارے میں یوں خاموش تھے جیسے بدھ مت خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش ہے۔

فائر بندی کے بعد آنے والے زخمیوں کی تعداد واضح طور پر کم ہو گئی تھی، یوں اِکّا دُکّا کسی نہ کسی محاذ سے آ ہی جاتے تھے مگر وہ بات نہیں تھی کہ ایمبولنس اور ٹرک اپنا بوجھ اُتارنے کے لیے قطار میں کھڑے ہیں۔ بہتر ہونے کے بعد زخمی دوسرے اسپتالوں میں بھیج دیے جاتے تھے اس لیے یہاں مریضوں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور اسپتال کے عملے کو سانس لینے کا وقت ملنے لگا تھا۔ زخمی قیدی پہلے ہی شمال میں ایک کیمپ میں بھیجے جا چکے تھے۔ اب فرصت ملنے پر سرجن نے جب اطمینان سے ماجد کو دیکھا تو فیصلہ کیا کہ اس کی ایک ٹانگ اس بری طرح زخمی ہوئی ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہو سکتی اسے کاٹنا پڑے گا۔ اس وقت تک وہ تمام باتیں نہایت ہمّت اور جواں مردی سے سہتا آ رہا تھا مگر یہ .... یہ ایک ٹانگ سے ہمیشہ کی مفارقت کا تصوّر کیسا اندوہناک تھا۔ ہر چند کہ چاروں طرف اس نے اور بھی بہت کچھ دیکھا تھا مگر

اس کی اپنی ٹانگ حسین تنومند جسم کا ایک حصّہ جو اس کا اپنا تھا، وہ اسے کیسے الگ کرے گا، وہ اپنے نام کے ساتھ اپاہج کا لفظ کیسے برداشت کرے گا، کیسے؟ اسے چپ لگ گئی۔ کسی بات سے اس کی تسلّی نہیں ہوتی تھی۔ ادھیڑ عمر میٹرن نے اسے بہادر، جواں مرد اور باہمّت کا خطاب دے کر پہلے ہی سے پھسلانا چاہا تھا۔ سسٹر بل نے آپریشن سے پہلے اپنی سلگتی آنکھوں میں شبنمی نمی لیے میٹھی آواز میں اسے تسلّی دی تھی، وہ کیوں نہیں سوچتا اگر کچھ اور ہو جاتا تو......

خدا نخواستہ اس کی آنکھیں ہی چلی جاتیں تو۔ آفیسر کمانڈنگ نے کہا تھا وہ کیوں اتنا غم کر رہا ہے آج کل تو اتنی خوبصورت نقلی ٹانگیں لگ جاتی ہیں کہ پتہ تک نہیں چلتا یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی دانت نکلوا کر پھینک دے اور اس کی جگہ دوسرا نقلی دانت لگوا لے اور کیا۔ مگر اس کا غم ان باتوں سے کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے صرف یہی سوچا تھا کہ اس جنگ نے لوگوں کو زیادہ مہربان بنا دیا ہے ورنہ کہاں کوئی ہر ایک کو تسلّی دیتا پھرتا ہے۔ اس سے پہلے جب کبھی وہ کسی اسپتال میں گیا، جل ککڑی میٹرن ایک سے ایک سڑی لمبی سسٹر کو آفیسرز وارڈ میں بھیجتی تھی جو خود کو یوں لیے دیے رکھتی تھیں جیسے بیمار افسر انہیں کاٹ ہی تو کھائیں گے۔ اور او۔ سی صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ

آپریشن سے پہلے افسروں کی ڈیوٹی کرتے پھرتے ہیں۔ ان سب کی تسلیاں اپنی جگہ تھیں مگر یہ دکھ بھی کتنا بڑا تھا کہ آج سفید چادر کے نیچے اس کی صرف ڈیڑھ ٹانگ تھی۔ ٹرانزسٹر پر قومی نغمہ بج رہا تھا۔

کسی نے اپنا مال دیا اور کسی نے اپنی جان۔

اسے یوں لگا جیسے گانے والا کہہ رہا ہو۔ کسی نے اپنا مال دیا اور کسی نے اپنی ٹانگ۔ آج ان نغموں سے جوش جانے کہاں چلا گیا تھا۔ سارے نغمے دکھ ہی دکھ بن گئے تھے۔ ساری چیزیں اس کے ڈپریشن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ رات کی رانی کے ساتھ اٹکے ہوئے گلابی پھول بھی سسٹر لوپ اسے دیکھنے آئی اور پرانے گھسے پٹے لطیفے تازہ سکھ قیدیوں کے لطیفے بنا کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتی رہی۔ کسی کو بھی ان لطیفوں پر ہنسی تو خیر کیا آتی مگر اس کے لہجے اور سنانے کے انداز پر وہ ضرور مسکرا دیتے۔ ایک سو اسی پونڈ کی یہ سسٹر لوپ گلیکسو بے بی کی طرح بلی بلائی اور خوش مزاج تھیں۔ آنکھیں گالوں کے گوشت میں کہیں کھوئی گئی تھیں۔ ایک ایک پنڈلی "یہ" تھی اور ٹھوس جیسے سیسے کے گڑھے ہوئے پائے۔ لوگ پیار میں انہیں مس گوپ کہتے تھے اور وہ برا نہیں مانتی تھیں۔ ولائتی پن اپنے پر پوری طرح طاری رکھتیں مگر اس میں بناوٹ نہ تھی۔ فراک پہننا، اکھڑی اکھڑی آردو بولنا

اور بات بات پر قہقہے لگا کر ہنسنا ان پہ اتنا ہی سجتا تھا جتنا کسی معصوم بچی پر۔ لطیفے سنا کر اپنے حسابوں اسے تسلی دینے کے بعد سسٹر پوپ خوشی خوشی واپس چلی گئیں تو تھوڑی دیر بعد سسٹر گل ہاتھ میں لفافے لیے اندر آئی۔ سب کو ایک ایک لفافہ دینے کے بعد وہ لیفٹیننٹ کے پاس آکر رک گئی۔

"یہ آپ رکھ لیجئے، اگر آپ چاہیں گے تو میں آپ کی طرف سے خط لکھ دوں گی، مگر ابھی نہیں جب مجھے ذرا فرصت ہو گی۔"

"تھینک یو" لیفٹیننٹ نے خوش ہو کر کہا۔ اس کے بعد وہ ماجد کے پاس آئی اور خاموشی سے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ماجد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"میری امی اندھی ہیں وہ پڑھ نہیں سکتیں۔ اور میں انہیں نہیں لکھ سکتا کہ میری ٹانگ کاٹ دی گئی ہے کیا آپ میری ماں کو نہیں لکھ سکتیں کہ .... ان کے بیٹے کی ٹانگ، اور اب وہ، اب وہ ....

" وہ کروٹ لے کر بستر پہ اوندھا گیا اور تکیے میں منہ چھپا لیا۔ اس کی پیٹھ جھٹکے کھا رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اسے اپنی پیٹھ پر ہلکا سا بوجھ محسوس ہوا، بہت ہلکا، مگر کسی نے کچھ نہ کہا۔ جب اس کی طبیعت سنبھلی اور اس نے کروٹ لی تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ کرنل چپ چاپ لیٹے

چھت کو گھور رہے تھے، میجر خط لکھ رہے تھے اور لیفٹیننٹ چادر میں منہ چھپائے شاید سو رہا تھا۔ ریڈیو بھی بند ہو چکا تھا۔ گلدان کے پاس تپائی پر ایک خالی لفافہ پڑا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر وہ لفافہ پھاڑ دیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے نیچے رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ آج کے بعد وہ ساری زندگی نہ ہنس سکے گا۔ اس نے سوچا اور اسے یہ بات عجیب سی لگی کہ وہ پہلے ہنسا بھی کرتا تھا اور بہت ہنسا کرتا تھا مگر کیسے، وہ سمجھ نہ سکا۔ اس وقت ہنسی کیسی ناقابلِ یقین سی چیز لگ رہی تھی۔

---

(۲)

وہ جو بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ ایک دفعہ کسی کو باہر کی ہوا لگ جائے تو گھر کے اندر ٹک کر بیٹھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہی غنچہ کے ساتھ ہوا۔

غنچہ ایک زمانے میں غنچہ ہی تھی، سانولی سلونی، منہ بند کلی سی۔ جھجکی جھجکی، سمٹی سمٹی رہتی تھی۔ آنکھ کھول کر اس نے دیکھا ہی کیا۔ ماں باپ مر چکے تھے، بڑا بھائی جیسے تیسے اسے پال رہا تھا۔ وہ سارا دن باہر رہتا اور غنچہ تیرے میرے گھروں میں پھرتی رہتی، رات کا بچا کھچا جو کچھ پڑا ہوتا بھوک لگنے پر کھا لیتی۔ شام کو بھائی آکر پھر کچھ پکا ریندھ لیتا۔ ابھی چھوٹی سی تھی کہ بھائی نے یہ سوچ کر کہ سارا دن آوارہ روح کی طرح دوسرے گھروں میں پھرتی ہے، اس سے تو کچھ پڑھ ہی لے،

یا کم از کم کسی کی نگرانی میں تو رہے اسے اسکول میں داخل کر دیا جب
وہ ذرا بڑی اور سمجھدار ہوئی تو اس نے گھر کی اور کھانا پکانے کی ذمہ داری
بھی سنبھال لی مگر اسکول برابر جاتی رہی۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا جب
وہ پانچویں پاس کر کے چھٹی میں آئی تو ان دنوں نزدیک ہی پھلوں
کے باغوں میں ایک کارخانہ کھل گیا جہاں پھل اور سبزی ترکاری
ڈبوں میں بند کی جاتی تھی۔ گاؤں کے مرد اور لڑکے بالے ادھر لپکے
اور سب اس میں کھپ گئے تب بھی آدمیوں کی کمی رہی۔ معلوم ہوا
وہاں تو عورتوں کے لیے بھی کام ہے۔ سب سے پہلے مائی ہیراں نے
ہمّت کی۔ تھی وہ شروع ہی سے من مانی کرنے والی، روکنے ٹوکنے
والا اسے تھا ہی کون، یہی بہانہ تھا کہ کمانے والا ہے کوئی نہیں بیچاری
کا، نوکری نہ کرے تو کیا کرے۔ عمر ادھیڑ کی حد کو بھی کب کی پھلانگ
چکی تھی یعنی اعتراض کے سارے دروازے پہلے ہی بند تھے، پھر
ایک بات اور بھی تھی کہ گاؤں بھر میں سب سے زیادہ اعتراض کرنے
والی تو وہ خود تھی، اور اعتراض کرنے والے جب خود کوئی کام
روا رکھتے ہیں تو پھر اس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوتی ہیں۔ مائی ہیراں
نے بھی نوکر ہو جانے کے بعد خوب بڑ ہانکی کہ کس طرح بڑے صاحب کے

سامنے اس کا انٹرویو ہوا اور کس طرح اس نے ان کے سوالوں کے تابڑ توڑ جواب دیے۔ پھر اس نے اپنے کام کو اتنا ہلکا اور روپیہ روز کی مزدوری کو اتنا بھاری ظاہر کیا کہ کئی عورتوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ گاؤں میں جو طلاقنیں اور بیوائیں تھیں انہوں نے مائی ہیجراں کے ساتھ جانا شروع کر دیا اور پھر تو یہ حال ہوا کہ کارخانے میں مرد کم اور عورتیں زیادہ نظر آنے لگیں۔ کام ہی کیا تھا لمبے چوڑے شیڈ میں بیٹھی آرام سے گپیں ہانک رہی ہیں، صرف ہاتھ چل رہے ہیں) پالک کے ڈنٹھل توڑ کر الگ کرنا کونسا ایسا بھاری کام ہے پیاز کے باریک چھلکے اتارنا ضرور ذرا مشکل ہے مگر کارخانے کی تیز بڑی بڑی چھریوں اور تھوڑی سی مشق نے اسے بھی آسان بنا دیا۔ کارخانے کا انتظام اتنا اچھا تھا کہ ہر کام ہی آسان معلوم ہوتا تھا۔ ساری عورتیں ایک قطار میں بیٹھی ہیں، ٹین کے بڑے سے نالے میں صاف ستھرا پانی چلا آرہا ہے اس میں پھل ڈال ڈال کر نکالے جاؤ، یہ پھل دُھل گئے۔ کام نہ صرف آسان معلوم ہوتا تھا بلکہ سچ پوچھو تو عورتوں کو مزہ آتا تھا۔ ان کے اپنے گھروں میں یہ آسانیاں کہاں، کچی زمینوں پہ بیٹھنے اور ذرا ذرا سے کاموں کے لیے خود پانی ڈھو کر لانے کے مقابلہ میں یہاں کتنے ٹھاٹھ تھے۔

شروع میں عورتوں کا کام یہیں تک رہا مگر بعد میں ان کو دوسرے کام بھی سونپ دیے گئے۔ مرد پشاور اور نوشہرہ کی فیکٹریوں میں مزدوری کر کے زیادہ پیسے کمانا پسند کرتے تھے، نئے ڈیم اور براج بن رہے تھے ان پر غیر ملکی کمپنیاں ٹھیکے پر کام کر رہی تھیں وہ اتنے پیسے اور اتنا آرام دیتی تھیں کہ ہر شخص وہیں کھپ جانا چاہتا تھا ایسی صورت میں پھلوں کے کارخانے میں عورتیں ہی غنیمت معلوم ہو رہی تھیں۔ اب رفتہ رفتہ عورتیں مالٹوں کا عرق نکالنے میں مردوں کے ساتھ کام کرنے لگیں اور ڈبے اور بوتلیں بھی دھونے لگیں۔

انہیں دنوں غنچہ کا بھائی بیمار ہو گیا۔ کھانے کے لالے پڑے تو مجبوراً غنچہ نے اسکول چھوڑ کارخانے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں یہ ایک ہی لڑکی کارخانے میں تھی باقی سب بیاہی تیاہی تھیں۔ عورتوں کی پکی پکی باتیں سُن کر اور مردوں کی نگاہوں کے زور سے وہ سہمی سہمی لڑکی سے تیز طرار الہڑ جوان بننے لگی۔ ان ہی دنوں اکبر نیا نیا کارخانے میں آیا تھا۔ اسے اپنی کارگزاری دکھانے اور نئے نئے تجربے کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کئی بڑی اچھی اسکیمیں مینیجر کو بتائی تھیں جو تجربہ کرنے پر کامیاب رہی تھیں۔ وہ ہر شخص کی صلاحیت کا اندازہ کر کے اس کے مطابق اسے کام دیتا تھا اس طرح

بہتر کام مل جانے پر اکثر لوگ اس سے خوش ہو جاتے تھے اور کارکردگی بھی بڑھ جاتی تھی۔ اس نے غور کیا کہ غنچہ ایک الہڑ سی لڑکی ہے مگر اس میں وہاں کی ساری عورتوں سے زیادہ سمجھ ہے، محض پالک کی پتیاں توڑنے اور گھاس پھوس الگ کر دینے کے کام میں اس کا جی نہیں لگ سکتا اس نے تجربے کے طور پر اسے اسکیل لے کر بٹھا دیا کہ چھلے ہوئے ٹماٹروں کے ڈبے تولتی جائے۔ اس کے نام کے ساتھ چھٹی پاس کا لیبل تو تھا ہی آخر۔ اس کام میں غنچہ کا دل خوب لگا۔ ساری عورتوں سے الگ وہ ایک میز پر چڑھی بیٹھی رہتی عورتیں اور مرد ڈبوں میں چھلے ہوئے ٹماٹر ڈال کر دیتے جاتے اور وہ انگریزی ترازو میں انہیں تول تول کر دوسری طرف رکھتی جاتی۔ ڈبوں کا سائز ایک تھا ڈالنے والوں کو وزن کا اندازہ تھا اس لیے غنچہ کو اس کام میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ وہ اس بات پر دل ہی دل میں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی کہ اسے پڑھے لکھے بابوؤں جیسا کام دیا گیا تھا یہ نہیں کہ بیٹھے مکھیاں مارتے رہو، اور پھر وہ اکیلی تھی جو تخت پر سب سے اونچی چڑھی بیٹھی رہتی تھی جیسے وہ راجہ ہو اور باقی سب پرجا۔

اکبر نے حسن کارکردگی سے بڑوں کے دل کو موہ لیا تھا اب اسے ایک پورے اسٹور کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ باہر کے سارے آرڈر

اسی کے پاس آتے تھے، وہی سامان بھجواتا تھا، اسٹور میں اُوپر تلے خوبصورتی سے سجے ہوئے ڈبوں کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ شیڈ سے تیار بند ڈبے یہاں آتے اور ایک دُوسرے پر نفاست سے چُن دیے جاتے، اب صرف ان پر لیبل لگانے کا کام رہ جاتا جو اسی اسٹور میں ہوتا۔ اکبر نے سوچا کہ عورتیں مردوں سے زیادہ سلیقے سے لیبل لگا سکتی ہیں چنانچہ چند دن بعد غنچہ اور ایک جوان بیوہ یہاں بیٹھ کر ڈبوں پر لیبل لگانے لگیں۔ لیبل لگانے کا کام "اسکلڈ لیبر" میں شمار ہوتا تھا اور اس کے پیسے بھی زیادہ تھے۔ اکبر کی عادت تھی مزدوروں سے ہنس کر بات کیا کرتا تھا۔ محض اپنی خوش مزاجی سے اس نے بڑے بڑے قلعے سر کیے تھے، آپس کی رنجشوں کو دُور کیا تھا، کسی کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے اس کی بات نہیں ٹالی جاتی تھی۔ اپنے نیچے کام کرنے والوں کا دل جیت لیا جائے تو پھر کام کیا وہ تو جان تک دینے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ جب کسی بوڑھی عورت یا جوان مزدور سے مذاق کرتا تو وہ خوشی سے دانت نکال دیتے اور اس کے جانے کے بہت دیر بعد تک محظوظ ہوتے رہتے۔ سب اس کی خوش مزاجی کی تعریف کیا کرتے مگر جب وہ غنچہ اور اس کی ساتھن سے کوئی بات کہتا تو غنچہ تڑ تڑ جواب دیا کرتی جن پر اکبر خفا ہونا بھی چاہتا تو نہ ہو سکتا۔ اب

اسی دن وہ دونوں بیٹھی پلاسٹک کی مُنّی مُنّی جام بھری ڈبیوں پہ
ہوائی کمپنی کا لیبل چپکا رہی تھیں کہ اکبر نے آکر کہا "بھئی ذرا جلدی
جلدی کام کرو، کل ان کو جانا ہے، فوج کے لیے ترکاری کے ڈبوں
پر بھی لیبل لگانے ہیں دیکھو کتنا ڈھیر لگ گیا ہے، لوگ دیکھیں گے
تو کہیں گے اس ڈیپارٹمنٹ کا کام بہت سست ہے۔" غنچہ کی ساتھن
تو اپنی اوڑھنی کا پلو سنبھال تیزی سے کام کرنے لگی، غنچہ نے اپنی کاجل
بھری آنکھیں اُٹھا کر اکبر کو دیکھا اور بولی "بابو وہاں تو سب جگہ
مشینیں لگی ہیں، ہمارے لیے بھی ایک مشین لگوا دو نا۔" یہ کہہ کر وہ
ہنس پڑی۔ اکبر کے دل پر بجلی سی گری ۔ اس غنچہ کم بخت کی ہنسی ____
برابر برابر موتی ایسے دانت کیسے چمکتے ہیں جیسے پانی پر سورج کی
کرنیں چمک چمک جائیں اور اس کی کالی کالی آنکھیں، جانے رات
کو کاجل لگا کر صبح کو آنکھیں دھو لیتی ہے یا کیا، مگر آنکھیں عجب طرح
کالی بھنورہ سی ہو جاتی ہیں ____ کمبخت کیسی بت بنی اور سمجھ دار ہے
اگر کسی اچھے اسکول کالج میں پڑھ لیتی تو کیا غضب ڈھاتی۔
رفتہ رفتہ غنچہ اکبر کے حواسوں پہ سوار ہونے لگی۔ ہر وقت آنکھوں
کے سامنے رہتی تب بھی پیاس نہ بجھتی۔ جس وقت فائلوں اور رسیدوں
پر سے نظر اُٹھتی اسے میٹھی میٹھی نگاہوں سے تکا کرتا مگر غنچہ نے اکبر

کی نظروں کی پذیرائی نہیں کی۔ اس نے چالاکی سے اپنی جگہ ساتھن سے
بدل لی جس سے اس کی پیٹھ اکبر کی طرف رہنے لگی۔ بڑی بوڑھیوں کی
باتیں سن کر اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ بابو لوگ بڑے "وہ" ہوتے ہیں
لڑکیوں کو خراب کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ان کی بات بھی نہیں
پوچھتے۔ رہی سنجوگ کی بات تو یہ سوچ کر ہی غنچہ کا دل احساس کمتری سے
بھر جاتا۔ وہ کرسی میز پر بیٹھ کر قلم گھسنے والا، وہ اس کے سامنے پھسکڑا
مار کر زمین پہ بیٹھنے اور کاغذ چپکانے والی۔ وہ لمبی کاروں میں سیر کرنے
والوں کے ساتھ گٹ پٹ انگریزی بولتا ہوا، وہ زمین پر بکھرے ہوئے
پالک کے ڈنٹھلوں کی طرح حقیر اور ناقابل التفات۔ وہ گورا، یہ سانولی
وہ کوٹ پتلون پہننے والا، یہ پرانے دھرانے دیہاتی وضع کے کپڑوں
میں۔ وہ جانے کس کھاتے پیتے گھر کا چشم و چراغ، یہ یتیم نر بسیر بھائی
کے در پہ اس خوف سے کانپتی کہ کب کوئی بد دماغ بھابی آئے اور
اسے اس در کا سہارا بھی نہ رہے۔ سب ایسے ہیں یہ بابو اس کو ورغلا کر خراب
کرنے کے سوا اور چاہ بھی کیا سکتا ہے۔ اکبر کے سامنے نہ پڑنے کی
کوشش میں ایک دن غنچہ بڑے بابو سے کہہ گئی کہ اس کام میں اس کا
دل نہیں لگتا اسے کہیں اور لگوا دیا جائے۔ ادھر اس کی بے نیازی
جھجک، بیٹھ کر کے بیٹھنا ایسی دلآویز ادائیں اکبر کو لگیں کہ غنچہ اسے

پہلے سے بھی زیادہ اچھی لگنے لگی۔ گاؤں کی لڑکی میں ایسی خودداری
کوئی اور ہوتی تو اس کی نظروں کی شہ پاکر جانے کیسا کیسا ———
اتراتی، اور یہ اپنی سانولی سلونی شکل اور بھنورا ایسی کالی آنکھوں کو بھی
چھپا کر بیٹھ رہی، مگر اس کی پیٹھ پر پڑی لمبی سی چوٹی موٹی اوڑھنی میں
کہیں اُلجھی نظر آ ہی جاتی تھی اور اس کے ہنسنے کی آواز لاکھ دبانے پر
بھی سنائی دیتی تھی اور اس کے ذہن پر کیف آور پھوار بن کر گرتی تھی
وہ بھی آجکل ان ڈبوں کا معائنہ زیادہ کرتا تھا جو اس کے سامنے
والی دیوار سے ملے ہوئے رکھے تھے۔ ایسے میں غنچہ کا چہرہ اس کے
سامنے ہوتا تھا اور اس کے لاکھ جھکنے کے باوجود بھی اس کی آنکھوں
میں تیرتے زندگی کے سائے اکبر کو دکھائی دے ہی جاتے تھے۔ اس
کی لانبی سانولی انگلیاں صفائی سے لیبل اُٹھاتی، لئی لگاتی اور لیبل
چپکاتی نظر آ ہی جاتی تھیں اور یہ جھلکیاں بھی اس کے دل کو کئی گھنٹے
کے لیے اتھل پتھل کر دینے کو کافی تھیں۔

---

(۲۳)

جس دن اکبر کو پتہ چلا کہ غنچہ نے اس جگہ سے تبادلہ مانگا ہے تو اس کا دل سچ مچ زخمی ہو گیا۔ وہ اسٹور میں گھسا تو غنچہ اس کی میز کی طرف پیٹھ کیے جام کے ڈبوں پر رس ٹپکتے آڑو اور خوبانیوں کی تصویروں والے لیبل لگا رہی تھی۔ جس جگہ سے وہ داخل ہوا تھا وہاں سے اس کے چہرے کا ایک حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے گالوں پر بالکل ایسی ہی سرخی تھی جیسے پکے ہوئے تازہ آڑوؤں پر۔ اس کی لمبی جھکی اور مڑی ہوئی پلکیں اور آنکھوں کی نامعلوم سیاہی خاموش جادو جگا رہی تھی۔ آج اس کی ساتھن غیر حاضر تھی اس لیے ہلکی ہلکی سرگوشیوں اور دبی دبی ہنسی کی جگہ مکمل خاموشی تھی۔ اکبر اندر آن کر پہلے اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا، اس وقت اتفاق سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں

غنچہ کی طرف چلا اور یکایک اس کے بالکل پاس اس میلی چادر پہ بیٹھ گیا جس پر غنچہ بیٹھی ہوئی تھی۔ غنچہ نے گھبرا کر دیکھا، اک ذرا کھسکی اور منہ کھول کر حیرت سے بولی "بابو؟"

"ہاں ——— تم یہاں سے کیوں جانا چاہتی ہو؟ میں تمہارے ساتھ سختی کرتا ہوں؟"

"نہیں، نہیں تو۔"

"ڈانٹتا ہوں؟"

"نہیں" وہ مسکرائی۔

"مارتا ہوں؟" غنچہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پھر بتاؤ نا"

"یہاں صرف ہم دو عورتیں ہیں میرا دل نہیں لگتا۔"

"اور تم چلی جاؤ گی تو میرا دل کیسے لگے گا ——— یقین کرو غنچہ تمہارے یہاں ہونے سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا کام بڑا ہلکا ہو گیا ہو۔ کسی اور اسٹور یا دفتر میں جاتا ہوں تو دل نہیں لگتا۔ بس یہاں بھاگ آنے کو جی چاہتا ہے اور یہاں آ جاتا ہوں تو جیسے چین پڑ جاتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس نے غنچہ کا لئی کی طرف بڑھتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ دو ایک دفعہ ہلکے ہلکے جھٹکوں میں غنچہ نے چھڑانے کی کوشش کی پھر

ہاتھ اس کی گرفت میں ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے خاموشی سے کالی بھنورہ ایسی آنکھوں سے اکبر کی طرف دیکھا۔ اکبر نے کہا "نہیں جاؤ گی نا میاں سے، دیکھو اگر تم گئیں تو میں اسی دن استعفےٰ دے کر گھر چلا جاؤں گا۔"

"سچ بالو؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر سرخ ہو گئی۔

"ہاں دیکھ لینا۔" اسی وقت باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور اکبر تیزی سے فرش سے اُٹھ کر کرسی کی طرف لپکا۔

غنچہ کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ کانوں کی لوؤں سے لے کر انگلی کے پوروں تک وہ سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ آپ ہی آپ مسکراہٹ ہونٹوں پر آئے جا رہی تھی۔ دل دھڑک کر جیسے بار بار کہہ رہا تھا "بالو تو مجھے سچ مچ چاہتا ہے۔"

اس دن کئی مرتبہ اکبر نے بہانے اس کے پاس آیا، یونہی اُلٹے سیدھے سوال کرتا رہا اور غنچہ ہنس ہنس کر، شرما شرما کر اس کے جواب دیتی رہی۔ دونوں کی نظریں ٹکراتی رہیں اور وہ چند لمحوں کے لیے دُنیا سے غافل ہو گئے۔ اکبر کی انگلیاں غنچہ سے چیزیں لے کر دیکھنے کے بہانے اس کی اُنگلیوں سے مَس ہوتی رہیں اور دونوں کے جسموں میں ایک نشہ سا دوڑنے لگا۔ شام کو غنچہ گھر کی طرف چلی تو قدم ڈالتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ آج اس نے کسی کا ساتھ بھی نہیں ڈھونڈا

اکیلی ہی چل کھڑی ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر نٹے پتلے پتلے سرسبز درخت لہرا رہے تھے۔ اس نے کھیتوں کے بیچ میں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا پھل کے درختوں میں ہزاروں کی تعداد میں ستارے جیسے پھول چٹکے ہوئے تھے سفید اور گلابی رنگ کے، جن پر شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ آسمان پر سفید براق بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے، جہاں کہیں نہیں تھے وہاں سے صاف شفاف گہرا نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ کیسی خوبصورت سہ پہر تھی۔ آج ہر شے یکایک کتنی حسین ہو گئی تھی۔ روز وہ اس راستے سے بوڑھی مائی ہجیراں کے ساتھ آتی جاتی تھی، کبھی بھی اس نے نہیں دیکھا کہ یہ کھیت اور باغات کتنے حسین ہیں۔ ہر درخت کے سائے میں ایک کنواں اور افق کے پاس پہاڑوں تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیت۔ درمیان میں کہیں کہیں نو عمر لڑکیوں کے سے نرم و نازک جسم والے سفیدے کے پیڑ ہوا سے اٹھلاتے ہوئے۔ پھر پھولوں سے لدے ہوئے لوٹا سے درخت جیسے آج یہ سب اچانک زمین سے نکل آئے تھے ورنہ پہلے بھی تو کبھی غنچہ کو دکھائی دیتے۔ پہلے تو وہ مائی ہجیراں کی دھول اڑاتی چپلوں میں سے اس کی پھٹی ایڑیاں دیکھتی رہتی تھی یا اس کا جگہ جگہ تھوکتے جانا، جس سے اور اس کا جی متلا جاتا تھا

اس نے سوچا اب وہ ہر روز اکیلی ہی جایا کرے گی، کیوں خواہ مخواہ
نسوار کھانے والی مائی ہجیراں کی تھوک کی پچکاریاں سہتی جائے۔ اور
پھر یکایک وہ اپنی اس جرأت پر حیران رہ گئی۔ اس سے پہلے تو کبھی
اسے یہ خیال نہیں آیا تھا۔ ہاں سچ مچ یہ جرأت تو اسے بالو کے پیار
نے دی ہے۔ جسے بالو چاہتا ہو اسے کون چھیڑ سکتا ہے بھلا؟ آج بالو
کا وہ پہلا ڈر بھی ایسے غنچہ کے دل سے نکل گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔
نہیں بالو ہرجائی نہیں ہو سکتا۔ جو ہرجائی ہوتے ہیں وہ تو دعورتوں
کی باتوں کی روشنی میں) لڑکی کو اکیلے دیکھ کر پکڑ لیتے ہیں وہ تو ہر کسی
کو خراب کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ان کے جسم پہلوانوں جیسے ہوتے
ہیں ان کی مونچھیں خوف ناک ہوتی ہیں وہ یوں ڈھیر سے ڈھیر سے
پگھل جانے والی نگاہوں سے تھوڑا ہی دیکھتے ہیں۔ وہ یوں پیار سے
انگلیاں تھوڑی تھامتے ہیں جیسے کلیاں بین رہے ہوں۔ وہ پتلی کمر
اور کھوئی کھوئی آنکھوں والے پڑھے لکھے بالو تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔
رات کو غنچہ ایسی بے چین نیند سوئی جیسے بستر میں چیونٹیاں گھس
گئی ہوں۔ آنکھ لگتی تو کہیں سے کوئی کہتا " تو چلی گئی تو میں استعفےٰ دے کر
چلا جاؤں گا" وہ جاگ پڑتی اور گھنٹوں اس آواز کی مٹھاس کانوں میں
اس طرح رس ٹپکاتے جاتی کہ سونے کو جی نہ چاہتا، پھر آہستہ آہستہ اس

آواز کی لہر پہ بہتی وہ نیند کی وادی میں پہنچتی تو کوئی دھم سے اس کے
پاس آکر بیٹھ جاتا، اس کی انگلیوں کی پوروں کو چھو لیتا، اس کی آنکھوں
کی گہرائیوں میں کچھ ڈھونڈنے لگتا اور وہ اسے حقیقت سمجھ کر بھر
جاگ پڑتی۔ صبح وہ تڑکے ہی جاگ اُٹھی اور خلاف معمول اس نے سوچا
کہ آج وہ کون سے کپڑے پہنے۔ وہ کپڑے جو وہ کئی دن سے پہن کر جا رہی
تھی اور ابھی کئی دن اور پہن کر جاتی اسے یکایک بے حد میلے اور بے ڈھنگ
دکھائی دینے لگے۔ اس نے خلافِ عادت دو مرتبہ صابن لگا کر منہ
دھویا اور پھر گھی کے ٹین کے بنائے ہوئے ٹرنک میں سے وہ جوڑا
نکال کر پہن لیا جو بھائی نے پچھلی عید پر بنایا تھا۔ تھا تو وہ بھی سوتی
مگر روز کے دُھل دُھل کر صاف نہ ہونے والے کپڑوں میں یوں چمکتا
تھا جیسے ڈھیر سے کالے پیلے بچوں میں کوئی گورا بھبھوکا سا بچہ۔ آج
اس نے زیادہ اہتمام سے بال بنائے، ہاتھوں پر کریم کے بدلے تھوڑا
سا مکھن ہی مل لیا اور مائی ہجیراں کا انتظار کیے بغیر ہی کارخانے کی طرف
چل کھڑی ہوئی۔ آج کی صبح بھی ہمیشہ سے حسین تھی، سُورج پہاڑیوں
کے پیچھے سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ ہوا میں بڑی پیاری سی خنکی
تھی۔ چڑیاں مل کر کوئی کورس گا رہی تھیں اور بلاوجہ ڈال ڈال پات پات
پھدکتی پھر رہی تھیں جیسے کوئی میٹھی سی بات ان کے دل میں گدگدیاں

کر رہی ہو۔ پھلوں کے درخت آج ایسے وقار سے چپ چاپ کھڑے تھے جیسے کسی کا راز جان کر اسے چھپانے کی کوشش میں ہوں۔ فضا میں گیت سے گونج رہے تھے جس کے بول کچھ یوں تھے کہ تو اگر چلی گئی تو میں استعفیٰ دے کر چلا جاؤں گا۔

کارخانے کا دروازہ کھل گیا تھا، دن کا چوکیدار اپنی ڈیوٹی پر مستعد تھا۔ مرد اور عورتیں جوق در جوق کارخانے میں داخل ہو رہے تھے، آج اس کے کپڑے ان سب میں نمایاں تھے۔ خواہ مخواہ لوگوں کی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں آخر ایک عورت نے اسے چھیڑا۔ "کیا بات ہے غنچہ بڑی بنی ٹھنی ہے آج؟"

"کپڑے دھو کر ڈالے تھے سوکھے ہی نہیں تو یہ پہن لیے چاچی۔"

وقت پر اسے بات سوجھ گئی اور سننے والوں نے یقین کر لیا۔ غریب لوگوں میں کبھی کبھار یہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ کپڑے نہیں رہے تو مجبوراً شادی بیاہ یا آنے جانے کے لیے رکھا جانے والا جوڑا پہننا پڑ گیا۔ پہننے کو تو وہ یہ کپڑے پہن آئی تھی مگر اب کچھ چور چور سی ہو رہی تھی۔ اسٹور کے منشی نے بھی پہلا جملہ اس کے کپڑوں کے بارے ہی میں کہا تھا اور اسے بڑی ہوس بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ غنچہ کو اکثر ایسی نظروں سے تاکا کرتا تھا۔ پہلے تو وہ اس کی اور اکبر

کی نگاہوں کا ایک مطلب سمجھ کر یہاں سے جانا چاہتی تھی مگر آج ان دونوں کی نگاہوں کا فرق صاف نظر آگیا تھا۔ اس کمبخت کی نگاہوں میں تو ایسی بھوک تھی جیسے کتّے کی آنکھوں میں ہڈی کو دیکھ کر اُمنڈ آتی ہے اور بابو کی نظروں میں ایسی نرمی ایسی گرمی جیسے مخمل کا ڈھیر۔

بابو ابھی نہ آیا تھا ہاں اس کی ساتھن آگئی تھی، اس نے بھی کپڑوں کے متعلق استفسار کیا اور اسے بھی غنچہ نے کپڑے نہ سوکھنے کی من گھڑت داستان سُنا دی۔ ذرا دیر بعد مائی ہجیراں دروازے سے ہی پکارتی اندر آئی "کیوں ری غنچہ تو آجکل بڑی میم بن رہی ہے، میرے ساتھ آنا جانا چھوڑ دیا ہے اکیلی ہی چلی آتی ہے۔"

"تو اِتی دیر کر دیتی ہے نا مائی، روز لیٹ ہو جاتی ہوں، بابو ڈانٹتا ہے" غنچہ نے پھر ایک جھوٹ گھڑا۔

"تجھے تو بوڑھا دیکھ کر کچھ نہیں کہتے نا لوگ" غنچہ کی ساتھن نے گرہ لگائی۔ مائی دو منٹ ان کے پاس بیٹھ کر اور غنچہ کے حلیے کو غور سے دیکھ کر کام کا عذر کر کے چلی گئی۔ اکبر ابھی تک نہیں آیا تھا اور غنچہ کے دل میں گدگدی ہو رہی تھی۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا پھر ساتھن سے جگہ بدل لے تاکہ اکبر کے سامنے بیٹھ سکے مگر صاف کہنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اس نے اتنا کیا کہ میز کی طرف بھرپور پیٹھ کر لینے کی بجائے ذرا

آڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ اب وہ ترچھی نظر کر کے میز اور کرسی کا تھوڑا سا حصہ دیکھ سکتی تھی اور کرسی پہ بیٹھنے والے کو اس کے چہرے کا کچھ حصہ نظر آ سکتا تھا۔

اکبر اندر داخل ہوا تو اسے محسوس ہوا جیسے آج غنچہ نہیں ہے لوکاٹ کی گلابی کلیوں کا ڈھیر اس کی جگہ پڑا ہے۔ غنچہ نے نظریں اٹھائیں اکبر کی نگاہیں ان میں گھل مل گئیں اور وہ اسی طرف چلا آیا۔ اس نے دوسری عورت سے کل کی غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ اور اس کی رام کہانی سن کر اور غنچہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام دے کر وہ اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ غنچہ نے ان نظروں میں مخمل ایسی نرمی اور گرمی تو محسوس کی ہی، یہ پیغام بھی صاف پڑھ لیا کہ آج وہ بابو کو کتنی پیاری کتنی حسین نظر آ رہی ہے۔ اس کا دل بار بار گنگنانے کو چاہتا تھا اور وہ اس بے اندازہ اُمنڈتی ہوئی خواہش کو آخری وقت میں روک دیتی تھی۔

آج اکبر کو بہت کام تھا۔ پالک اور ٹماٹر کے برآمد ہونے والے ڈبے آج ہی کراچی روانہ کرنے تھے۔ پھر بھی وہ مختلف کاموں اور بھاگ دوڑ کے درمیان کئی دفعہ آیا اور آنکھوں کی زبان میں جانے کیا کیا کہہ گیا۔ پھر چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے وہ کام سے فارغ ہو کر اندر آیا اور ایک لمبا سا سانس لے کر نڈھال سا کرسی پر گر پڑا۔

"بہت تھک گئے بابو؟" غنچہ کی ساتھن نے پوچھا۔

"ہاں، گھن چکر بنا کر رکھ دیتے ہیں لوگ۔"

"بس اب تم آرام کرو بہت کام کر لیا۔"

"ابھی تو اور بھی ضروری کام ہیں، نئی فہرستیں بنانی ہیں۔ کچھ آج ہو جائیں تو کل کے لیے کام ہلکا ہو جائے۔" اس نے کاغذ گھسیٹتے ہوئے کہا اور پھر بولا "غنچہ تو نے اسکول میں پڑھا ہے نا؟"

"ہاں چھ جماعت۔" غنچہ کچھ نہ بولی تو ساتھن نے بڑے فخر سے بتایا۔

"چل پھر ادھر آ، ذرا نمبر بولتی جا، میں لکھتا جاؤں، کام جلدی ہو جائے گا۔"

غنچہ کسمسائی تو ساتھن نے ٹھوکا دیا "جا نا، بابو کیا کہہ رہا ہے۔" غنچہ ہچکچاتی ہوئی اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی میز کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ اکبر نے اسے کاغذ میں سے نمبر اور چیزوں کا نام پڑھنے کو کہا اور خود رجسٹر میں لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹور منشی ادھر سے گزرا تو اس نے دیکھا، غنچہ اکبر کی میز کے پاس کھڑی ہے۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ غنچہ نمبر بول رہی ہے آپ لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا گر اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ غنچہ کے جس ہاتھ میں کاغذ نہیں ہے وہ میز پہ

دھرا ہے اور اکبر کے جس ہاتھ میں قلم نہیں ہے اس نے غنچہ کے ہاتھ پر یوں سایہ کر رکھا ہے جیسے چھوٹے پودوں کو بچانے کے لیے سوکھی گھاس کا (ٹوپی کی شکل کا) چھپر چھا دیا جاتا ہے۔

"ہنھ تو یہ بات ہے۔" وہ دانت کچکچاتا اپنے کام سے چلا گیا، مگر پھر ہر دو منٹ بعد کوئی سوال پوچھنے یا کوئی چیز لینے اتنی مرتبہ آیا کہ پریشان ہو کر اکبر نے غنچہ کو واپس بھیج دیا اور اس کا کام اسی منشی کے سپرد کر دیا۔

---

(۴)

پھر تو ایک دوسرے کی آنکھوں میں کھو رہنے، زیادہ سے زیادہ پاس رہنے، باتیں کرنے اور ہاتھوں کو ایک دوسرے میں اُلجھائے رکھنے کی آرزو بڑھتی ہی چلی گئی، اور یہ احتیاط کرتے ہیں کہ کسی کو شبہ نہ ہو انہیں بڑی تکلیف سی محسوس ہونے لگی۔ غنچہ کے کپڑے نہ سوکھنے کے بہانے زیادہ دن قابلِ یقین نہیں رہے کیونکہ اب اس کے کپڑوں کا معیار روز بروز بڑھ رہا تھا۔ کہاں وہ ادھ میلی شلوار قمیص اور چادر کی سی موٹی اوڑھنی اور کہاں نئی تراش کی پھول دار قمیصیں، اور شنان کے دوپٹے جو وہ پچھلے اتوار بھائی کے ساتھ جاکر پشاور سے خرید کر لائی تھی۔ بھائی نے تو یہ سوچ کر کچھ نہ کہا کہ اپنی کمائی لڑکیاں کپڑوں پہ ہی خرچ کرتی ہیں، اس زمانے میں شوق ہوتا

ہی ہے پہننے اوڑھنے کا مگر کارخانے میں ہر طرف اس کے کپڑوں کے چرچے ہونے لگے۔ غنچہ کے صرف کپڑوں ہی میں تبدیلی نہیں آئی تھی اس کے بال بھی زیادہ سنور گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی مستی اور چال کا الھڑپن بڑھ گیا تھا۔ اس کے جسم کی لچک اور آواز کی کھنک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں دیکھتی رہیں اور زبانیں بولتی رہیں یعنی عشق اور مشک والی مثال صادق آئی۔ بات پھیلانے میں سب سے بڑا ہاتھ اسٹور منشی کا تھا جو چھوٹے بچے قصے آنکھوں دیکھا حال کہہ کر بیان کرتا پھرتا تھا۔ ہوتے ہوتے بات ادھر گاؤں میں پھیلی اور اُدھر کارخانے میں اوپر تک جا پہنچی۔ مینیجر ذاتی معاملات میں دخل دینے کا حامی نہیں تھا مگر اسے بتایا گیا کہ اگر اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا تو کارخانہ بدنام ہو جائے گا، مرد اپنی عورتوں کو بھیجنا بند کر دیں گے اور کارخانے کا بڑا نقصان ہو گا۔ اکبر بہت کام کا آدمی تھا اسے ایک دم ناراض نہیں کیا جا سکتا تھا، اسے بلا کر سمجھا دیا گیا جسے انسری زبان میں "وارن" کرنا کہتے ہیں۔ ادھر غنچہ کے بھائی کو وارن کرنے کا کام مائی ہجیراں نے اپنے ذمے لے لیا کیونکہ اس کا خیال تھا غنچہ سے اس بارے میں کچھ کہنا بے کار ہو گا۔ جوان تیز طرار لڑکی کہیں اس کی بات جلتی پہ تیل نہ ہو جائے۔

اتوار کا انتظار غنچہ ہمیشہ اسی بے چینی سے کیا کرتی تھی جیسے اور ملازمت کرنے والے کرتے ہیں مگر اب تو اسے اتوار کی آمد زہر لگنے لگی تھی۔ ایک قیامت کی طرح لمبا چوڑا ایسے کا دن ہے کہ کسی طرح گزرتا ہی نہیں۔ اس کا کہیں آنے جانے اور گپ شپ کرنے کو بھی دل نہ چاہتا۔ بس گھر میں بیٹھی ہفتہ بھر کے لیے اپنے کپڑے دھو کر تیار کرتی، کھانا پکاتی اور پلنگ پر لوٹ پلوٹ کر شام کر دیتی۔ اسے تنہائی ہی اچھی لگتی تھی اس لیے کہ وہ ان نگاہوں کو ذہن میں دہراتی تھی جن سے اکبر نے کسی خاص لمحے میں دیکھا تھا یا ان الفاظ کو جن سے اکبر نے اپنی چاہت کا اظہار کیا تھا۔ ساتھن اب اس کی راز دار سہیلی بن گئی تھی اور اس کے اسٹور میں ہوتے ہوئے بھی وہ بڑی بے فکری سے باتیں کرتے رہتے تھے، کبھی شام کو ادھر ادھر ملنے کا موقع ہوتا تب بھی بے چاری ساتھن کہیں دور کھڑی رہتی تاکہ غنچہ کو اکیلے آتے جاتے دیکھ کر لوگ شک نہ کریں۔ اکبر نے کئی دفعہ اس کے سامنے ہی غنچہ سے کہا تھا کہ اگر جلد ہی کارخانے والوں نے اسے ترقی نہیں دی تو شادی کے بعد وہ کسی بڑے شہر میں چلا جائے گا، کراچی سے اس کے دوست نے لکھا تھا کہ موجودہ تنخواہ سے دگنی تنخواہ پہ اسے آسانی سے نوکری مل جائے گی۔ تنہائی میں وہ یہ باتیں دہراتی

رہتی اور شادی کے خیال پر خود ہی سے شرما کر سرخ پڑتی رہتی۔ ایسے ہی ایک اتوار کی صبح اس کے بھائی نے کہا کہ وہ ماموں کے پاس اکبر پورہ جانا چاہتا ہے وہ بھی تیار ہو جائے۔ ماموں سے ان کے تعلقات ماں باپ کی زندگی ہی میں کچھ اچھے نہیں تھے۔ ماموں تو سیدھے سادے تھے مگر ممانی بہت تیز تھی، ان کی نند سے کبھی نہیں بنی تھی اور اس کے مرنے کے بعد اس نے بچوں کو کبھی زیادہ منہ نہیں لگایا تھا کہ کہیں خواہ مخواہ گلے نہ آن پڑیں۔ غنچہ اور بھائی مہینوں ان کے ہاں نہ جاتے تھے جب تک کوئی خاص بات نہ ہو یا وہ خود نہ بلائیں۔ اسی لیے غنچہ نے بھائی سے پوچھا کہ وہ اکبر پورہ کیوں جانا چاہتا ہے۔

"یوں ہی، ذرا کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

"واپس کب آئیں گے؟" غنچہ نے جھٹ سے پوچھا کیونکہ وہ اتوار کے علاوہ اور کسی دن کارخانے سے غیر حاضر رہنے کو تیار نہیں تھی۔

"شام کو آجائیں گے۔" بھائی نے کہا اور وہ دونوں تیار ہو کر بس میں بیٹھ گئے جس نے انہیں اکبر پورہ سے ادھر جی ٹی روڈ پر اتار دیا۔ وہاں انہوں نے اکبر پورہ جانے والے ایک تانگے سے بات کی اور بہت سی سواریوں کے ساتھ لد پھند کر اکبر پورہ پہنچے۔ ماموں نے انہیں دیکھ کر زبان سے اظہار خوشی نہ کیا لیکن اس کے میٹھے لہجے

اس انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوا ہے، اس کے برعکس ممانی نے باتیں تو یوں کیں جیسے جانے کب سے ان کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھی مگر دل میں ایک دم کُڑھ پیدا ہو گئی جانے بن بلائے کیوں آ گئے ہیں کہیں رہ ہی نہ پڑیں۔ غنچہ اپنی ممانی اور ماموں زاد بہنوں کے ساتھ گیہوں صاف کرانے لگی اور اکبر ماموں کے ساتھ کہیں گھومنے نکل گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ چارپائی باہر درخت کے نیچے ڈال کر لیٹ گیا۔ غنچہ اندر لڑکیوں کے ساتھ باتوں میں مشغول رہی، اور پھر وہ سب ٹیڑھی ترچھی لیٹی اُونگھ گئیں۔ شام کو جب ممانی نے اپنی لڑکیوں کو اُٹھا کر چائے بنانے کے لیے کہا تو غنچہ بھی گھبرا کر اُٹھی۔ بڑی دیر ہو گئی، غنچہ جلدی جانا چاہتی تھی اسے کئی چھوٹے موٹے کام تھے، (کپڑے تو خیر وہ صبح ہی دھو آئی تھی)، مگر اب چارہ ہی کیا تھا چائے بن رہی تھی اور اسے معلوم تھا ماموں خلوص دل سے اور ممانی اوپرے دل سے چائے پینے کو ضرور کہیں گی اور اس کا بھائی فوراً مان جائے گا۔ چائے بن گئی، ماموں کے بعد ایک پیالہ اسے دیا گیا تو وہ چونک کر بولی۔ "لالہ کو تو اُٹھا دوں" اس کا خیال تھا شاید وہ اب تک سو رہا ہے۔ ماموں اور ممانی کے چہرے پر ایک سایہ سا دوڑا، پھر ماموں نے دھیرے سے کہا۔

"وہ تو چلا گیا کہہ گیا ہے تم کچھ دن یہیں رہو گی۔"

"نہیں ـــــ نہیں تو، مجھے تو ساتھ ہی جانا تھا، یہ تو کپڑے وپڑے کچھ نہیں لائی۔" غنچہ سخت مضطرب تھی۔

"کپڑے وہ بھجوا دے گا، کہہ گیا ہے۔"

"مگر ـــــ مگر مجھے تو کل کارخانے جانا ہے، میں نے چھٹی بھی نہیں لی ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ اس وقت ممانی معنی خیز انداز میں مسکرائی اور غنچہ کو جتانے کے انداز میں بولی "اب چھٹی ہی چھٹی ہے بی بی، آرام سے رہو، زمان کہہ رہا تھا اب وہ بہن سے کام نہیں کرائے گا۔"

"اب بس اپنے گھر کا کام کرنا۔" اس کی ماموں زاد بہن بولی۔

غنچہ ان سب باتوں سے کھٹکی مگر پوری طرح نہ سمجھ سکی کہ قصہ کیا ہے۔ سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ بھائی کو اکبر کے بارے میں پتہ چل گیا ہے اور وہ چپکے سے اسے یہاں ڈال گیا ہے مگر ـــــ چھٹی ہی چھٹی، اور "اب اپنے گھر کا کام کرنا" کا یہ مطلب تو نہیں کہ اکبر نے شادی کا پیغام دے دیا ہے اور بھائی اسے یہاں لے آیا ہے تاکہ وہ یہاں سے بیاہ کر جائے، ہائے تو کیا اکبر سچ مچ دولہا بن کر آئے گا اور اسے بیاہ کر لے جائے گا اور وہ صرف اپنے گھر کا کام کیا کرے گی ـــــ ہائے بھئی وہ اتنا پڑھا لکھا اور وہ اس کے مقابلے میں گنوار لٹھ،

کیسے گزارہ کرے گا وہ بے چارہ اس کے ساتھ ——" تو میں یوں کروں گی اس سے پڑھا بھی کروں گی۔" خوشی سے سرخ ہوتے ہوئے اس نے یہ سب کچھ سوچ ڈالا۔ شام کو اس کے گاؤں کا ایک آدمی اس کے کپڑے اور کنگھی وغیرہ دے گیا تھا۔ بھائی نے ایک بس ڈرائیور کے ہاتھ بھجوائے تھے۔ تنہائی میں وہ اُمید کرتی رہی کہ ماموں زاد بہنیں اسے چھیڑیں گی، اکبر کے بارے میں کچھ کہیں گی یا کچھ پوچھیں گی مگر وہ سو نٹھ کھینچے بیٹھی رہیں۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ آپس میں بے تکلف نہیں تھیں، ہو سکتا ہے صرف اسی لیے وہ اس کو چھیڑنے سے ہچکچا رہی ہوں آخر اس نے خود ہی کرید کر پوچھا کہ اس کا بھائی کیا کہہ کر گیا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا وہ خود سو رہی تھیں۔ صرف ماں سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ اب جوان بہن کا کارخانے میں کام کرنا پسند نہیں کرتا اور جلد اس کی شادی کی فکر میں ہے۔ بس یہی کہہ گیا ہے کہ کچھ دن بعد آ کر لے جائے گا۔ غنچہ کے دل میں دھکڑ پکڑ ہونے لگی اور اُمید و بیم کی جانکاہ کیفیت میں یوں دن گزرنے لگے کہ کبھی تو اسے یقین ہو جاتا کہ اب وہ چار آدمیوں کے سامنے اکبر کی ہو جائے گی، پھر انہیں کسی کا ڈر نہیں رہے گا وہ ایک دوسرے میں بالکل کھو جائیں گے فنا ہو جائیں گے۔ ایسے خیالات پر اس کا دل خوشی سے کپکپانے سا

لگتا اور کوئی طربیہ نغمہ خود بخود ہونٹوں پر چلا آتا۔ وہ ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کا تصور کرتی جس کی جافری پر ہری بھری بیل چڑھی ہوئی ہے، اندر صاف ستھرے کمرے اور صاف ستھرا فرنیچر ہے۔ کوٹ پتلون میں ملبوس اس کا بابو ہے اور وہ خود ـــــــ ایک پیار کرنے والی طالبہ جو بڑے انہماک سے اپنے دیوتا سے کوئی سبق لے رہی ہے۔ مگر ذرا دیر بعد اس کا دل ایک دم بوجھل ہو جاتا۔ اس خاموشی کے ضرور کوئی معنی ہیں۔ لالہ اس سے ناراض ہے تب ہی تو یہاں ڈال گیا ہے۔ اگر شادی کی بات ہوتی تو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی ایسے چُپ چپاتے، پھر شادی کی بات کہیں چھپی رہتی ہے، ضرور سب کو معلوم ہوتی، کچھ تیاری بھی ہوتی نظر آتی، یہ تو کوئی اور ہی معاملہ ہے ـــــــ دل خود ہی ڈرا دیتا، خود ہی بہلا دیتا۔ غنچہ کبھی کھلکھلا کر ہنستی، چہکتی، خوش ہوتی، کبھی آپ ہی آپ مایوس، دل گرفتہ اور نڈھال سی ہو جاتی۔ اسی طرح دس دن گزر گئے۔ ممانی اس کی طرف سے بے نیاز سی تھیں، جیسے انہیں یہ احساس ہی نہ ہو کہ وہ بھی گھر میں موجود ہے۔

دس دن بعد اچانک ایک دن بھائی غنچہ کو لینے آ پہنچا۔ کسی بات کے بارے میں اس نے کچھ بھی تو نہ کہا، کیسا کیسا اس کا دل تڑپا کار خانے

کے بارے میں کچھ پوچھے مگر ہمت نہ ہوئی مبادا بھائی کا غصے پر زبردستی باندھا ہوا بند ٹوٹ جائے۔ وہ چپ چاپ گاؤں کے تانگے میں بھائی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ تانگے والا راستے بھر گھوڑے کو پیار سے گالیاں دیتا اور دھول اڑاتا انہیں بس کے اڈے پر چھوڑ گیا۔ قسمت سے بس بھی فوراً مل گئی اس لیے وہ لمحہ نہیں آیا جب خاموشی اذیت ناک ہو جاتی ہے اور بات کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔ بس میں وہ عورتوں کے ساتھ اگلے حصے میں بیٹھ گئی اور کھڑکی میں سے جھانکتی رہی۔ سڑک کے دونوں کناروں پہ ہرے بھرے درخت تھے کھیتوں میں جانے والے نالے کا پانی لبالب بھرا ہوا تھا۔ کھیتوں پہ بھی ہولا سا جوبن مگر آج غنچہ کے لیے ان کا حسن اس کے دل کی طرح مشکوک سا تھا۔ زن سے ایک خوبصورت، چھوٹی سی کار پاس سے گزری جسے کوئی سفید فام عورت چلا رہی تھی۔ عورت کے سر پہ سرخ اناری کے شگوفوں جیسا اسکارف غنچہ کے دل کو مسوس سا گیا۔ دنیا میں ایسی خوش نصیب عورتیں بھی ہیں جن کے پاس ایسی گاڑیاں ہیں اور وہ انہیں مزے سے اڑائے پھرتی ہیں اور اس کی قسمت میں صرف کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر ٹانگیں توڑنا، گندی کھچا کھچ بھری بس میں اور مشترکہ تانگوں میں سفر کرنا ہے! کیا کبھی اس کی زندگی میں کوئی ایسا معجزہ نہ ہوگا جو وہ بھی ایک عدد

کار کی مالک ہو سکے ؟ دل نے خود سے سوال کیا اور جواب میں اس کے
ہونٹوں سے ایک آہ سی نکل گئی۔ پھر اچانک اسے خوش آئیند خیالوں
نے آن دبوچا۔ اس کا بابو شاید کبھی اس قابل ہو سکے۔ وہ بڑا محنتی اور
قابل ہے، سب اس کی محنت اور عقلمندی کی تعریف کرتے ہیں۔ ہو سکتا
ہے وہ جلد جلد ترقی کر کے اتنا بڑا ہو جائے جتنے یہ گاؤں کے گھروں
کے برابر کی لمبی چوڑی کاریں رکھنے والے۔

انہیں خیالات میں کھوئی ہوئی وہ اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ سڑک سے
گھر تک ہر قدم پر اس کا دل کانپ رہا تھا، جانے اب کیا سننے میں آئے
بھائی نے تو جیسے کچھ کہنے سننے کی قسم کھا رکھی تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے بھائی
کو چائے بنا کر دی اور رات کا کھانا پکانے سے پہلے زمان سے پوچھ کر
اپنی ساتھن کے گھر بھاگی۔ اس وقت اس کا دل امید و بیم کے جس ہنڈولے
میں جھول رہا تھا اس کا اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔ ساتھن اس کو دیکھتے
ہی گلے سے لپٹ کر رونے لگی اور اس نے وہی داستان سنائی جو غنچہ
کسی قیمت پر سننے کو تیار نہیں تھی۔ مائی ہجیراں نے بھائی سے ان دونوں
کے رومان کا تذکرہ کر دیا تھا۔ زمان اکبر سے دو دو ہاتھ کر لے گیا تو اکبر
نے اس کے سامنے اپنے پیار کا اقرار کر لیا اور کہا کہ وہ غنچہ سے بیاہ کرنا
چاہتا ہے، مگر غنچہ کے بھائی نے ذات برادری کا نہ ہونے کی وجہ سے

صاف انکار کر دیا شاید اسے ڈرایا دھمکایا بھی ہو کیونکہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ جانے سے ایک دن پہلے اس نے غنچہ کی سہیلی سے کہا "غنچہ سے کہنا میں صرف اسی کی خاطر یہاں ٹھہرا ہوا تھا، اب میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟" وہ کراچی چلا گیا ہے اور بھائی نے تیری طرف سے استعفیٰ بھجوایا ہے۔ سُنا ہے اس نے مائی ہجیراں سے کہا ہے کہ وہ جلد تیری شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ تیرے رشتے کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ ابھی وہ شروع کے چند جملے ہی کہنے پائی تھی کہ موٹے موٹے آنسو غنچہ کے گالوں پر بہنے لگے اور بات ختم ہونے تک وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ سہیلی نے اُسے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تسلی دی اور کہا۔ کیا معلوم وہ کہاں کا رہنے والا تھا اسے بیاہ کر کہاں لے جانا۔ وہ اپنے لوگوں سے ملنے کو ترس جاتی۔ کیا خبر اس کی پہلی بیوی بھی ہوتی۔ یہ پردیسی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں ان کی بات کا اعتبار ہی کیا۔ غنچہ نے اس کی ایک بات بھی دھیان سے نہ سُنی، نہ کسی بات پر ذرّہ بھر یقین کیا۔ اگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا وہ اس کارخانے میں صرف اس کی وجہ سے ٹھہرا تھا۔ وہ اسے نہیں ملی تو وہ خاموشی سے چلا گیا اور وہ نصیبوں جلی رہ گئی کہ شادی کے بہانے

بھائی اسے کسی کرتِ دل کے ہاتھ بیچ کر اپنے دام کھرے کرے
اور پھر اسی پیسے سے اپنے لیے کوئی عورت خرید لائے۔

---

(۵)

لڑائی کے بعد اب بلیک آؤٹ ختم کر دیا گیا تھا۔ ہوائی حملے کے سائرن بجنا بند ہو گئے تھے۔ باہر کی زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آرہی تھی مگر اسپتال کی روزمرّہ زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا تھا۔ زخمیوں کے بجائے اب ان مریضوں کی تعداد بڑھ رہی تھی جو ذہنی کوفت، کم خوراکی یا صحت و صفائی کے اصولوں سے غفلت کی بنا پر ملیریا، ٹائیفائیڈ یا پیٹ کی بیماریوں کے شکار تھے۔ انہیں کے ساتھ ساتھ ذہنی مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب سرجنوں کا کام کم ہو گیا تھا اور دماغی یا جسمانی علاج کے ڈاکٹروں کا کام بڑھ گیا تھا۔ لڑائی کے بعد ماجد کی زندگی میں دو بڑے انقلاب رونما ہوئے تھے۔ ایک اس کی ٹانگ کا کاٹا جانا تھا۔ دوسرا گل کا اچانک اس وارڈ

سے چلے جانا۔ محاذ پر ایک بریگیڈیر کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اب وہ نچلی منزل کے ایک کمرے میں تھے اور رنگل ان کی مکمل طور پر دیکھ بھال کر رہی تھی۔ سسٹر لوپ آفیسر وارڈ میں ڈیوٹی دے رہی تھیں۔ وہ ما جد پر بڑی مہربان تھیں۔ ایک دن بڑے چاؤ سے تحفوں میں سے اسے تاش کا ایک پیکٹ لا کر دیا تھا اور بڑے فخر سے کہا تھا "کیپٹن، تمہارے لیے لایا ہے۔ چپ چاپ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان لوگ کے ساتھ جو تمہارا ساتھی ہے کھوب کھیلو۔"

"تھینک یو سسٹر لو آر سو نائس" بغیر کسی جذبے کے اس نے کہا تھا۔

"اوہ تم تو بالکل کھش نہیں ہوا۔"

"سسٹر میں خوش کیسے ہو سکتا ہوں۔ نہیں نہیں معلوم میرے گھر کے کیا حالات ہیں، میری پانچ کنواری بہنیں ہیں جن کا بار مجھ پر ہے اور اب پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوگا۔"

"کچھ نہیں ہونا بابا، تم ملک کی کھاطر کر بانی دیا ملک تمہاری کدر کرے گا۔ تم کھش رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور دوسرے وارڈ میں چل کر دیکھو، کیسا کیسا لوگ پڑا ہے، جو مرنے والا ہے وہ بھی اللہ کا شکر کرتا ہے، کوئی کچھ نہیں بولتا، بالکل نہیں بولتا۔"

"مجھے وہاں لے چلو سسٹر۔" ماجد نے کہا۔

"آؤ۔"

سسٹر پوپ اسے وہیل چیئر میں بٹھا کر ایک سرجیکل وارڈ میں لے گئی۔ بڑے بڑے کمرے بیڈ سے اٹے پڑے تھے۔ کمرے میں جلے ہوئے گوشت، خون اور دواؤں کی ملی جلی چراہند تھی۔ بستروں پر یہاں سے وہاں تک زخمی ہی زخمی تھے۔ کسی کی چھاتی پر زخم تھا کسی کی ٹانگ پر۔ کئی سپاہی تھے جن کی ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ بعض کے چہرے اس بری طرح زخمی تھے یا جھلسے ہوئے تھے کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ سب خاموشی اور اطمینان سے لیٹے اردو اخبار یا رسالے پڑھ رہے تھے۔ بعض معمّے حل کر رہے تھے، بعض خط لکھ رہے تھے۔ اس نے جس کسی سے حال پوچھا اس نے یہی کہا "ٹھیک ہوں، خدا کا شکر ہے۔" دفعتاً اس نے دیکھا گل ہاتھ میں لفافے اور رسالے لیے ایک ایک سپاہی کے پاس ہنستی مسکراتی باتیں کرتی پھر رہی ہے۔ اس کے نزدیک جاتے ہی سپاہیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے تھے بعض تو باقاعدہ دانت نکال دیتے تھے۔ وہ سب بڑھ چڑھ کر لفافے مانگ رہے تھے اور رسالے منتخب کر رہے تھے اور وہ خوشی خوشی ان کی فرمائشیں پوری کر رہی

تھی، پورے وارڈ میں یوں پھر رہی تھی جیسے خوشبو بھری ہوا کا جھونکا۔
اس کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ "کیپٹن آپ؟"

سسٹر پوپ نے اسے سمجھایا ہر وقت اداس ہر وقت اُداس۔ ہم بولا ذرا چل کر اپنے سپاہی لوگ کو دیکھو وہ تم سے ہزار درجے بہتر ہے۔"

"شی سسٹر، کم از کم جوانوں کے سامنے میری انسلٹ نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے، پھر تم کیوں خوش نہیں رہتا۔ تمہارا کام ہے ان لوگ کو تسلی دو نہ کہ ہر وقت منہ بنائے پڑے رہو۔"

اسی وقت ایک میڈیکل آرڈلی آیا، سسٹر پوپ کو میٹرن نے یاد کیا تھا۔

"سسٹر گل تم کیپٹن کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ، اور پھر پیچھے جاؤ، تمہارا بریگیڈیر تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ اُدھی بولتا ہے تم سارے وقت اس کے کمرے میں رہو، تم کیوں آجاتا ہے۔"

"وہ سو رہا ہے جمیلہ نے کہا تھا میں پیشنٹس کو لفافے دے دوں۔"

"نہ بابا تم اِدر ہی رہو وہ اسپیشل کیئر مانگتا ہے، تم کیپٹن کو پہنچا کر ادر جاؤ۔"

سسٹر گل نے وہیل چیئر سنبھالی اور اسے آفیسر وارڈ کی طرف لے چلی۔

"مس گل آپ بریگیڈیر صاحب کی پرائیویٹ نرس بن گئی ہیں؟" ماجد نے پوچھا۔ "وہ آپ کو اپنے پاس سے پیسے دیں گے؟"

"نہیں، ہمیں پرائیویٹ طور پر کام کرنے کی اجازت نہیں مجھے ویسے ہی ان کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔"

"جب وہ چلے جائیں تو کیا آپ صرف میری دیکھ بھال کے لیے مخصوص کی جا سکتی ہیں۔؟"

گل ہنسی۔ "آپ کو اتنی زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا آپ دوبارہ آفیسر وارڈ میں تو آجائیں گی؟"

"میٹرن کی مرضی ہے۔"

"آپ او۔ آر وارڈ میں تو اب بھی آتی رہتی ہیں مگر ہمارے ہاں نہیں آتیں۔" اس نے بالکل بچوں کی طرح شکایت کی۔

"آج دو منٹ کو آئی تھی سسٹر جمیلہ کو کچھ کام تھا۔"

"اور پھر آپ یہاں تو خوب چہکتی ہیں آفیسر وارڈ میں آکر خاموش ہو جاتی ہیں۔"

سسٹر گل صرف دھیرے سے ہنس دی۔

"بتائیے نا مس گل؟"

"آپ مجھے سسٹر کیوں نہیں کہتے؟"

"بعض لوگوں کو سسٹر کہنے کو دل نہیں چاہتا۔" وہ پیچھے تھی اس لیے ماجد اس جملے کا ردِ عمل نہ دیکھ سکا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ بولی۔

"اسی لیے ہمیں آفیسرز وارڈ میں محتاط رہنا پڑتا ہے۔"

"کس لیے۔"

"آپ لوگ آسانی سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، سپاہی ایسے نہیں ہوتے۔"

"مگر سسٹر لوپ تو ہمارے ساتھ خوب ہنستی بولتی ہیں، کبھی کبھی تاش بھی کھیل لیتی ہیں۔"

گل زور سے ہنس پڑی جیسے کہہ رہی ہو۔ ان کی بات اور ہے ان کو ہر ایک آسانی سے سسٹر کہہ لیتا ہے اور ان کے ہنسنے بولنے پر بھی کوئی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا۔

کمرہ آگیا تھا۔ سسٹر گل نے چیئر پلنگ کے ساتھ لگا دی اور پھر سہارا دے کر اسے بستر پہ لٹا دیا۔ "گل" ماجد نے آہستہ سے کہا۔

"سسٹر کہیے" گل نے بھی دھیرے سے کہا۔

"اداس ہوں" ماجد نے ضد کی۔

"بہت دیر ہو گئی مجھے جانا چاہیئے۔" اس نے زور سے کہا۔ پھر جا کر باری باری سب کی خیریت پوچھی اور کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

دوسرے دن سسٹر لوپ اس کا بستر ٹھیک کرنے لگی تو تکیے کے نیچے سے ڈھیر سے تاش نکلے جن پر قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔

"ویل یہ کیا۔ تم نے سب کارڈ کھراب کر دیا، یہ کیا بچوں والی حرکت ہے۔"

"بچوں والی کیا حرکت ہے، یہ شعر لکھے ہوئے ہیں شعر۔ جانتی ہو ان سب شعروں میں ایک لفظ کامن ہے۔"

"کیا ہے وہ ورڈ—؟"

"کان لاؤ پاس۔ پھول۔"

"فلاور—— او ہم کو پتہ ہے تم کو پھول کا بہت شوق ہے ہم مالی کو بولے گا کیپٹن کے کمرے میں روج تا جا فلاور لگاؤ۔"

"فلاور نہیں پھول، گل۔" اس نے آخری لفظ اتنی آہستہ سے کہا کہ کوئی سن نہ سکے۔

"اچھا بابا پھول، آج ہم تم کو ایک کھوشی کا بات بولنے آیا

تھا تم نے اپنی فلاور کی باتوں میں ہم کو بالکل بھلا دیا۔"

"کیا بات تھی۔؟"

"آج شام کو ہوسپٹل میں کچھ آرٹسٹ لوگ آئے گا، ورائٹی شو کرے گا، آپ سب لوگوں کو ادر جانا ہوتا۔"

"شام کو میں سوؤں گا سسٹر، مجھے بالکل مت جگانا۔"

"ویل پھر وہی بات۔ وہ تم لوگ کی کھاطر لاہور سے آتا ہے تم شام کو سوئے گا، رات کو کیوں نہیں سونا؟"

"بس میں نے کہہ دیا، میں نہیں دیکھوں گا ورائٹی شو وو۔" اس نے بالکل بچوں کی طرح ضد کی۔

"ویل مت جاؤ۔ تمہارا مرجی۔" سسٹر چڑ گئی۔

اور شام کو واقعی جب سب ایک جگہ جمع ہوئے تو وہ سوتا بن گیا۔ اس کا دل ناچ گانے کے ہنگاموں میں جانے کو قطعی نہیں چاہتا تھا۔ لیفٹیننٹ کی آنکھوں کی پٹی کھل گئی تھی اور وہ سارے اسپتال میں مزے سے دندناتا پھرتا تھا۔ بریگیڈیئر کی طبیعت کے بہانے اکثر نیچے جایا کرتا تھا وہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ گل سے ملنے کا بہانہ تھا۔ ایسے میں اپاہج بن کر وہیل چیئر پر جا کر وہ لوگوں کی ہمدردیاں نہیں سمیٹے گا۔ جب سب ورائٹی شو دیکھنے چلے گئے

تو اس نے قلم اُٹھایا اور دواؤں کی پڑیوں کے پڑے ہوئے پرزوں
پر کچھ لکھنے لگا۔ دفعتہً کھٹ کھٹ کی آواز آنی شروع ہوئی۔ چکنے
فرش پر پڑنے والی ایڑی کی مخصوص کھٹ کھٹ۔ شاید گل۔ مگر
نہیں وہ لیڈی ڈاکٹر تھیں، میجر مسز حق۔

"ارے آپ کیا کر رہے ہیں یہاں اکیلے، چلیے آپ کو او۔سی
بلا رہے ہیں۔"

"انہیں کیا معلوم اتنے آدمیوں میں کون وہاں ہے کون
نہیں۔"

"انہیں سب کا خیال رہتا ہے، ایک نظر دیکھتے ہی انہیں
معلوم ہو گیا کہ آپ نہیں ہیں اور انہوں نے مجھے بھیجا کہ آپ کو
لے آؤں۔" اسی وقت میڈیکل آرڈلی وہی چیسٹر لیے داخل ہوا۔
با دل نخواستہ وہ بیٹھ گیا اور مسز حق کے ساتھ کانفرنس روم میں
داخل ہوا جہاں اس وقت ورائٹی شو ہو رہا تھا۔ وہی ہوا جس کا
ڈر تھا۔ سب لوگ آچکے تھے۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا ایسے
میں اس کی آمد اور بھی ڈرامائی بن گئی۔ سب نے پلٹ پلٹ کر اس
کی طرف دیکھا یہاں تک کہ گانے والی ٹولی نے بھی۔ وہ پسینے میں
ڈوب ڈوب گیا۔ گل نے بھی اسے دیکھا جو ایک ادھیڑ عمر کی

پُر رعب شخصیت کے سائے میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس لیفٹیننٹ نے بھی جو دوسری طرف گل کے عین سامنے بیٹھا ہوا تھا جانے کیوں فضا ایک دم بوجھل ہو گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر آرٹسٹوں کے چہرے ہمدردی میں ستّ گئے تھے، ایک گانے والی نے بڑے واضح طور پر اپنی آنکھوں کے آنسو رومال سے خشک کیے۔ بریگیڈیر نے بڑی شفقت بھری مسکراہٹ سے سر ہلایا اور آرڈلی کو اشارہ کیا کہ چیئر ان کے نزدیک لے آئے۔ ان گانے والوں نے دلوں کو جانے کیسے پگھلا دیا تھا کہ دن رات انہیں مریضوں میں گھومنے پھرنے والی نرسیں اور ڈاکٹرنیاں یوں لسور رہی تھیں جیسے انہیں آج پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ آرٹسٹ مل کر گا رہے تھے ——— کسی نے اپنا مال دیا اور کسی نے اپنی جان۔

بریگیڈیر نے شفقت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس کا دل چاہا ان کا ہاتھ جھٹک دے اور چیخ کر کہے "انف آف دس پٹی سر" ہاتھ تو وہ نہ جھٹک سکا مگر آنکھیں میچ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"کیا بات ہے؟" بریگیڈیر نے پوچھا۔

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے سر۔"

بریگیڈیر نے چاروں طرف دیکھا اور کسی کو مخاطب نہ پا کر اپنے نزدیک بیٹھی ہوئی گل سے کہا "تم انہیں واپس ان کے کمرے میں

چھوڑ آؤ، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ گل نے وہیل چیئر تھامی اور خاموشی سے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پہ بیٹھنے کے بعد ماجد نے کہا "گل ایک چیز دیکھو گی؟"

"دکھائیے۔"

ماجد نے تکیے کے نیچے سے بکھرے ہوئے تاش نکالے اور اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ دیکھو اُردو شاعری میں کتنے شعر تم پر کہے گئے ہیں۔ گل کا چہرہ کچھ سُرخ سا ہو گیا۔

"اب میں جاؤں گی۔"

"نہیں، ابھی تو مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم پھر اکیلے میں کہاں ملو گی۔"

"مجھ سے؟ کیا باتیں کرنی ہیں آپ کو؟"

"ایک بات پوچھنی ہے، اگر تمہیں پتہ چلے کہ کوئی شخص تم سے محبت کرتا ہے تو تم کیا کرو گی؟" گل خاموش رہی۔

"سچ سچ بتاؤ۔"

"سچ بتاؤں، میں اسے محبت کرنے دوں گی کیونکہ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ کوئی شخص مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرے، کوئی ایسا شخص جس سے میں محبت نہ کرتی ہوں، میں اسے کچھ نہ دوں مگر جب بھی

میں اس سے کچھ مانگوں وہ دینے کو تیار ہو، اپنی جان بھی۔"

ماجد کا چہرہ بجھ گیا۔ "دنیا میں کوئی ایسی محبت نہیں کر سکتا، ہر شخص پیار کے بدلے پیار چاہتا ہے۔ میں جس سے محبت کروں گا اس سے یہ امید ضرور رکھوں گا کہ وہ میری ٹوٹی ٹانگ کے باوجود مجھے چاہے، مجھے سہارا دے، نہ صرف مجھے بلکہ میری اندھی ماں کو بھی"۔

"آپ کو کوئی نہ کوئی ایسی ہستی مل جائے گی۔"

" ماجد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "گل! کیا تم وہ ہستی نہیں بن سکتیں؟"

گل نے سلگتی آنکھوں سے لمحہ بھر اسے دیکھا، ہلکی سی، تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آتے آتے رہ گئی۔ اگر وہ اپاہج نہ ہوتا تو اس کا دل توڑ کر اسے واقعی خوشی ہوتی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں میں وہ ہستی نہیں بن سکتی۔"

"کیوں، آخر کیوں؟"

"اگر میں کہوں کہ میں خود سہارے کی تلاش میں ہوں، میں کسی کا سہارا نہیں بن سکتی —— اب میں جاؤں گی —— وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

بغیر اس کی طرف دیکھے وہ ٹھک ٹھک کرتی کمرے سے باہر

چلی گئی۔ ماجد منہ ڈھانپ کر لیٹ گیا۔ رات کو سب کے اصرار کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا۔ سسٹر صبیحہ جب سونے کی دوا کی ایک خوراک لے کر آئی تو اس نے تپائی پر پڑے ہوئے کاغذ کے پُرزے اُٹھا لیے۔ "یہ کیا لکھتے رہتے ہیں آپ ان پرزوں پر ــــــ
روشنی کے نزدیک کر کے اس نے ایک کاغذ پڑھا۔ "پھول اب کسی اور کمرے میں مہک رہے ہیں ــــــ
"اس کا کیا مطلب ہے کیپٹن؟"

"کچھ بھی نہیں بس یونہی ــــــ" سسٹر کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے کر اس نے گولی سی بنائی اور ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی۔

رات کو اس کی آنکھ کھلی تو پردہ ہٹی کھڑکی کے باہر چاندنی کھلی پڑی تھی۔ اس کھلی چاندنی میں درخت ایسے خاموش کھڑے تھے جیسے کسی نے بے حد اچنبھے کی خبر سنا کر دم بخود کر دیا ہو۔ کونے میں کھجور کا درخت اپنے پنکھ پھیلائے یوں خاموش تھا جیسے اصلی نہیں کسی دھات کا بنا ہوا ہو۔ ترشی ہوئی خوبصورت بیچ، پھولوں کے پودے اور سبزہ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا یا چاندنی نے ڈس لیا تھا۔ اس بے حسی میں جب نیچے دو سائے چلتے ہوئے نظر آئے تو ماجد کو بڑا عجیب لگا جیسے اس بھرپور چاندنی میں ہر چیز ساکت

ہی ہونی چاہیئے تھی، جیسے اس سکوت میں یہ حرکت بے جا مداخلت
سے بھی کچھ زیادہ ہو، شاید گناہ ـــــــ ایک سایہ مرد کا تھا اور دوسرا
عورت کا۔ عورت نرسوں کے سفید لباس میں ملبوس تھی اور مرد ڈریسنگ
گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک سمت سے چلتے ہوئے عمارت کے
دوسرے سرے پہ غائب ہو گئے۔ کیا یہ لیفٹیننٹ نجیب اور گل
ہیں۔ اچانک ماجد کو خیال آیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے پلٹ
کر اندر دیکھا۔ نجیب اپنے بستر پر آرام سے سو رہا تھا۔ اب اپنے
اس خیال پر اسے ہنسی آئی۔ سینکڑوں لوگ اسپتال میں ہیں اسے یہ
خیال کیوں آیا کہ یہ صرف وہی ہو سکتے ہیں، کیا معلوم کسی سسٹر کے
ساتھ کوئی چوکیدار ہی اسے میس سے یہاں تک چھوڑنے آیا ہو،
اس کے لمبے کوٹ کو وہ ڈریسنگ گاؤن سمجھ بیٹھا ہو، محبت بھی
کیا بری چیز ہے۔ مگر اس بھرپور چاندنی میں باہر ٹہلنے میں واقعی
کتنا لطف ہو گا۔ کیا اچھا ہوتا جو اس وقت واقعی گل باہر ٹہل رہی
ہوتی اور اس کے ساتھ وہ خود ہوتا۔ اس خیال کے ساتھ ہی دکھ
کی لہر سی دل میں دوڑ گئی۔ میری ٹانگ ـــــــ اور پھر گل! وہ تو
خود سہارے کی تلاش میں ہے وہ کسی کا سہارا نہیں بن سکتی اور اس
ڈیڑھ ٹانگ کے ساتھ وہ کسی کا سہارا کیسے بن سکتا ہے۔ چاندنی

منہ موڑ کر وہ چت لیٹ گیا اور چھت کو تکنے لگا۔ کل وہ اپنی ماں کو
اپنے بارے میں سب کچھ لکھ دے گا۔ ماں ہی ایک ایسی ہستی ہے
جو سب کچھ معاف کر سکتی ہے۔ گل اس کی ٹوٹی ٹانگ کو معاف نہ
کر سکی مگر ماں ٹوٹی ٹانگ بھی معاف کر دے گی اور اس کا ٹوٹا دل بھی۔
وہ اپاہج بیٹے کو بھی سینے سے لگا لے گی۔ وہ کہے گی "میرا لعل تو
واپس آ گیا غازی بن کر، اپنے ملک کا نام روشن کر کے، خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ہے۔" اور اگر وہ شہید ہو جاتا تب بھی وہ اسے معاف کر
دیتی۔ کبھی شکایت نہ کرتی کہ وہ اندھی ماں اور پانچ بے سہارا بہنوں
کو چھوڑ کر کیوں چلتا بنا ـــــــ وہ کل اسے ضرور خط لکھ دے گا۔
ماں یہ پڑھ کر یقیناً خوش ہو گی کہ وہ زندہ ہے۔

---

(۶)

غنچہ نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھائی کے ہاتھوں قیامت تک نہ بکے گی بھائی اسے اکبر جیسے پیارے شخص سے جدا کر کے کسی گنوار لٹھ مزدور کے پلے باندھ دے گا مگر وہ یہ کبھی نہ ہونے دے گی۔ اس نے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر دیکھ لیا تھا آزادی اس کے رگ و پے میں رچ بس گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ اسے گھر سے نکال دے گا تو وہ اس قابل تھی کہ خود کما کھائے۔ اکبر کی توجہ نے اس میں خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ان سینکڑوں کام کرنے والی عورتوں سے الگ ہے، بلند ہے ـــــ آخر کوئی چیز اس میں تھی جو ایک کرسی پر بیٹھنے والے اور کوٹ پتلون پہننے والے بابو کی نظر اس پہ پڑی۔ کیا وہ اس چیز کو اور ترقی نہیں دے سکتی

اور نکھار نہیں سکتی، یقیناً دنیا کی نظر میں اس کی عزت اور زیادہ ہو جائے
گی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھائی کے نوکری نہ کرانے کے فیصلے سے
فائدہ اُٹھا کر آگے پڑھے گی۔ تعلیم کا معجزہ اس نے کارخانے میں دیکھا
تھا۔ اس کی چھ جماعتیں بھی کام آگئی تھیں۔ پھر جو میٹرک پاس تھے وہ
اس سے اُونچے تھے، بی اے پاس ان سے بلند تھے کارخانے کا مینجر
سُنا تھا ولایت تک ہو آیا تھا، مالک تو شاید بہت ہی پڑھا لکھا ہو گا
(ابھی غنچہ کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ مالک لوگوں کے لیے تعلیم قطعی ضروری
نہیں ہے) پھر جب بھائی کی طرف سے بے فکری نہ ہو، اپنے پاؤں
پر کھڑا ہونا ضروری ہو تو کیوں نہ وہ اپنے لیے کسی صاف سُتھری،
اُونچی جگہ کا انتخاب کرے۔ وہ ایک دفعہ زمان کے ساتھ تو شہرہ کا
دواؤں کا کارخانہ دیکھنے گئی تھی، وہاں صاف ستھری مشینوں کے
آگے صاف ستھری لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک جگہ وہ دوائیں ٹیوبوں
میں ڈال کر انہیں پیک کر رہی تھیں، چند لڑکیاں ان پر لیبل لگا رہی تھیں
اور ایک عورت انہیں چیک کر رہی تھی۔ بھائی نے بتایا تھا کہ چیک
کرنے والی عورت ان کی انچارج ہے، وہ سب سے زیادہ پیسے
لیتی ہے۔ حالانکہ اس کا کام سب سے کم ہے۔ اس کی وجہ پوچھنے پر
بھائی نے بتایا تھا کہ وہ عورت ان سب سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے

اس کا کام زیادہ سمجھ داری کا ہے جو ایک پڑھی لکھی عورت ہی کر سکتی ہے، اس لیے خواہ کام کم ہو مگر تنخواہ زیادہ ملتی ہے۔ اپنے کارخانے میں بھی تو اس نے یہی دیکھا تھا، مزدور سارا سارا دن کام کرتے اور بوجھ ڈھوتے تھے۔ گرمی کے موسم میں دھوپ اور لو میں اور سردی کے موسم میں کھُلے میدان کی ٹھنڈی ہواؤں میں۔ کلرک لوگ پنکھوں کے نیچے یا آتشدان کی آگ کے سہارے رہتے تھے، خوش گپیاں بھی کرتے تھے اور چائے بھی پیتے تھے۔ ان سے اُوپر کے افسروں کا کام اور بھی کم تھا اور مینیجر تو غنچہ کو یوں لگتا تھا جیسے کلب میں بیٹھا ہو۔ آنے جانے والوں سے ٹھٹھا کرنے اور گھوم پھر کر کارخانہ دکھانے کے ہی ہزاروں سمیٹتا تھا تو پھر کیوں نہ وہ بھی پڑھ ڈالے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔ غنچہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جن کو پڑھائی ایک عذاب معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہ کند ذہن تھی نہ کام چور۔ اسکول میں اس کا دل بھی خوب لگتا تھا چنانچہ بھائی کی اجازت سے اس نے دوبارہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اسکول کی ہیڈ مسٹرس نے یہ دیکھ کر کہ اس کے کئی سال برباد ہو گئے ہیں اور یہ اندازہ کر کے کہ وہ کمی پوری کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اسے ایک کلاس آگے داخل کر لیا۔ بھائی چپ ہو گیا کہ اسی بہانے وہ بہلی رہے گی اور جوں ہی مناسب رشتہ ملا وہ

اسے چلنا کرے گا۔ اس طرح اس نے مڈل پاس کر لیا، پھر اس پر میٹرک کرنے کی دھن ایسی سوار ہوئی جیسے کسی پر نشہ سوار ہوتا ہے۔ ان کے گاؤں کا اسکول اسی سال مڈل سے ہائی ہوا تھا اور غنچہ اس گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو نویں کلاس میں آگئی تھی۔ میٹرک پاس کرنے سے پہلے کوئی اس کے سامنے شادی کا نام نہ لے وہ اکثر یہ بات عورتوں کے کان میں ڈالتی رہتی تھی، ادھر ڈھنگ کا کوئی رشتہ مل ہی نہیں رہا تھا۔ آخر زمان نے سوچا کہ غنچہ کی وجہ سے اب وہ زیادہ دن اپنی شادی ملتوی نہیں کر سکتا۔ پہلے اس کا ارادہ یہی تھا کہ غنچہ اپنے ٹھور ٹھکانے کی ہو جائے تو بیاہ کرے تاکہ وہ روائتی لڑائیاں جو ساس بہو اور نند بھاوج کے درمیان ہوتی ہیں اسے نہ بھگتنی پڑیں مگر اب مجبوری تھی۔ غنچہ کو جلدی شادی پر آمادہ کرنے کا یہ تیر بہدف نسخہ بھی تھا۔ نند بھاوج میں نبھی تو نبھی نہ نبھی تو تنگ آکر خود ہی شادی میں پناہ ڈھونڈے گی اور کیا ——— مائی ہجیراں تو پہلے ہی سب کے رشتے تقریباً لگائے رکھتی تھی اس سے کہنے کی دیر تھی کہ اس نے جوڑ توڑ شروع کر دیے لیکن لین دین کے معاملے نے طول کھینچا اور اور غنچہ کی خوش قسمتی سے ڈیڑھ سال اسی طرح نکل گیا۔ آخر جس سال وہ میٹرک میں تھی اس کا بھائی ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب

دلہن بیاہ تو خیر نہیں، خرید لایا۔ مزاج کی تیز، صورت کی اچھی، میاں کی لاڈلی دلہن کو پڑھی لکھی نند ذرا پسند نہ آئی اور وہی ہوا جس کا زمانہ کو اندیشہ تھا یعنی آپس میں ٹھنی رہنے لگی، دلہن کو یہ کہاں گوارا کہ وہ روٹیاں تھوپے اور نند صاحبہ اسکول سے آئیں اور پکی پکائی ٹھوس لیں۔ ہوتا یوں کہ جب غنچہ اسکول سے آتی کبھی روٹی کم کبھی سالن ندارد۔ بھائی کے سامنے ظاہر کر دیا تو بھابی نے اُلٹے شکوے کر کے ٹسوے بہانے شروع کر دیے۔ رات کی تنہائیوں میں جب ہر مرد کا دل ذرا نرم پڑ جاتا ہے اسے سکھلایا جاتا کہ اسکول کی پڑھی لکھی لڑکیاں بدنام ہو جاتی ہیں، بس اب زیادہ پڑھانے کی کیا ضرورت ہے اسے کھونٹے سے باندھو، کوئی بات بھی ہو میٹرک ضرور پاس کریں گی صاحبزادی، آج تک ان کے گاؤں کے دو چار سے زیادہ لڑکوں نے میٹرک پاس نہیں کیا تو لڑکی ذات کو ڈگری کی ایسی کیا ہوس ہے، اس طرح اور شادی کے مواقع کم ہو جائیں گے ہاں نہیں تو گاؤں میں کون ہاتھی اپنے گھر باندھے گا۔ شاید ہر پابند شخص کو دوسرے کی آزادی بُری معلوم ہوتی ہے، اسی لیے بھابی کی پوری کوشش یہی تھی کہ اسے جلد از جلد شادی کی جکڑ بندیوں میں باندھا جائے وہ تو زیادہ چھان پھٹک کی قائل نہیں تھی مگر بھائی اچھے

رشتے کی تلاش میں تھا وہ بھی یہ سوچ کر طرح دے رہی تھی کہ موٹی رقم ہاتھ آسکے تو اچھا ہی ہے۔

ادھر یہ جوڑ توڑ ہو رہے تھے ادھر غنچہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی۔ پشاور میں لڑکیوں کو "ولیج ایڈ" کی تربیت دی جا رہی تھی۔ کتنی ہی جوان بیوائیں اور بے سہارا کنواری لڑکیاں وہاں کھپ گئی تھیں۔ ابھی تو صرف جیب خرچ دیا جاتا تھا مگر بعد میں تنخواہ اچھی خاصی تھی اور آگے ترقی کے امکانات بھی تھے۔ لڑکیوں کا ارادہ تھا کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے تھا اور اگر ہو تو اس کی بلا سے۔ اس نے اپنی ہیڈ مسٹرس کے ذریعہ سارا کام کروایا اور بھائی کو صرف اطلاع دی۔ بھائی نے شور مچا کر اور اپنا حق جتا کر اسے باز رکھنا چاہا مگر بیوی نے رات کے کسی پگھلتے لمحے میں سمجھایا کہ جب تک شادی کا پورا بندوبست نہ ہو جائے اسے جانے دو، اس کی خوشی ہو جائے گی، پیسوں سے کچھ اپنے کپڑے لتے ہی بنا لے گی، پھر سارا ٹھور ٹھکانہ کر، اسے بُلا بیاہ ڈالیں گے۔ اس طرح ابھی میٹرک کا ریزلٹ بھی نہیں نکلا تھا کہ غنچہ اپنے گاؤں نصر پورہ سے نکل کر پشاور کے "ولیج ایڈ" کے ہاسٹل میں جا پہنچی۔ یہاں آکر اس نے آزادی کا ایک نیا پہلو دیکھا اور محسوس کیا۔ بھابی کے آنے کے بعد سے پہلی مرتبہ

پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور پیر پھیلا کر سوئی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس علاقے کے کسی ادارے میں اتنی بہت سی عورتیں یکجا ہو سکتی ہیں۔ پھلوں کے کارخانے کی پھر یہ بات تھی کہ شام کو تو سب پنچھیوں کی طرح اپنے گھروں ہی میں بسیرا لیتی تھیں مگر یہاں تو دن رات گھر سے دور اور محافظوں سے الگ رہنا تھا۔ غور کرنے پر غنچہ نے دیکھا کہ یہاں پر زیادہ تر زمانے کی ستائی ہوئی عورتیں ہیں۔ اکثر بیوہ تھیں، ایسی عورتوں کی تعداد بھی خاصی تھی جن کے شوہروں نے دوسری شادی کر کے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ انہیں کئی ایک کے بچے بھی تھے اور دو ایک تو اپنے چھوٹے بچوں کو ادارے میں ساتھ ہی رکھتی تھیں۔ کنواری لڑکیوں میں وہی تھیں جن کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ بے سہارا تھیں یا بھائیوں کے رحم و کرم پر تھیں جن کے گھر رہنے سے وہ جہنم میں رہنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ غنچہ کو جس کمرے میں جگہ ملی اس میں تین لڑکیاں اور تھیں۔ دو تو اسی کی طرح گاؤں کی رہنے والیاں تھیں جن پر گنوارپن کا ٹھپہ لگا ہوا نظر آتا تھا مگر ایک لڑکی کو تو وہ خاصی دیر تک یہاں کی استانی سمجھتی رہی۔ اس کی ہر بات میں شہر کی سی لڑکیوں کا رکھ رکھاؤ تھا۔ سفید ساٹن کی شلوار، ریشمی پھول دار قمیض اور جالی کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی، ہاتھ میں نازک سی گھڑی تھی۔ لمبی سی چوٹی اور نئی طرز کے

جوتے۔ وہ آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر بولتی تھی اور بولنے کا انداز بھی
ایسا تھا جیسے کوئی سمجھدار عورت بچوں سے بات کر رہی ہو۔ جب
غنچہ کو پتہ چلا کہ وہ بھی ان کی طرح ایک طالبہ ہے تو اسے بڑا تعجب ہوا
غنچہ نے اپنی چیزیں رکھتے ہوئے جب کمرے کو غور سے دیکھا تو
اس لڑکی کی چیزیں بالکل الگ نظر آئیں۔ سفید چادر والے بستر پر
امیر زادیوں کے بستروں پر ایسا بیڈ کور بھی پڑا تھا۔ کھڑکی کی سل پر
سُرخ رنگ کا تھرماس تھا اور نزدیک شیشے کا گلاس۔ آئینہ کے سامنے
بڑھیا قسم کا تیل، کنگھا اور برش تھا کریم کی شیشی تھی۔ غسلخانے
میں ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش اور سفید براق سا تولیہ۔ غنچہ کو اپنی بے سروسامانی
پر بڑی شرم آئی، کپڑے تو پھر بھی اس کے پاس تھے اس کے آگے تو
بس اللہ کا نام تھا۔ گھسا پٹا سا ایک کھیس جو اب اس لڑکی کے بیڈ کور
کے آگے اور بھی گھٹیا اور بوسیدہ نظر آرہا تھا۔ پتھر کی طرح سخت
اور شہتیر کی طرح لمبا، چپٹا سا تکیہ جو سفید تنگ غلاف میں کسی بچے
کی قبر معلوم ہوتا تھا۔ اس پر طرہ کچے رنگوں میں کڑھے ہوئے بے
ڈھنگے پھول جن کا رنگ، سفید کپڑے پر یوں پھیل گیا تھا جیسے رونے
سے بچوں کی آنکھوں کا کاجل پھیل جاتا ہے۔ سُرخ چھینٹ کا سستا
سا لحاف۔ سنگھار کی چیزوں میں دھندلا سا ہتھیلی بھر کا آئینہ، ٹوٹے

دانتوں کی سبز سی کنگھی، سفید ٹین کی چمکتی کاجل کی ڈبیہ اور بس۔ جوتوں
میں ایک کالی پٹی کے چپل اور ایک سنہری سینڈل جب کہ اس لڑکی
کے جوتوں کی اچھی خاصی قطار تھی۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی چیزوں
کی طرف دیکھا تو تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ ان کا حال اس سے بدتر نہیں
تھا تو بہت زیادہ بہتر بھی نہیں تھا۔ دوستی کا ہاتھ پہلے اس نے
اپنی جیسی لڑکیوں کی طرف ہی بڑھایا۔ ایک کا شوہر مردان میں چینی کے
کارخانے میں کام کرتا تھا اور وہیں مشین کے ایک حادثے کی نظر ہو
گیا تھا۔ دوسری طلاقن تھی جس کا میاں سوات میں بننے والی کسی نئی
سڑک پر کام کرنے گیا تھا اور وہیں کسی حسین سواتن سے شادی کر کے
اسے چھوڑ دیا تھا۔ اپنی چوتھی اور اسمارٹ ساتھن کے متعلق پوچھنے
پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ثریا ہے، شاید زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں ہے
ورنہ یہاں کیوں آتی مگر قرینے سے کسی کھاتے پیتے گھر کی لڑکی معلوم
ہوتی ہے۔ وہ کن حالات میں یہاں پہنچی ہے یہ کسی کو معلوم نہیں
گو وہ عادت کی بہت اچھی ہے اور ہر ایک کے دکھ درد میں شریک
ہوتی ہے مگر اپنے متعلق کچھ بتانے سے کتراتی ہے، اور جب بھی
پوچھو ٹال جاتی ہے۔ غنچہ پر اس کا کچھ ایسا رعب بیٹھا کہ دوستی کرنا
تو الگ رہا اس کی طرف دیکھنے سے بھی گھبراتی، باقی دونوں سے تھوڑا

سے بھی اس کی زیادہ نہ بنی کیونکہ عمر کے علاوہ ذہنی تفاوت بھی بہت تھا
آخر بات چیت کی شروعات خود ثریا نے کی اور جلد ہی غنچہ کا (جوہر
اچھی اور بڑھیا چیز کی طرف فطرتاً کھنچتی تھی) دل موہ لیا۔ ثریا غنچہ سے
عمر میں بڑی ضرور تھی مگر انمیں ذہنی تفاوت زیادہ نہیں تھا پھر ایک
بات دونوں میں مشترک تھی یعنی دونوں کنواری تھیں۔

صبح ان کی کلاسیں ہوتیں جن میں ہائیجین، بچوں کا رکھ رکھاؤ، فرسٹ ایڈ
وغیرہ پر لیکچر دیے جاتے اور وہ نوٹس تیار کرتیں۔ سلائی اور کٹائی بھی
سکھائی جاتی۔ پورے اسکول کو کئی ٹولیوں میں بانٹ دیا گیا تھا، باری باری
ایک ٹولی کھانا پکاتی۔ سکول کی صفائی کرتی، بستروں کی چادریں، تکیے
کے غلاف، پردے، میز پوش وغیرہ بھی یہ لڑکیاں ہی دھوتیں۔
تقریباً سب گھروں سے کام کرتی آئی تھیں اس لیے یہاں بھی خوشی
خوشی کام میں جٹی رہتیں۔ مل جل کر لڑ بھڑ کر کام ہو ہی جاتے، مشغلہ
بھی رہتا۔ ثریا نے غنچہ کو اپنی ٹولی میں رکھ لیا۔ غنچہ نے دیکھا کہ لڑکیاں
ثریا کو کام نہیں کرنے دیتیں، وہ مسالحہ پیسنے لگتی تو سل کا بٹہ ہاتھ سے
چھین لیا جاتا، آٹا گوندھنے بیٹھتی تو کوئی لڑکی تسلہ اس کے ہاتھ سے
لے لیتی۔ روٹی پکانے اور کپڑے دھونے کا کام بھی اس سے نہ
کروایا جاتا ہاں سب کے ساتھ بیٹھ کر آلو چھیل دینے یا پالک بین دینے

کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ انہیں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی باری باری انچارج ہوتی، انچارج کوئی بھی ہو ثریا کی حیثیت مستقل انچارج کی سی تھی۔ کسی کا حکم ٹل جاتا مگر اس کی بات نہ ٹالی جاتی۔ غنچہ نے جب ثریا کے ساتھ زیادہ رہنا شروع کیا تو نہ صرف اس سے کپڑے پہننے اور اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ سیکھا بلکہ اس کی وجہ سے اسے بھی کاموں میں رعایت ملنے لگی۔ اپنی خوشی سے چاہے جو کام کر دے مگر اسے "حکم" نہیں دیا جاتا تھا ——" میں اکثر بیمار رہتی ہوں نا اس لیے یہ لڑکیاں مجھے کوئی بھاری کام نہیں کرنے دیتیں" ثریا نے غنچہ کو بتایا یہ بات سچ تھی، ثریا زرد اور کمزور تھی اور اکثر بیمار رہتی تھی مگر اس کے اس درجہ خیال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اپنی کاپیاں، قلم دوپٹے اور جوتے تک لڑکیوں کو فراخ دلی سے دے دیتی تھی اور واپس لینا بھول جاتی تھی۔

پہلا وظیفہ ملتے ہی غنچہ ثریا کو لے کر بازار گئی اور اس کی پسند سے کئی چیزیں خریدیں۔ بیڈ کور خریدنے کا یارا نہ تھا تو ثریا نے اسے موٹا سا ایک رنگین کپڑا دلوایا جس پہ لٹھے کی کترنوں کے پھول بنا کر ٹانکے اور نئی وضع کا پلنگ پوش تیار کر لیا۔ منجن کے بجائے ٹوتھ پیسٹ اور برش لیا، اچھا سا کنگھا بھی، کچھ نئے کپڑے اور جوتے

بھی لیے۔ آہستہ آہستہ وہ ثریا سے بھی ذرا سا آگے نکل گئی یعنی پاؤڈر کا ڈبہ اور ہلکے شیڈ کی ایک لپ اسٹک بھی لے آئی۔ اب اگر وہ عورتیں غنچہ کو دیکھتیں جو صرف عید کے گلابی کپڑے پہنے دیکھ کر ہی چونک اُٹھی تھیں تو دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتیں، شاید اسے کالج کی کوئی لڑکی سمجھ کر پہچانتی بھی نہیں۔ ثریا نے اسے دوپٹہ چننا سکھایا تھا مگر بعد میں اس نے اس کام میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ ثریا کے فرشتے بھی نہ کر سکتے۔ ایک دن میں وہ کئی کئی دوپٹے ایسی باریکی سے چنتی کہ لڑکیاں دیکھ کر دنگ رہ جاتیں۔

ہفتے کی شام کو لڑکیاں مل کر بازار یا پکچر کے لیے جاتیں مگر ثریا اپنے بھائی رحمان کا انتظار کرتی، غنچہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ چلی تو جاتی مگر اسے خرید و فروخت میں مزہ آتا نہ پکچر میں۔ ایک دن اس نے ثریا سے کہا کہ کیا وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لیجا سکتیں۔ ثریا کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی "کیوں نہیں اگلے ہفتے تم ہمارے ساتھ چلنا" اگلے ہفتے وہ ثریا کے ساتھ گئی اور پھر ہر ہفتے اسی کے ساتھ جانے لگی۔ ثریا برقع اوڑھتی تھی مگر غنچہ نے ساری عمر برقع نہیں اوڑھا تھا اور اب بھی وہ اسی طرح باہر نکلتی صرف سر ڈھانکے رکھتی۔ اس کی طرح کی اور بھی

لڑکیاں تھیں جو اپنے گاؤں میں برقع نہ اوڑھتی تھیں مگر یہاں آکر سب نے
پردہ شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ہاسٹل میں غنچہ اکیلی لڑکی تھی جو بے پردہ
تھی۔

رحمان انہیں کسی ریستوران میں لے جا کر چائے پلاتا یا آئس کریم
کھلاتا۔ غنچہ نے محسوس کیا کہ یہ دونوں کبھی اپنے گھر کے بارے میں کوئی
بات نہیں کرتے۔ رحمان اپنے دفتر کے قصے، ملنے جلنے والوں کا ذکر،
کسی حادثے کی خبر یا ایسا ہی کوئی روکھا پھیکا موضوع چن لیتا۔ مگر اس
کی شکل اور بات کرنے کے انداز میں کچھ ایسی کشش تھی کہ غنچہ کو وہ بات
بڑی اہم سی نظر آنے لگتی۔ خاموش ہوتا تو اس کے بھرے بھرے ترشے ہوئے
ہونٹ بڑے پیارے لگتے، ہنستا تو بے جے ہوئے سفید دانت اور اس
کی آواز کی کھنک اچھی لگتی۔ ثریا اوّل تو بولتی ہی کم، کچھ کہنا ہی ہوتا تو
اپنے اسکول کے قصے چھیڑ دیتی، وہ رحمان سے زیادہ غنچہ سے باتیں
کرتی جسے رحمان بھی دلچسپی سے سُنا کرتا۔ یہاں سے اُٹھ کر وہ شاپنگ
کرتے۔ رحمان شاپنگ کرانے میں بھی پیش پیش ہوتا وہ ایک دوکان سے
چیزیں لینے لگتیں تو وہ اصرار کرتا کہ دو ایک دوکانیں اور دیکھ لی
جائیں۔ اس طرح تقریباً سارے بازار کا چکر لگ جاتا۔ اس دوران میں
پکچر کا وقت ہو جاتا۔ پکچر کے بعد انہیں رحمان بس اسٹینڈ تک چھوڑنے

آتا، کچھ اِدھر اُدھر کی، کچھ موسم کے بارے میں گپ شپ ہوتی یا رحمان کوئی لطیفہ سُناتا، پھر وہ انہیں آخری بس میں بٹھا کر رخصت ہو جاتا۔ رحمان ثریا سے زیادہ بڑا معلوم نہیں ہوتا تھا مگر غنچہ نے محسوس کیا کہ ان کے رشتے میں بہن بھائیوں کی سی نرمی گرمی ہے نہ اُوپر تلے کے بہن بھائیوں کی الیسی لاگ لپیٹ اور شوخی، دونوں کچھ ایسے دبے سے رہتے تھے۔ رحمان بے تکلفی یا شرارت کی کوئی بات کرتا بھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ثریا نے اسے پسند نہیں کیا اور وہ بھی محتاط ہو جاتا۔ غنچہ کے رحمان کے بارے میں کئی دفعہ پوچھنے پر ثریا نے بتایا کہ وہ کسی فرم میں ملازم ہے، ابھی کنوارا ہے اور شہر میں کہیں رہتا ہے۔

سرِ شام ہی رات کا کھانا کھا کر وہ سب فارغ ہو جاتیں گرمیوں کا زمانہ تھا، باہر لمبے چوڑے صحن میں چارپائیاں ڈال اور لبستر بچھا وہ بیٹھ جاتیں کوئی پڑھائی کرنے لگتی۔ کوئی کڑھائی ورنہ پھر باتیں شروع ہو جاتیں۔ گھروں کی باتیں نکل آتیں اور وہ باری باری اپنے گھروں کے قصے سنانے لگتیں۔ سوتیلی ماؤں کے مظالم، سگے باپوں کی بے نیازی جاؤ سے بیاہ کر لانے کے بعد جوتے لگانے والی ساسوں کے قصے اور دُوسری شادی کر لینے والے شوہروں کے دکھڑے۔ ان باتوں کو بہت مرتبہ دہرا لینے کے بعد اب ان میں شخصی دُکھ کی پرچھائیاں بھی نہیں

رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنے واقعات نہیں کسی اور کے قصّے سنا رہی ہوں۔ انہیں باتوں میں غنچہ بھی اپنے بھائی اور بھاوج کی زیادتیوں کے قصّے سنا دیتی۔ کتنا دل ہلکا ہو جاتا تھا یہ باتیں سنا کر ——— مگر ثریا جانے کس مٹّی کی بنی ہوئی تھی، کبھی جو منہ سے کچھ پھوٹ جائے۔ باقی لڑکیاں تو تیار بیٹھی رہتیں کہ کسی کی بات ختم ہو تو وہ اپنی چھیڑیں، بعض دفعہ درمیان ہی میں بول پڑتیں مگر ثریا تھی کہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے سب کی سنتی رہتی، آخر کوئی لڑکی بول اٹھتی "بھئی تم بھی تو سناؤ کچھ اپنے گھر کے قصّے۔"

"میں، کیا سناؤں کوئی خاص ہیں ہی نہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو"

"ارے بھئی میری دوا کا وقت نکل گیا، توبہ بھول ہی گئی۔"

وہ دوا کا بہانہ کر جھٹ اٹھ کر کمرے میں چلی جاتی اور جب لوٹتی تو گفتگو کا موضوع بدل چکا ہوتا، یا وہ خود بدل دیتی۔ غنچہ کو یہ بات بڑی عجیب لگتی۔ جانے ایسا کیا راز ہے ان کی زندگی میں۔

ان کی دوستی کا رشتہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا، غنچہ کو یقین تھا کہ ثریا کسی دن اسے اپنی کہانی ضرور سنا دے گی اس لیے وہ سب کے سامنے اسے آپ بیتی کہنے پر مجبور نہ کرتی بلکہ ایسے موقعوں پر موضوع

بدلنے میں ثریّا کا ساتھ دیتی۔

گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو وہ گاؤں گاؤں اپنا سبق دہرانے نکلیں۔ ان کا کام تھا گاؤں میں عورتوں کو تربیت دینا ان سب چیزوں کی جن کی تربیت وہ خود حاصل کر رہی تھیں۔ ان کے ٹھہرنے کے لیے ایک آدھ کمرے کا بندوبست کر دیا جاتا کھانا اکثر خود پکانا پڑتا۔ لڑکیاں گھر گرہستی، بچّوں کی پرورش، صحت اور گھر کی صفائی کے بارے میں لیکچر دیتیں اور خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں بتاتیں۔ عورتیں یہ ساری باتیں سُنتیں تو بڑے شوق سے مگر ان کی کچھ زیادہ قائل نہ ہوتیں، حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ ان باتوں سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھیں۔ ان کے مسئلے اتنے اُلجھے ہوئے تھے جو اِن لڑکیوں کے بس سے باہر تھے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے ان کے شوہر خلاف تھے، وہ ان چیزوں کو عیاشی کا ذریعہ گردانتے تھے، وہ مذہب کی آڑ لیتے تھے اور اس بات پہ طلاق تک دینے کو تیار ہو جاتے تھے خود آپریشن کرانے میں اِن کی مردانگی کو زبردست ٹھیس لگتی تھی بہت سے گھروں میں ٹی بی کے مریض تھے جو چھوٹے چھوٹے گھروں میں گھر والوں کے ساتھ رہتے سہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ چھوت چھات کو گاؤں والے انسانیت کے منافی سمجھتے تھے اور اس بات کے

قائل تھے کہ بیماری لگنی ہو گی تو سات تالوں میں بھی لگ جائے گی،
بتلانے اور لیکچر دینے پر وہ چھوت کے قائل ہو بھی جاتے مگر کرتے
کیا، ہسپتال میلوں دور ہیں، ان میں جگہ نہیں ملتی، پرائیویٹ وارڈ
میں رکھنے اور سینی ٹوریم میں بھیجنے کی سکت نہیں، اتنی حیثیت نہیں
کہ اسے الگ کمرہ دے دیں اور گھر والوں کو اس سے بچا سکیں،
بس خاموشی سے اس کے مرنے کا انتظار کرتے رہتے۔ محلے اور گلیوں
کی صفائی بھی ان کے بس سے باہر ہے پانی کے نکاس کا کوئی انتظام
نہیں۔ جانور گھر میں نہ باندھیں تو کہاں باندھیں، باہر سے چور لے
جاتے ہیں۔ بچوں کو اسکول میں پڑھائیں تو اتنے لمبے چوڑے کنبے
کا خرچ کیونکر پورا کریں۔ بچوں کو گلیوں میں گالی گلوچ نہ کرنے دیں
تو اتنا وقت کہاں سے لائیں کہ ان کو بیٹھ کر کہانیاں سنائیں۔ ان کے
لیے کیرم بورڈ اور گیند بلّے کہاں سے خرید کر دیں۔ جب وہ ایسے
سوال کرتیں تو لیکچر دینے والیاں بغلیں جھانکنے لگتیں، جہاں تک
ہو سکتا ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتیں مگر ان مشکلات
کی جڑیں اتنی گہری تھیں اور آپس میں ایسی پیوستہ تھیں کہ انہیں
ہار ماننی پڑتی۔ ان کے لیکچر کے بعد عورتیں ہاتھ چلا چلا کر کہتیں کہ بن سنور
کر دیہات سدھار کے لیے نکل پڑتی ہیں ان حالات میں گھر چلانا پڑے

تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لڑکیاں چند دن ایک گاؤں میں رہتیں پھر دُوسرے گاؤں کا رُخ کرتیں۔ ان کے لیے یہ کام کا کام تھا، سیر کی سیر اور تفریح کی تفریح' غنچہ کے لیے اس کام میں یوں اور آسانی تھی کہ وہ ان لوگوں کی زبان سمجھتی اور بولتی تھی۔ وہ اس کی بات زیادہ دھیان سے سُنتی تھیں اور اس کو جلد اپنا ہمدرد سمجھ لیتی تھیں۔ بہت سے دُور افتادہ علاقوں میں پھرنے کے بعد جب غنچہ اس جگہ کے ہیڈ کوارٹر واپس آئی تو اسے ایک خط ملا جو کئی جگہ سے گھوم کر آیا تھا۔ خط اس کے ماموں کا تھا جس میں یہ روح فرسا اطلاع تھی کہ اس کا بھائی اچانک کسی کی گولی لگ جانے سے جان بحق ہو گیا۔ تفصیل اس حادثے کی یہ تھی کہ زمان اپنے کسی دوست کی شادی میں گیا تھا۔ برات رخصت ہوتے وقت اس علاقے میں لڑکی والے ہوائی فائر کرتے ہیں۔ آپس کی دشمنیاں بھی اس علاقے میں عام ہیں۔ اس ہوائی فائر سے فائدہ اُٹھا کر کسی نے کوٹھے پر سے اپنے کسی دشمن کو نشانہ بنایا، نشانہ چوک گیا، گولی زمان کے لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ غنچہ روتی پیٹتی اپنے گاؤں پہنچی مگر زمان کو سپردِ خاک ہوئے بھی کئی روز ہو چکے تھے۔ وہ بھائی کی قبر سے لپٹی بہت دیر روتی رہی، آخر

لوگ باگ اسے زبردستی گھر لے آئے۔ یہ وہی گھر تھا جہاں وہ اور بھائی برسوں اکٹھے رہے تھے، اس وقت یہ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا، کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ غنچہ ایک ہفتے وہاں رہی اور اس کے بعد اس نے واپس پشاور جانے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے بھابی سے بھی "ویلج ایڈ" میں داخلہ لینے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنے میکے چلی گئی اور غنچہ واپس ہاسٹل چلی آئی۔ اب اپنے گاؤں سے، رشتہ دارو سے اور اپنے لوگوں سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لیے کٹ چکا تھا۔

---

(۷)

واپسی پر کچھ دن تو غنچہ بڑی مغموم رہی پھر رفتہ رفتہ طبیعت
سنبھل گئی، اور آہستہ آہستہ حالات معمول پہ آ گئے، وہی پڑھائی اور
ہفتے کی شاپنگ اور پکچر کا سلسلہ شروع ہو گیا، اب ایک نئی بات
ہوئی۔ رحمان ہمیشہ ثریا کے پاس بیٹھا کرتا تھا مگر ایک دفعہ گیٹ پر
ٹکٹ دیتے ہوئے وہ پیچھے رہ گیا۔ بعد میں وہ گھوم کے اس طرف
سے آیا جدھر غنچہ بیٹھی تھی، وہ بڑی بے فکری سے یوں اس کے
پاس جم گیا جیسے اس نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ وہ کہاں بیٹھ رہا ہے پھر
ایک انتہائی رومانی سین پر غنچہ کو اپنے ہاتھ پر کسی چیز کا دباؤ محسوس
ہوا۔ یہ رحمان کا ہاتھ تھا۔ کوشش سے غنچہ نے اپنا ہاتھ الگ کر
لیا مگر باقی وقت وہ پکچر نہ دیکھ سکی۔ رہ رہ کر اس کا دل دھڑکتا اور

پسینہ آ آ جاتا۔ آج اسے اکبر بہت یاد آیا رحمان یوں اکبر سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا مگر وہ اکبر والی بات نہ تھی۔ شاپنگ کے وقت بھی وہ اسے چوری چوری دیکھتا رہا مگر ان نظروں میں بھی وہ بات نہیں تھی جو اکبر کی نظروں میں ہوتی تھی۔ آج ایک دوکان میں غنچہ نے سرخ رنگ کا اسکارف لٹکا دیکھا اور اسے وہ عورت یاد آ گئی جو سفید رنگ کی چوڑی سی کار چلاتی گزری تھی۔ غنچہ نے اسکارف اتروا کر دیکھا اور اس کی قیمت پوچھی، اسکارف بہت خوبصورت تھا اور قیمت بھی زیادہ نہ تھی، غنچہ کا دل چاہا خرید لے، پھر اس نے سوچا وہ اس کا کرے گی کیا، نہ اس کو دوپٹے کی طرح اوڑھ سکتی ہے نہ امریکن عورتوں کی طرح سر پہ باندھ کر گھوم سکتی ہے۔ اس خیال سے اس نے اسکارف دوکان دار کو واپس دے دیا۔

دوسرے ہفتے رحمان پھر اس کے پاس بیٹھا۔ اب کہ اس کے ہاتھ پر کوئی نرم سی چیز لگی، نرم اور ریشمی۔ اس نے نیچے دیکھا۔ رحمان اس کے ہاتھ میں کچھ دے رہا تھا "یہ کیا ہے ؟" غنچہ نے پوچھا۔

"بس یونہی ایک چھوٹی سی چیز تمہارے لیے" اس نے کان میں سرگوشی کی اور پرس اس کی گود سے اٹھا کر خود ہی وہ چیز پرس میں رکھ دی، پھر اسے واپس دیتے ہوئے اپنی انگلیاں بڑی بے تکلفی

سے غنچہ کی انگلیوں سے چھوا دیں۔ ہاسٹل آکر سب کی نظر بچا کر غنچہ نے
پرس کھول کر دیکھا تو اس میں وہی سُرخ اسکارف تھا، جیسے انار کی
کلیوں کے ڈھیر، یا امریکن عورتوں کے سُرخ ہونٹوں کے انبار۔ وہ
خاصا لمبا چوڑا تھا اور بے حد نرم، اپنی قیمت سے کہیں زیادہ قیمتی
اور خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ غنچہ نے اسے سُونگھا، سینے سے
بھینچا، پھر تکونا کر کے سر پہ باندھا اور آئینہ میں دیکھا۔ اس کا چہرہ اس
سُرخ ہالے میں، اس ریشمی قیمتی سُرخ ہالے میں اور بھی نکھر آیا تھا۔
دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے اس نے اس بیش قیمت تحفہ کو اپنے
کو اپنے پُرانے ٹرنک میں سب سے نیچے چھپا دیا۔ بار بار اس کے
دل میں گدگدی ہو رہی تھی، ثریّا کو بتا دے! مگر نہیں۔ شاید ثریّا
اسے اچھا نہ سمجھے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اس کے بھائی کو
غلط راہ پہ ڈال رہی ہے۔

اب کبھی وہ ثریا کے پاس بیٹھ جاتا اور کبھی اس کے پاس،
بالکل انجان بن کر جیسے اسے تو صرف پچھر سے غرض ہے یہ احساس
ہی نہیں ہے کہ وہ بیٹھا کہاں ہے، مگر جب بھی وہ غنچہ کے پاس
بیٹھتا کوئی نہ کوئی چیز غنچہ کے ہاتھ میں آتی جس کے بعد اس کا ہاتھ
رحمان کے ہاتھ ہی میں رہتا۔ رحمان کے ہاتھ پکڑنے میں وہ کیفیت

تو نہیں تھی جو اکبر کے ہاتھ تھام لینے سے پیدا ہوتی تھی، ایک خوشگوار
سی گدگدی اور تھرتھراہٹ جسم کے ہر حصے میں تیرتی ہوئی مگر
ہاں کچھ بے نام سی کیفیت ضرور تھی جس سے اس کا سانس تیز ہو
جاتا تھا، ماتھے پر پسینہ آجاتا تھا، ثریا کوئی بات کرتی تو سُن لینے
کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی اور پکچر کے کئی سین سر سے یوں گزر
چلے جاتے جیسے اس کی نظروں کے سامنے آئے ہی نہیں۔ اس طرح
عطر کی شیشی، پلاسٹک کی چوڑیاں، رومال، بندے پاؤڈر کے ڈبے
بہت سی چیزیں اسے ملیں۔ کپڑوں کی تہوں میں چھپاتے چھپاتے
کبھی بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ ان چیزوں کو استعمال کرے
پھر سوچتی اگر ثریا نے پوچھ لیا تو کیا جواب دے گی۔ آخر دل پر جبر
کر کے وہ انہیں صندوق میں دفن کر دیتی۔ رحمان اس کی نظروں کو
تو ہمیشہ ہی اچھا لگا تھا اب وہ اس کے دل کو بھی اچھا لگنے لگا
تھا۔ اب بھی وہ اسے رحمان بھائی ہی کہتی تھی مگر لہجے میں ذرا
کھنک سی آچلی تھی۔ رحمان کی نظریں ثریا سے چھپ چھپ کر
اسے کس میٹھے انداز میں دیکھتی ہیں یہ غنچہ سے چھپا نہیں تھا مگر
سوال یہ تھا کہ کیا رحمان اکبر کا بدل ہو سکتا ہے؟ جب وہ ٹھنڈے
دل سے اس سوال پہ غور کرتی تو اسے محسوس ہوتا کہ ثریا کی بھائی

بن کر وہ کسی طرح خسارے میں نہیں رہے گی۔ بہن کی طرح ظاہر ہے
بھائی بھی فراخدل ہے، جبھی تو اسے نت نئے تحفے دیا کرتا ہے
اس کا گھر بھی ضرور صاف ستھرا ہو گا مگر حقیقت یہ ہے کہ اکبر
اور رحمان اب اسے اتنے بلند نظر نہیں آتے تھے۔ اب تو اس نے
بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ اسی شہر میں ایسی عورتیں بھی تھیں جو سُرخ
اسکارف باندھ کے دُودھ جیسی سفید اور جہاز ایسی لمبی چوڑی کاریں
چلاتی پھرتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں تو وہ رحمان کی بیوی بن کر
بھی حقیر ہی رہے گی، پھر بھی کچھ تو ہو گا۔ اس کے گاؤں کی لڑکیاں
تو اتنی اڑان کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ایک کچے گھر سے نکلیں تو
دُوسرے کچے گھر میں، ایک اُپلے تھپی دیوار کے سائے سے نکل
کر دُوسری اُپلے تھپی دیوار کے سائے میں۔ میکے کی بھینسوں کو چرانے نکالنے
اور دوہنے کے بجائے سسرال کی بھینسوں کے ناز اُٹھائیں ساتھ
ہی ساس، نندوں اور میاں کے بھی۔ وہاں کون ایسی خوش قسمت
ہو گی جس کا میاں اسے ایسے حسین تحفے لا کر دیتا ہو جیسے رحمان اسے
لا کر دیتا تھا —— دوسری بات یہ بھی تھی کہ "ویج ایڈ" کی
تربیت اسے پسند نہیں تھی وہ تو کوئی صاف ستھری سی جگہ اور
نفیس سا کام چاہتی تھی، جہاں اس کے نازک ہاتھ گندے نہ ہوں،

جہاں اس کے کپڑے خراب نہ ہوں اور جہاں وہ یوں تیزی سے ترقی کرتی جائے جیسے سیڑھیاں چڑھی جاتی ہیں، اُونہہ یہ بھی کوئی جگہ تھی، سب بے کار گاؤں والیوں کے سے کام، اگر یہی سارے کام کرنے ہیں تو پھر انسان اپنے گھر ہی کا کام کرے۔ یہ سب سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ رحمان سے محبّت کر ڈالے تو کوئی ایسا بُرا سودا بھی نہیں۔

(۸)

اب کچھ دن سے ثریا کو جانے کیا ہوتا جا رہا تھا، وہ روز بروز زرد پڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے سانولے چہرے پر یہ پیلا پن اور بھی برا لگتا تھا، بالکل جیسے مینڈک کے جسم سے زردی جھانکتی نظر آتی ہے۔ بیمار تو وہ پہلے ہی سے تھی اب کے جو ڈاکٹری معائنہ ہوا تو اسے خاص طور پر مشکل اور بھاری کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی، دواؤں میں اضافہ ہوا اور غذا میں دودھ اور پھل بطور خاص کھانے کو کہے گئے۔ بیماری کی وجہ سے وہ چڑچڑی تو خیر نہیں البتہ بیزار اور تھکی سی ضرور ہو گئی تھی۔ باقی دن وہ ٹھیک بھی رہتی تو ہفتے کے روز ضرور اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی اور وہ کہیں نہ جا سکتی۔ رحمان آتا تو اس سے دروازے پر تھوڑی دیر کے

لیے مل لینی کیونکہ زیادہ دیر کھڑی نہ ہو سکتی تھی۔ رحمان اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کرتا کہ سیر سے ذرا طبیعت بہل جائے گی مگر ثریا راضی نہ ہوتی اور وہ تھک ہار کر لوٹ جاتا۔ غنچہ کے ساتھ تو رحمان کا رشتہ نہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ جاتی، ہاں دوسری لڑکیوں کے ساتھ جا سکتی تھی۔ ثریا اس سے کہتی بھی کہ وہ ان کے ساتھ ہو آئے مگر وہ اسے دوستی کے منافی سمجھ کر ثریا کے پاس ہی رہتی اس طرح وہ کئی ہفتے باہر نہ جا سکی، بس کبھی کبھی دروازے تک ثریا کے ساتھ آ جاتی اور رحمان کی پھسلتی پھسلتی نگاہوں کو دیکھتی رہتی۔

ایک دن جب رحمان آیا تو ثریا اس وقت غسلخانے میں تھی، غنچہ دروازے پر پہنچ گئی۔ رحمان نے کہا: "ثریا نہیں جاتی تو تم کیوں نہیں نکلتی ہو۔"

"مجھے آپ کے ساتھ کون جانے دے گا" غنچہ نے شرما کر کہا۔

"ارے پگلی دوسری لڑکیوں کے ساتھ نکلا کرو، پھر کوئی بہانہ کر کے مجھے مل جایا کرو، دیکھو اگلے ہفتے ضرور آنا، میں کمال ریسٹوران کے آگے تمہارا انتظار کروں گا۔"

"ہاں جاؤں گی مجھے بھی کچھ چیزیں لانی ہیں" غنچہ نے کہا۔

یاد رکھنا "کمال ریسٹوران" اور دیکھو ثریا کا برقع اوڑھ لینا تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔

ثریا کو آتے دیکھ کر وہ غنچہ سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگا۔ غنچہ نے بتایا کہ ڈاکٹر نے زیادہ آرام کرنے، پھل اور دودھ کھانے کی تاکید کی ہے۔

"ہاں انہیں خوب کھلایا پلایا کرو، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے ثریا" اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ثریا صرف کمزوری سے مسکرائی۔

"یہ لو۔" رحمان نے جیب سے دس روپیہ کا ایک نوٹ نکالا اور ثریا کی طرف بڑھایا۔

"پھل اور دودھ کھانا۔" ثریا نے اسے لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تو رحمان نے نوٹ غنچہ کی طرف بڑھا دیا۔ "لو یہ تم رکھو، انہیں خوب کھلایا پلایا کرو، جب ضرورت ہو اور لے لینا۔" غنچہ نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ لے لیا۔

"میرا خیال ہے ثریا یہ جگہ تمہیں سوٹ نہیں کرتی، تمہیں یہاں سے نکلنا چاہیئے۔" زہر خند سی مسکراہٹ ثریا کے ہونٹوں پہ ابھری، آہستہ سے وہ بولی۔ "میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

"اچھا اب تم آرام کرو کھڑے سے تھک جاؤ گی،" غنچہ انہیں

لے جاؤ، انہیں آرام کروانا اور خوب کھلانا پلانا تمہاری ذمہ داری ہے۔"
رحمان نے کہا اور اس بات پر غنچہ کا دل پھول سا کھل اُٹھا۔ کتنی
انکساری سے کہا تھا اس نے کہ میری بہن کی دیکھ بھال تمہارے
ذمے ہے، آخر کچھ سمجھ کر ہی نا، ورنہ سینکڑوں لڑکیاں بھری پڑی
ہیں کسی اور سے نہ کہہ دی یہ بات۔ رحمان نے آنکھوں ہی آنکھوں
میں اگلے ہفتے کا وعدہ یاد دلایا اور چلا گیا۔ سامنے کا میدان پار کرتے
ہوئے اس نے کئی بار مڑ مڑ کر دیکھا اور ثریا کو سہارا دے کر لیجاتے
ہوئے غنچہ نے بھی بار بار ادھر دیکھا، آخری دفعہ اس نے ہاتھ ہلایا
اور جھاڑیوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔

غنچہ نے ثریا کے لیے الگ دودھ لینا شروع کر دیا اور خانساماں
کے ہاتھ پھل منگوا کر با اصرار اسے کھلانے لگی۔

اگلے ہفتے صبح ہی سے اس کا دل بار بار اچک کر جیسے حلق تک
آجاتا تھا، شام کو وہ کیسے رحمان سے ملنے کی لڑکیوں سے کیا کہہ کر
الگ ہو گی، کہیں کسی نے دیکھ لیا تو شکایت کر دی تو—— اور پھر
وہ ثریا سے کیا کہہ کر جائے گی۔ کوئی بھی کمبخت ایسی چیز نہیں جس کی
اسے بہت زیادہ ضرورت ہو، اس پہ ثریا کی دریا دلی ایک اور
مصیبت ہے، جس چیز کا نام لیا وہ جھٹ کہہ دے گی "میری لے لو۔"

کوئی ایسی چیز جو ضروری بھی ہو اور ثریا کے پاس نہ نکلے سوچتے سوچتے سارا دن نکل گیا ——— آخر اسے ایک بڑی اچھی چیز یاد آگئی۔ ڈاکٹر نے ثریا کے لیے انجیکشن لکھ کر دیے تھے جو یہاں کی ڈسپنسری میں نہیں تھے اور کہا گیا تھا کہ کوئی شہر آتا جاتا ہو گا تو منگوا لیے جائیں گے مگر آج کئی دن گزر جانے کے باوجود نہیں آئے تھے۔ غنچہ نے انہیں کا سہارا لیا۔ ثریا جتنا ان کی ضرورت نہ ہونے پر زور دیتی غنچہ اتنا ہی ان کے فوراً آنے پر اصرار کرتی۔ ساتھ ہی اس نے چھوٹی موٹی اور چیزوں کے دم چھلّے بھی تیار کر لیے تھے۔ آخر ثریا کو ہار ماننی پڑی۔ چلتے وقت اس نے یہ کہہ کر ثریا کا برقع بھی اوڑھ لیا کہ سب برقع والیوں کے ساتھ وہ بے پردہ بودم سی نظر آئے گی۔ بس میں سارے راستے اس کا دل دھڑکا کیا۔

صدر میں ساری لڑکیاں پرے کے پرے باندھے ایک سے دوسری دوکان میں پھرتی رہیں، پھر وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئیں، چند لڑکیاں جوتے کی دوکان پر اٹک گئیں۔ چند چوڑیاں پہننے میں لگ گئیں۔ وہ ایک سیدھی سی لڑکی کے ساتھ تھوڑی دور چلی اور پھر تیز قدم بڑھاتی ہوئی بولی "تم ٹھہرو میں ذرا میڈیکل ہال سے ثریا کی دوا لے آؤں۔" یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ دواؤں کی دوکانیں بالکل

الگ تھیں اور "کمال ریسٹوران" بھی اسی طرف تھا، اس کے علاوہ کسی لڑکی کو بھی میڈیکل ہال جانے میں دلچسپی نہیں تھی۔ اگر غنچہ کہتی تو کوئی نہ کوئی ضرور ساتھ ہو جاتی مگر وہ چاہتی ہی کب تھی۔ یوں وہ ایک گلی میں مڑ کر میڈیکل ہال میں گھس گئی اور جب وہاں سے نکلی تو سامنے کمال ریسٹوران کے آگے رحمان کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ "سوکھ گیا انتظار کرتے کرتے۔" اس نے کہا۔

"کوئی ہمیں باتیں کرتے نہ دیکھ لے۔" غنچہ نے گھبرا کر کہا۔

"آؤ اندر آجاؤ۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔"

رحمان آگے آگے، غنچہ پیچھے پیچھے لمبے برقع سے اُلجھتی سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹے سے پردہ پڑے کیبن میں جا بیٹھے۔ چائے کا آرڈر دے کر رحمان اس سے لگ کر بیٹھ گیا اور ایک سانس میں جانے کیا کیا پیار اور انتظار کی باتیں کر گیا۔ یہ ایک ہفتہ اور اس سے پہلے کئی ہفتے اس نے کتنی مشکل سے گزارے ہیں اور غنچہ کے بغیر اس کی زندگی کیسی تلخ ہوتی جا رہی یہ ایک لمبی داستان تھی جو وہ کہتا ہی چلا گیا۔ غنچہ شرم اور خوشی سے گلابی پڑتی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ کتنی خراب ہے۔ کوئی شخص اس کے لیے اس حد تک پاگل ہو گیا ہے کہ اسے بیمار بہن کی طبیعت پوچھنے تک کا ہوش

نہیں چھ رہا ہے۔ وہ بات ٹالنے کے لیے خود ہی ثریا کی بیماری کا قصہ لے بیٹھی جسے رحمان نے لمحہ بھر میں سنی اَن سُنی کر کے کہا کہ کوئی ترکیب ان کے جلد جلد ملنے کی ہونی چاہیئے یہ ہفتے بھر کی جدائی تو پاگل کر دے گی۔ ابھی کوئی راہ سوچی نہ گئی تھی کہ چائے آگئی۔ غنچہ دیر ہو جانے کے خیال سے جلدی جلدی چائے پینے لگی۔ رحمان کو غنچہ کے ہوتے ہوئے نہ چائے سے دلچسپی تھی نہ اس کے ساتھ کی چیزوں سے۔ وہ اس کی کرسی کے ہتے پر آن بیٹھا تھا اور غنچہ پریشان ہو ہو کر کبھی اپنے ہاتھ کھینچ رہی تھی، کبھی بالوں کو سنوار رہی تھی اور کبھی کپڑوں کو، کبھی ہنستی تھی اور کبھی غصہ ہوتی تھی۔ آخر بڑی خوشامد کے بعد رحمان نے اپنی چائے کی پیالی ہاتھ میں لی۔ چائے کے بعد وہ غنچہ کو روکتا ہی رہا مگر وہ " ہائے اللہ دیر ہو گئی ہیں لڑکیوں کو کیا جواب دوں گی، کہیں میری شکایت ہو گئی تو ——— " کہتی گرتی پڑتی سیڑھیاں اتر گئی۔ رحمان پیچھے لپکا " اگلے ہفتے یہیں " اس نے کہا۔

" ہائے اللہ ہر ہفتے میں کیسے آ سکتی ہوں " کہہ کر وہ رحمان کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہ اس گلی میں پہنچی جہاں سب کو چھوڑ کر گئی تھی، اصل بازار یہی تھا اس لیے ان کے کہیں

اور جانے کی اُمید نہیں تھی مگر اس وقت وہاں ایک بھی لڑکی نہیں تھی۔ غنچہ کی جان نکل گئی۔ کہیں وہ واپس تو نہیں چلی گئیں ؟ اب غنچہ کی شامت آئے گی۔ گھبرا کر وہ گلیوں پر گلیاں پار کرنے لگی، آخر ایک گلی میں اسے برقعوں کا غول مل گیا۔ جو اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

"وہ رہی" غنچہ کو دیکھتے ہی کئی لڑکیاں چلائیں۔

"ہائے اللہ تو کہاں رہ گئی تھی غنچہ ؟" بڑی عمر کی ایک عورت جو ان سب کی نگران تھی۔ پکاری۔

"وہ میں دوا... میں تو خود سب کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔" غنچہ نے ہکلا کر کہا، جھنجلاہٹ انھیں اس بات کی تھی کہ اتنی دیر میں ان دونوں نے مل کر ایک بہانہ بھی تو نہ ڈھونڈا تھا۔

"یہ زینب کی بچی ہے اس سے کہا تھا کہ غنچہ کو آنے دو مگر سب کو چاٹ کے لیے گھسیٹ کر لے گئی" اتنی آسانی سے بچ نکلنے کی تو غنچہ کو اُمید بھی نہیں تھی اس کی غلطی زینب کے سر تھوپ دی گئی۔ اس کے سُرخ گالوں، بکھرے بالوں اور پسینے سے تر پیشانی کو دھوڑ دھوپ کا نتیجہ سمجھ لیا گیا۔ غنچہ نے دو ایک چیزیں خریدیں اور ایک نہایت سڑیل اُردو پکچر دیکھنے کے بعد وہ ہاسٹل لوٹ آئیں۔

غنچہ نے ایک ترکیب یہ کی تھی کہ رحمان کی دی ہوئی کچھ چیزیں چپکے سے ٹوکری میں ڈال کر لے گئی تھی۔ واپسی میں خریدکردہ سامان دکھاتے ہوئے اس نے یہ چیزیں بھی ثریا کو دکھا دیں انجکشن دیے اور بڑی ہی پیار بھری معصومیت سے پوچھا "رحمان بھائی آئے تھے؟"

ثریا کے چہرے پر رنگ دوڑا، نظریں جھکیں اور آہستہ سے اس نے کہا "ہاں آئے تھے"

"کیا کہتے تھے؟"

"کہنا کیا تھا، یہی کہ باقاعدہ علاج کرو اور خوب کھاؤ پیو — ذرا دیر ہی ٹھہرے تھے"

اپنے اس معصوم سوال اور ثریا کے اس مصلحت آمیز جواب پر غنچہ منہ پھیر کر مسکرا دی۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی تیز طرّار ہو سکتی ہے اور ایسی باتیں کر سکتی ہے۔ ثریا کے حوصلے پر بھی وہ حیران تھی، بھائی کا مان رکھنے کے لیے وہ گلے شکوے کرنے کے بجائے کیسا جھوٹ بول گئی تھی، شاید اس لیے کہ سچ بولنے میں اپنی ہتک کا پہلو بھی تو ہوتا کہ بیمار ہوتے ہوئے بھائی اسے دیکھنے نہیں آیا، انسانی نفسیات کتنی پیچیدہ ہے، کون کسی چیز

کی صحیح وجہ بتا سکتا ہے؟ اب ہر ہفتے غنچہ اسی معصومیت سے یہ سوال پوچھتی رہی اور ثریّا اسے ڈھٹائی سے یہی جواب دہراتی رہی جب کہ ہر ہفتے "کمال ریسٹوران" کے پردہ پڑے کیبن میں وہ رحمان کی گود میں بیٹھی چائے پیتی تھی، اس سے فرمائشیں کرتی تھی اور ہر دفعہ لڑکیوں کی ڈار سے بچھڑ کر دوبارہ مل جانے کے دلچسپ واقعات سناتی جاتی تھی۔ اب اس نے اس بازار میں اپنی ایک پھوپی تلاش کرلی تھیں چند منٹ کے لیے جاکر ان سے ملنا ضروری تھا ورنہ وہ اسے بڑی صلواتیں سناتیں۔

ایک دن غنچہ رحمان سے سچ مچ اس بات پر روٹھ گئی کہ وہ اتنے دن سے ثریّا سے ملنے کیوں نہیں گیا۔ "مجھے تم پہ بھروسہ نہیں ہوگا جی" اس نے روٹھ کر کہا تھا۔ "جو شخص اپنی بہن کا نہیں ہوسکتا وہ میرا کیا ہوگا، اور بہن بھی ایسی کہ جو تمہاری خاطر برابر جھوٹ بولی رہی ہو۔ ایسی بہن سے بے اعتنائی کوئی کٹّر دل ہی کرسکتا ہے۔"

"کٹّر دل یا کوئی ایسا عاشق جسے کسی کے حسن نے دیوانہ بنا کر کسی قابل چھوڑا ہی نہ ہو۔" پھر اس نے غنچہ کو پیار کرکے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی وقت ثریّا کی خیریت پوچھنے ضرور ضرور آئے گا۔

غنچہ کے یہ بہلاوے زیادہ دن نہ چل سکے، پھوپی کے ہاں جانے

کو دوسری لڑکیاں اصرار کرنے لگیں، کیا ہرج ہے اگر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر اور کچھ دیر بیٹھ کر وہ بھی تازہ دم ہو جائیں۔ جلد ہی غنچہ کو فرضی پھوپا کا تبادلہ بذریعہ تار کسی اور جگہ کروانا پڑا۔ بازار کی گلیوں کے راستے بھی خوب رٹ گئے تھے انہیں بھی بار بار نہیں بھول سکتی تھی اور ہر دفعہ جب وہ کوئی دور کی دکان سوچ کر چیز لانے لپکتی تو کوئی نہ کوئی لڑکی جھٹ اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو جاتی اور جلد ہی وہ چیز اسے برابر کی دکان میں نظر آجاتی اور اب اکثر یوں ہونے لگا کہ وہ "کمال ریسٹوران" کے آگے کھڑے رحمان کو ہاتھ ہلاتی یا سب سے چھپا کر کوئی پرچہ پھینکتی گزر جاتی کہ اب اس کے لیے اس طرح نکلنا بڑا مشکل ہو رہا ہے۔

آخر رحمان نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اتوار کے دن صبح کو وہ ثریا سے ملنے آیا۔ ثریا پہلے سے بھی زرد اور کمزور ہو گئی تھی رحمان کو اجازت دے دی گئی کہ وہ کمرے ہی پر اس سے مل لے۔ ساری لڑکیاں باہر چلی گئیں مگر غنچہ وہیں بیٹھی رہی۔ رحمان نے آتے ہی ثریا کی طبیعت پوچھی۔ اس کی ہلکی سی دائمی مسکراہٹ کے ساتھ ثریا نے کہا: "اچھی ہوں، کچھ بھی نہیں ہے مجھے"۔ "نہیں تم بہت کمزور ہو گئی ہو، میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایبٹ آباد میں کوئی مکان لے لوں

اور چند دن تمہیں وہاں رکھوں، پہاڑ کی آب و ہوا تمہارے لیے اچھی ہو گی۔"

"ہونہہ" ثریا دھیرے سے مسکرائی جیسے وہ اس بات کو سرے سے احمقانہ سمجھ رہی ہو لیکن ایبٹ آباد کا نام سُن کر غنچہ کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ "کیسی اچھی جگہ ہے سچ مچ"۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔" بظاہر رحمان کو نظر انداز کر کے اس نے ثریا سے کہا۔

"اگر گئی تو۔" ثریا نے مختصراً کہا۔ اب اس کے ہونٹوں سے ہنسی رخصت ہو گئی تھی اور چہرے پر ایک کرب سا تھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں کوئی ساتھ ہو گا تو انہیں زیادہ آرام ملے گا۔"

چلتے وقت رحمان نے غنچہ سے کہا "ذرا مجھے اپنی پرنسپل کا دفتر تو بتا دو مجھے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"آج وہ دفتر میں نہیں ہوں گی ان کا مکان وہ ——— اُس طرف ہے۔"

"کس طرف بھئی ذرا باہر نکل کر بتا دو نا۔"

غنچہ نے برا سا منہ بنایا اور بادلِ نخواستہ چپل گھسیٹتی باہر آئی۔ بڑے گیٹ پر وہ اتنی دیر کھڑے باتیں کرتے رہے کہ لڑکیاں

ان کی طرف دیکھ دیکھ کر اشارے کرنے لگیں۔ آخر رحمان نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

"پرنسپل سے نہیں ملیں گے؟" غنچہ نے پوچھا۔

"ارے نہیں مجھے اس سے کیا کام ہے" بس تو تمہیں وہاں سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

"ایبٹ آباد جانے کے لیے پوچھ لینے ثریا کے۔"

"ہاں، وہ دیکھا جائے گا جب انتظام ہو جائے گا۔ فی الحال تو مجھے دوسری بات کا انتظار ہے۔"

غنچہ سرخ ہو گئی اور اٹھلا کر جلدی سے لوٹ پڑی رحمان باہر نکل گیا۔ ثریا کے پاس جانے کے بجائے غنچہ باورچی خانے میں چلی گئی مبادا ثریا اس کی اداؤں میں اپنے بھائی کو بہکانے کا کوئی عکس دیکھ پائے۔

---

(۹)

دوسرا دن ماجد کے لیے اور بھی سوگوار تھا۔ اس نے سُنا اسپتال سے کچھ لوگ چھمب اور جوڑیاں کا محاذ دیکھنے جا رہے ہیں۔ بریگیڈیر کے ساتھ گل بھی جا رہی ہے اور پتہ نہیں کن ترکیبوں سے لیفٹیننٹ نجیب نے بھی ساتھ جانے کی اجازت لے لی ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے دشمن سے چھینا تھا۔ پہاڑوں کے سائے میں میلوں میل پھیلا ہوا زرخیز اور خوبصورت علاقہ اب لوگ اس کو بغیر ساتھ لیے دیکھنے جا رہے تھے۔ اگر جا سکتا تو اپنی فتح کے حالات سناتے اور اصلی جگہیں دکھلاتے ہوئے وہ کتنا فخر محسوس کرتا مگر اب تو ہر جگہ پانسا اُلٹا پڑ رہا تھا کروٹیں بدلتا وہ گھڑی دیکھ دیکھ کر حساب لگاتا رہا کہ اب وہ گجرات

سے گزر رہے ہوں گے۔ اب وہ سرحد کے آخری گاؤں میں پہنچے ہوں گے جہاں انہوں نے کاریں چھوڑ دی ہوں گی اور جیپوں میں بیٹھ گئے ہوں گے۔ ماجد کو یقین تھا کہ نجیب کسی نہ کسی طرح گل کے ساتھ جیپ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔ اب دونوں طرف میلوں پھیلے ہوئے میدان کے بیچ میں وہ فوج کی بنائی ہوئی کچی مگر چوڑی اور صاف ستھری سڑک پر دندناتے چلے جا رہے ہوں گے۔ موڑوں پر گل کا سُلگتا جسم نجیب کے جسم سے مَس ہو جاتا ہو گا۔ کھلی جیپ کی ٹھنڈی ہوائیں گل کے بال اُڑا رہے ہوں گے اور انہیں بار بار چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے وہ ضرور ہنس رہی ہو گی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سوچا۔ اب وہ منور گاؤں پہنچ گئے ہوں گے۔ وہاں کے مسمار مکانات دیکھنے وہ سب ضرور اُترے ہوں گے یا وہ تاریخی مسجد دیکھنے جو ایک اونچے ٹیلے پر بنی ہوئی ہے۔ اونچی جیپ میں سے کودتے ہوئے گل ہچکچائی ہو گی تو نجیب نے اس کا نرم ہاتھ تھام کر اسے اتارا ہو گا۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ منہدم مکانوں کی دیواروں پر بنی ہوئی جالیوں کی تصویروں اور اونچی دیواروں پر کیے گئے فیروزی رنگ کے بارے

میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ جب کسی مکان کو اندر سے دیکھنے کے لیے
گل ملبے پر چڑھ کر جھانکنے کی کوشش کرتی ہو گی تو نجیب یہ کہہ کر اس کا
ہاتھ پکڑ لیتا ہو گا کہ چھت کا باقی کمزور حصّہ جو گرنے سے رہ گیا ہے
کہیں اس پر نہ آ پڑے۔ گل اپنے بارے میں اس کی یہ تشویش دیکھ کر
ضرور خوش ہو رہی ہو گی۔ وہ اگر ساتھ ہوتا تو اس گاؤں میں اپنی آمد
کی ایک ایک بات انہیں سناتا۔ شاید اب بھی کوئی ہو جو ان کو یہ
سارے قصّے سُنا رہا ہو —— اور اب جیپوں میں بھر کر وہ
آگے روانہ ہوئے ہوں گے۔ دھول سے بچنے کے بہانے نجیب
سب جیپوں سے خوب پیچھے رہ گیا ہو گا۔ اس نے ڈرائیور کو
جیپ آہستہ چلانے کی تلقین کر دی ہو گی اور چپکے سے گل کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو گا۔ سبر کے موقعوں پر لڑکیاں ایسی باتوں
کی زیادہ پرواہ نہیں کرتیں —— اب شاید وہ گاؤں چک
پنڈت پہنچ گئے ہوں گے جہاں کے مندر پر میرے جوانوں نے
اپنے ہاتھ سے سفیدی کی تھی اور کئی رنگوں میں لکھے ہوئے "اوم"
کو دوبارہ اسی طرح لکھ دیا تھا۔ یہاں سب اُترے ہوں گے۔ اندر
جا کر مندر کی دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصویریں دیکھی ہوں گی
تصویریں لی گئی ہوں گی اور کئی کئی گز اُونچے ناگ پھنوں پر تبصرہ ہوا

ہو گا۔ یہاں سے وہ چھمب پہنچے ہوں گے، شاید وہاں آرام کیا ہو
یا شاید دریا کے سوکھے پاٹ میں سے گزرتے ہوئے" دیوا" چلے
گئے ہوں گے۔ گول گول بڑے بڑے پتھروں پہ جیپ خوب
اچھل رہی ہو گی۔ دائیں ہاتھ پہاڑوں کا سلسلہ اور بائیں ہاتھ میدان
پھیلا ہو گا جہاں کہیں کہیں آم کے جھنڈ دور سے نظر آ رہے ہوں
گے ——— اب شاید
وہ دیوا پہنچ گئے ہوں، علیحدہ کو بنی ہوئی دشمن کی وہ چھاؤنی جس کا ہم
نے قلع قمع کر دیا تھا۔ جہاں ان کے جلے ہوئے ٹینکوں کے بے شمار
ٹکڑے اب بھی پڑے ہیں۔ کوئی انہیں ان پچاس قیدیوں کا قصہ
سنا رہا ہو گا جن کو ایک افسر نے گرفتار کیا تھا۔ جے سی۔او کو ان کے
ساتھ پیدل مارچ کر کے چھمب پہنچنے کا حکم دے کر وہ ہیلی کوپٹر
میں واپس چلا آیا تھا۔ چل چل کے یہ لوگ اتنا تھک گئے تھے کہ
رات ہو جانے پہ پتھروں پر لیٹ کر سب ایسے بے بدھ سوئے
تھے کہ نہ قیدیوں کو بھاگنے کا ہوش رہا تھا نہ پہرے داروں کو پہرے
کا۔ یہاں کے جلے ہوئے ملبے میں سے ضرور ہر ایک نے ایک ایک
نشانی اٹھائی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کسی نے بے شمار بے جلے مارٹر میں
سے کوئی اٹھا لیا ہو شاید گل ہی نے ——— اس پہ نجیب نے

پریشان ہو کر فوراً مارٹر اس کے ہاتھ سے لے لیا گیا اور آہستہ سے کہیں ایک طرف رکھ دیا ہو گا اور پھر دونوں خوب ہنسے ہوں گے۔ یہاں سے وہ ضرور جمپ آئے ہوں گے۔ کیمپ کے میس میں ان کا کھانا تیار ہو گا۔ دشمن سے چھینے ان لگے لگائے خیموں کو وہ حیرت سے دیکھ رہے ہوں گے۔ دشمن کی کرسیوں اور اسٹولوں پہ بیٹھ کر ہی انہوں نے میس کا کھانا کھایا ہو گا۔ پھر چند قدم کے فاصلے پر پھیلے ہوئے آم کے ایک بہت بڑے جھنڈ میں بھی ضرور گئے ہوں گے۔ وہاں ایک وقت ہم نے کیمپ لگایا تھا۔ بھلا گل کو کون بتلائے گا کہ پکی زمین میں یہ جو گڑھا سا ہے یہ کوئی سوکھا تالاب نہیں ہے بلکہ کیپٹن ماجد کے کیمپ کا نشان ہے۔ آموں کی ٹھنڈی چھاؤں میں گھومنے پھرنے کے بعد وہ ضرور جوڑیاں دیکھنے جائیں گے جہاں کی مٹی میں میری ٹانگ کا خون شاید ابھی تک ملا ہوا ہو۔ دریائے توی کو بغیر پل کے جیپ پانی میں سے گزار کر پار کرنے کے خیال سے عورتوں کے دل ضرور کانپے ہوں گے اور جوں جوں جیپ آگے بڑھ رہی ہو گی اور پانی گہرا ہوتا جا رہا ہو گا ان کا منہ فق ہوتا جا رہا ہو گا۔ جب جیپ کی بتیاں بھی پانی میں ڈوب گئی ہوں گی اور پانی ان کے بالکل نزدیک تک آ پہنچا ہو گا تو کئی عورتیں

چیخ اُٹھی ہوں گی۔ نجیب گل کو حوصلہ دے رہا ہو گا۔ وہ اس کے بالکل نزدیک کھسک آئی ہو گی شاید اس نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر گل کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دے رکھا ہو۔ جیپیں شدشر کرتی پانی میں سے نکل گئیں ہوں گی تو ان عورتوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا اور قہقہے لگائے ہوں گے ——— جوڑیاں کے اُونچے نیچے راستے پر جیپیں آگے پیچھے دوڑ رہی ہوں گی۔ راستے میں وہ کھیت بھی آیا ہو گا جہاں کچھ دیر آرڈر لینے کے بعد ہم طوفان کی طرح آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔ وہ پہاڑی بھی آئی ہو گی جہاں دشمن کا ایک ہوائی جہاز گرا تھا اور سڑک کے کنارے وہ ٹینک بھی انہوں نے دیکھا ہو گا جو اپنے کرنل سمیت جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ راستے میں کسی نے پہاڑیوں میں بنائے ہوئے پکے مورچے بھی انہیں دکھائے ہوں گے مگر بیریوں کے اس جھنڈ کی طرف شاید گل نے دیکھا بھی نہیں ہو جہاں کچھ دیر ہم نے آرام کیا تھا۔ اگر میں ہوتا تو سب کو کچھ دیر وہاں ضرور ٹھہراتا وہاں کے لمبے میٹھے بیر کھا کر عورتیں ضرور خوش ہوتیں۔ ایسی چیزیں انہیں بڑی پسند ہوتی ہیں خصوصاً جب براہِ راست درخت سے توڑ کر ان کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ جوڑیاں کی مسجد بھی انہوں نے ضرور دیکھی ہو گی جو

ہوائی حملے میں مسمار ہو گئی تھی مگر جسے ہماری فوج کے انجینئرز نے
دوبارہ تعمیر کر دیا تھا ——— شاید وہاں کے کیمپ میں انہیں
چائے پلائی گئی ہو گی اور پھر رات ہو جانے کے خیال سے وہ
سب جلدی جلدی لوٹے ہوں گے۔ اب ہوا میں خنکی بڑھ گئی
ہو گی۔ گل کو ضرور سردی لگ رہی ہو گی۔ اگر وہ جانے سے پہلے
میرے پاس آتی تو میں اسے گرم کوٹ لے جانے کا مشورہ دیتا۔
اب ہو سکتا ہے نجیب نے اپنا کوٹ جسے وہ برساتی کے طور پر
بھی استعمال کرتا ہے اس کے اوپر ڈال دیا ہو۔ سیٹ کے اوپر
بچھا ہوا فوجی کمبل بھی ضرور گل کو تکلیف دے رہا ہو گا اور وہ
بے چینی سے سرحد کے گاؤں پہنچ کر کار میں بیٹھنے کی منتظر ہو گی۔
اپنے علاقے میں آنے کے بعد انہوں نے بہادر فوجیوں کے
قبرستان میں جا کر ان کی قبروں پہ فاتحہ بھی ضرور پڑھی ہو گی ——
اور اب وہ ضرور واپس لوٹ رہے ہوں گے ——— ماجد کے
اندازے کے دس منٹ کے اندر اندر نجیب اپنے کمرے میں
داخل ہوا۔ وہ تھکا ہوا ضرور تھا مگر خوش نظر آ رہا تھا۔ ماجد نے
سیر کے بارے میں بڑی تفصیل سے سوال کیے۔ واقعی انہوں نے
وہ ساری جگہیں دیکھی تھیں۔ ماجد کے تصور نے بہت کم ٹھوکر

کھائی تھی، صرف جزویات ہیں کہیں کہیں مگر اس کا ایک خیال قطعی طور پر غلط تھا اور وہ تھا گل کا نجیب کے ساتھ بیٹھنا۔ وہ کار میں بھی اور جیپ میں بھی اپنے مریض کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی گئی تھی اور اسی کے ساتھ واپس آئی تھی۔ یہ سُن کر ماجد کو ایسا اطمینان ہوا جیسے کوئی بھاری بوجھ سینے پر سے سرک گیا ہو۔ آج اسی گڑبڑ میں وہ ماں کو خط نہیں لکھ سکا تھا ——— خیر کل وہ یہ کام ضرور کر ڈالے گا ——— اس نے از سرِ نو فیصلہ کیا۔

مگر دوسرے دن جب وہ سسٹر لوپ سے لفافہ لے کر ماں کو خط لکھنے بیٹھا تو نیچے سے اس قدر بے تحاشا باتوں اور قہقہوں کی آواز آ رہی تھی کہ الفاظ اس کے ذہن سے نکل نکل جاتے تھے اسپتال میں ایسی بے قاعدگی اور اودھم بازی تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ پوچھنے پر میڈیکل آرڈلی نے بتایا کہ نیچے ٹی پارٹی ہو رہی ہے اور یہ کہ ٹی پارٹی بریگیڈیر صاحب کی طرف سے ہے۔ چائے آئی تو ڈھکی ہوئی پلیٹ میں بہت سی مٹھائی تھی۔

"یہ مٹھائی کیسی ہے؟" اس نے چائے لانے والے "جی ڈی" سے پوچھا۔

"سسٹر گل کی منگنی کی، سب کو بھجوائی ہے اُنہوں نے۔"

بستر پر لیٹے ہوئے لیفٹننٹ نجیب نے یکایک پلٹ کر دیکھا۔
"کس کے ساتھ ہوئی ان کی منگنی؟" بڑی کمزور سی آواز میں اس نے
پوچھا۔

"انہیں بریگیڈیر صاحب کے ساتھ؟" اس نے مسکراتے ہوئے
بتایا۔ "ویسے تو بہت اچھا صاب ہے، دل کا بھی بہت اچھا ہے
مگر ـــــــ مسٹر گل کا جوڑ نہیں، ان کے باپ کے برابر ہے"
اور پھر نیپکن کاندھے پر ڈال وہ دوسرے کمروں میں چائے دینے چلا
گیا جب وہ برتن لینے آیا تو لیفٹننٹ نجیب کمرے میں نہیں تھا مگر
اس کی چائے جوں کی توں پڑی تھی۔ ماجد کی چائے بھی اسی طرح پڑی
تھی۔ بسکٹ بھی یوں ہی رکھے تھے اور مٹھائی کی پلیٹ بھی جوں کی توں
ڈھکی رکھی تھی۔

"برتن اٹھا لوں صاب؟" اس نے پوچھا۔

" ہاں اور دیکھو یہ ڈھکی ہوئی پلیٹ مسٹر گل کے کمرے پر
دے آنا، سمجھ گئے؟"

کچھ دیر وہ بے وقوفی سے کھڑا رہا پھر برتن اٹھا کر باہر نکل گیا
باورچی خانے میں جا کر اس نے مٹھائی والی پلیٹ کھول کر دیکھی اس میں
مٹھائی نہیں تھی۔ کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا وہ یہ

پلیٹ حسب ہدایت سسٹر گل کے کمرے پر چھوڑ آیا۔

رات کو جب سسٹر گل اپنے کمرے میں آئی تو اس نے ڈھکی ہوئی پلیٹ کو اُٹھا کر اس پیکٹ کو نکالا اور اسے تجسس کے ساتھ کھولا۔ اس میں تاش کے پتے تھے۔ صرف پان کے پتے۔ سرخ خونچکاں دل والے ہر پتے پر ایک ایسا شعر درج تھا جس میں اس کا نام آتا تھا ایک ایک کر کے اس نے سارے شعر پڑھے، تیرہ درد بھرے شعر، وہ مسکرائی دراصل وہ ہنسنا چاہتی تھی، خوب ہنسنا چاہتی تھی۔

مگر مشکل سے وہ مسکرا سکی اور یہ مسکراہٹ بھی خالص نہیں تھی۔ اس نے وہ تاش کے پتے اُٹھا کر اپنی الماری میں کپڑوں کے بیچ میں بکھیر دیے جیسے خوشبو کی خاطر چنبیلی کے پھول ڈال رہی ہو۔ یہ سچ مچ ایک دکھی دل کا تحفہ تھا۔ سفید کپڑوں میں یہ سُرخ سُرخ دل خون کے دھبّے سے بن کر چمکنے لگے۔

(۱۰)

تیسرے دن پرنسپل کے نام ایک تار آیا کہ غنچہ کا ماموں جاں بلب ہے اس لیے اسے فوراً بھیجا جائے۔ غنچہ کو اطلاع دی گئی۔ وہ گھبرا گئی اور جلد جلد سامان رکھنے لگی، سامان ہی کیا لینا تھا، صرف کپڑے لتے لیے اور جانے کو تیار ہو گئی۔ ثریّا نے اسے تسلّی دی۔ ماموں کی خیریت کا خط لکھنے کی تاکید کی اور غنچہ کے منع کرنے کے باوجود دروازے تک اسے چھوڑنے آئی۔ اکیڈمی کا چوکیدار اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ ثریّا غنچہ کو رخصت کر کے دروازے سے لوٹ رہی تھی کہ راستے ہی میں ڈھیر ہو کر گر پڑی۔ کئی لڑکیوں نے بمشکل اسے اٹھا کر کمرے میں پلنگ پر ڈالا اور ہاسٹل کی وارڈن کو اطلاع دی۔ پھر ڈاکٹر اپنا سفید ڈھیلا ڈھالا چغہ ہلاتے آئے۔

معائنہ کیا، انجکشن لگایا، دوائیں لکھیں اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ ثریا کو چھٹی دے دی گئی اور کہہ دیا گیا کہ وہ گھر جانا چاہے تو اجازت ہے مگر اس نے یہیں رہنے کو ترجیح دی۔ سارا دن اکیلے کمرے میں اپنے صاف ستھرے بستر پر پڑی وہ چھت کی کڑیاں گنا کرتی، یا کوئی رسالہ الٹتی پلٹتی رہتی۔ میز پر اس کے نزدیک ہی دوائیں اور جگ میں پانی پڑا رہتا۔ کھانے کے وقت کوئی لڑکی اسے کھانا دے جاتی۔ اسے اکیلے پڑے پڑے اکثر غنچہ کا خیال آتا، غنچہ جو واقعی ایک ادھ کھلا پھول تھی۔ اگر اسے مناسب اور خوشگوار آب و ہوا ملتی تو اس کا رنگ روپ اور خوشبو واقعی دیکھنے اور سونگھنے کی چیز ہوتی۔ گاؤں کی لڑکی مگر کیسی جلدی ہر ایک بات سیکھ لیتی تھی۔ اس میں اور یہاں کی دوسری لڑکیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کلاس کے وقت وہ بمشکل صاف ستھری نظر آتیں اور باقی وقت انمل بے جوڑ کپڑے پہنے، بالوں کی لٹیں بکھرائے، میلے ٹوٹے چپل گھسیٹتے پھرتیں اور غنچہ! جیسے کسی فرسٹ کلاس کالج کی کوئی فیشن ایبل لڑکی راہ بھول کر یہاں نکل آئی ہو۔ جو کچھ اس نے ثریا سے سیکھا تھا اس میں بھی وہ کہیں آگے نکل گئی تھی۔ قمیص کی تراش، دوپٹے کی چنٹ اور شلوار کے

سرخ ڈوپٹے والے ڈیزائن بنانے میں کوئی لڑکی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، پھر کمبخت کی شکل ایسی تھی کہ جو پہن لے سج جائے، جسم ایسا تھا کہ جو چڑھا لے اُلٹی اس کی قیمت بڑھ جائے۔ رنگ تھا کہ دن بدن نکھرتا چلا آرہا تھا۔ آئی تو اچھی خاصی سانولی تھی اور اب خوب گوری نکل آئی تھی۔ ہاسٹل کی اُبلی دال اور نیلا شوربہ بھی اسے انڈا دودھ بن کر لگ رہا تھا اور خود وہ تھی کہ پھل اور دودھ کھانے کے باوجود سوکھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اب آخر وہ اس ڈھانچے کو کب تک گھسیٹے جائے، ثریا نے بیزاری سے سوچا۔

خط تو نہیں آیا مگر چھٹے دن خود غنچہ لوٹ آئی۔ اس کا ماموں بالکل تندرست ہو گیا تھا، صرف کمزوری باقی تھی۔ گاؤں کی آب و ہوا نے غنچہ پہ بے حد خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اس کے گالوں پر گلاب کھل اُٹھے تھے۔ ہونٹوں میں رس سا بھر گیا تھا۔ آنکھیں وہ رہ رہ کر یوں جگر جگر کرتی تھیں جیسے نارکول کی نئی سڑک جون کی دھوپ میں دور سے چمکتی ہے۔ غنچہ نے بتایا کہ اس دفعہ ممانی کا رویہ بڑا اچھا تھا اس کی خوب خاطر کی اور ماموں کے تندرست ہو جانے کی خوشی میں اسے ایک جوڑا بھی دیا جو اسی دن اس نے پہن ڈالا۔ جوڑا گلابی کریپ کا تھا جس پر گوٹے کے بنے ہوئے پھول ٹنکے ہوئے تھے۔ دوپٹے پر کرن لگی

ہوئی تھی۔ غنچہ گاؤں سے ثریّا کے لیے بہت سے پھل لے کر آئی تھی۔
جب پھلوں سے بھری ٹوکری اس نے ثریّا کی طرف بڑھائی تو اس کی
آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

"بھئی غنچہ اتنے پھلوں کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیوں نہیں تھی، اور تو اس گاؤں میں ملتا ہی کیا ہے ورنہ میں کوئی
اور اچھی سی چیز لاتی۔"

"ارے اس خاک کے ڈھیر کے لیے اب تم کیا لاؤ گی، آج پھل
لائی ہو کل پھول بھی لے آنا۔"

"ہائے ایسی بات!" غنچہ سسک کر ثریا سے لپٹ گئی۔ ثریّا اس کے
کندھے پر سر رکھ کر خود بھی رونے لگی۔ غنچہ کے بدن اور کپڑوں سے
بڑی بھینی بھینی، پیاری پیاری مہک اُٹھ رہی تھی۔ اس کا بھرپور سینہ
شدّتِ جذبات سے اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

"ثریّا، آپ گھر چلی جائیے، تھوڑے دن کے لیے، مجھے بتائیے نا
کہاں ہے آپ کا گھر؟"

غنچہ نے سوچا آج اس رقیق لمحے میں وہ ثریّا سے وہ داستان سُن
ہی ڈالے گی جو وہ اور رحمان دونوں بناتے ہوئے کتراتے ہیں۔ ثریا اس
سے الگ ہو کر بولی۔

"مجھے یہاں سے کیوں بھیجنا چاہتی ہو، کیا تمہیں میرا بہت کام کرنا پڑتا ہے؟"

"یہ بات نہیں، آخر گھر گھر ہی ہوتا ہے۔ وہاں آپ کو آرام ملے گا۔ میں رحمان ——— بھائی سے کہوں گی کہ وہ کچھ دن کے لیے آپ کو گھر چھوڑ آئیں۔"

"نہیں نہیں ان سے ایسی کوئی بات نہ کہنا میں بالکل ٹھیک ہوں میں اپنی پڑھائی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ دو ایک دن میں پھر کلاس میں جانا شروع کر دوں گی۔"

"بڑی اچھی پڑھائی ہے یہاں کی، اونہہ، سارا گندہ کام۔" غنچہ نے اپنے خاص انداز سے منہ بنایا۔ "مجھے نہیں اچھا لگتا ———"

"پھر تمہیں کیا اچھا لگتا ہے؟" ثریا نے پوچھا۔

"کالج کی پڑھائی، ابھی میں آ رہی تھی تو کالج کی لڑکیاں جا رہی تھیں، صاف ستھرے کپڑے، دو ایک کتابیں، بس پڑھا اور گھر آ گئے یہ بکواس تو نہیں ہوتی جو یہاں ہوتی ہے۔"

"مگر انہیں پیسے بھی تو نہیں ملتے، اُلٹے وہ پیسے دیتی ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر مجھے یہ کام پسند نہیں، میں عورتوں کے ادارے میں جانے کا سوچ رہی ہوں۔"

"وہاں کیا کروگی ؟"

"مجھے ماموں نے بتایا ہے کہ ادارے والوں کو اپنی دوکان کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہے جو حساب کتاب رکھ سکے اور چیزیں بیچ سکے، تنخواہ بھی ملے گی اور بعض چیزوں پر کمیشن بھی ملے گا۔"

"مگر وہ بالکل دوسری چیز ہے، یہاں ٹریننگ کے بعد ہمیں سرکاری نوکری ملے گی، ترقی ہوتی جائے گی وہاں وہ جب چاہیں نکال کے کسی اور کو رکھ لیں۔"

"رکھ لیں مجھے اور کوئی جگہ مل جائے گی۔"

"بھئی میرے خیال سے تو وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے، وہ بھی عورتوں کا ادارہ ہے، دوکان بھی صرف عورتوں کے لیے ہے۔ وہاں مجھے زیادہ پیسے ملیں گے میں جمع کروں گی۔"

"پھر کیا کروگی۔"

"اگر ہو سکا تو کالج میں داخلہ لوں گی میرا بڑا دل چاہتا ہے کالج میں پڑھنے کو۔"

"تو کام چھوڑ دو گی ؟"

"ارے ابھی سے کیا کہہ سکتی ہوں پہلے وہاں جاکر دیکھوں گی

مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جگہ یہاں سے لاکھ درجے اچھی ہوگی، میں تو کہتی ہوں ثریا آپ بھی وہاں چلیں، وہاں سلائی اور کٹائی کے لیے ایک استانی کی بھی ضرورت ہے اور آپ اتنی اچھی سلائی کٹائی کرتی ہیں۔"

"نہیں بھائی میں تو کہیں نہیں جاؤں گی، میں ہمیشہ بیمار رہتی ہوں وہ دوسرے دن نکال باہر کریں گے، اتنی دیکھ بھال جو یہاں ہوتی ہے کون کرے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے" غنچہ نے سوچ کر کہا۔ "مگر میں تو ضرور کوشش کروں گی، کل انٹرویو ہے۔"

"کون انٹرویو لے گا؟"

"عورتوں کی انجمن کی صدر اور سیکرٹری ہوں گی، شاید دو ایک اور بھی ہوں۔"

"مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی، تمہیں رنج نہیں ہوگا غنچہ؟" ثریا نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ہوگا، جبھی تو کہہ رہی ہوں آپ بھی وہیں چلیں، ویسے بھی میں آتی تو رہوں گی اور جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی تو آپ ہر ہفتے آیا ہی کریں گی وہیں بیچ بازار میں تو ہے ادارہ۔"

"ہاں"

"پھر ہم پہلے کی طرح ساتھ ساتھ شاپنگ کریں گی اور پکچر دیکھیں گی"۔

"تم رہو گی کہاں ؟" ثریا نے پوچھا۔

"وہیں ادارے کی عمارت میں کمرے دیتے ہیں۔ مکان، پانی، بجلی سب مفت، کام کرنے لیے ایک مائی بھی ہوتی ہے۔"

"پھر تو تم مزے میں رہو گی"۔

"اور کیا، دعا کیجئے مجھے یہ جگہ مل جائے"۔

"مل جائے گی انشاء اللہ،" تم بھی میرے لیے دُعا کرنا"۔

"میں تو ہر وقت دعا مانگتی ہوں کہ اللہ میاں آپ کو جلدی سے اچھا کر دیں"۔

"نہیں بھئی اب میرا جینے کو دل نہیں چاہتا تم دعا کیا کرو کہ اب وہ مجھے جلدی سے ٹھکانے لگا دے"۔

"ہائے اللہ، بھئی ایسی باتیں نہ کیا کیجئے آپ یہ بتائیے اتنے دن میں رحمان بھائی آئے تھے ؟"

وہی پلکوں کی جھپک"۔ ہاں آئے تھے"

"کیا کہتے تھے ؟"

"کہتے تھے ایبٹ آباد چلی جاؤ"۔

"پھر آپ نے کیا کہا ؟"

"میں نے کہا مجھے یہ جگہ اچھی لگتی ہے میں یہیں مروں گی۔"

"پھر وہی بات۔"

"ہاں، سچ کہہ رہی ہوں میں یہیں مروں گی، تم میری ساری چیزیں لے لینا، کپڑے وپڑے سب پہن لو گی ڈر تو نہیں لگے گا۔"

"نہیں مانیں گی آپ، جائیے میں نہیں بولتی آپ سے۔" غنچہ ناراضگی دکھانے کو سچ مچ باہر نکل گئی۔ نل پر لڑکیاں کپڑے دھو رہی تھیں کچھ جمعدارنی سے غسلخانے کا فرش دھلوا رہی تھیں، باقی کھانا پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ سب نے اس کے ماموں کی خیریت پوچھی اور ان کے ٹھیک ہو جانے کی خبر سن کر خدا کا شکر ادا کیا۔

---

(۱۱)

ادارے میں لڑکیاں بڑے بڑے کرگھوں پر بیٹھی کھٹا کھٹ کپڑا بن رہی تھیں، ہاتھ کے بنے ہوئے یہ خوش رنگ دھاری دار کپڑے خوب بکتے تھے، عورتیں اور لڑکیاں یہ کام بڑی جلدی سیکھ لیتی تھیں اس وقت ان کے ہاتھ ایسے چل رہے تھے جیسے مشینیں۔ برآمدے میں کچھ لڑکیاں زمین پر بیٹھی نیچے تختوں پر رکھی ہوئی سلائی کی مشینوں سے کپڑے سینے میں مصروف تھیں۔ ساری عمارت کھٹا کھٹ اور گھر گھر کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ فرش پر رنگ برنگی کترنیں بکھری ہوئی تھیں۔ صحن میں بندھے ہوئے تار پر رنگے ہوئے ڈورے پھیلے ہوئے تھے، کچھ عورتیں اس وقت بھی رنگے ہوئے دھاگے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہی تھیں۔ غنچہ بوڑھی مائی کے ساتھ ان سب چیزوں کو دیکھتی مختلف کمروں اور برآمدوں سے گزرتی چلی جا

رہی تھی۔ مائی نے لیجا کر اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں چھوڑ دیا جہاں دو بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں اور بھی کئی عورتیں موجود تھیں۔ غنچہ کچھ دیر تو بینچ پر بیٹھی پھر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی، دروازے کے شیشے میں سے اس نے برابر کے کمرے میں دیکھا۔ یہ بڑا سا کمرہ تھا جس کے درمیان میں بڑی سی ایک میز تھی، چاروں طرف چند فیشن ایبل عورتیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ میز پر انگریزی میگزین پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف زمین پر بیٹھی ایک لڑکی ایسے ہی کسی رسالے میں سے پھول ٹریس کر رہی تھی۔ ایک صاحبہ ایک اور کام کرنے والی لڑکی کو ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پر پھول کاڑھنے کے بارے میں کچھ سمجھا رہی تھیں۔ یہ ساری عورتیں سوائے ایک کے بڑی پلی پلائی تھیں اور ضرورت سے زیادہ قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ ایک گوری موٹی بلی کی شکل کی بیگم مختلف رنگوں کی چوڑی دھاریوں والی ریشمی قمیص میں رنگین غبارہ سی نظر آرہی تھیں۔ دوسری صاحبہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو کالی کالی موٹی دھاریوں سے اس قدر خوفناک بنا لیا تھا کہ انہیں دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ تیسری صاحبہ اپنی پھسلتی ساڑی کے پلو کو گود میں ڈالے اپنے پہاڑ سے سینے کو نمایاں اور عریاں کیے بیٹھی ٹھٹے پر ٹھٹے لگا رہی تھیں۔ ان کی ایک ٹانگ دوسری پر رکھی تھی اور گھٹنوں تک ان کی بال بھری سیاہ پنڈلیاں ننگی ہو رہی تھیں۔ صرف

ایک دُبلی پتلی سی خاتون غنچہ کو پسند آئیں۔ وہ سفید چکن کا بلاؤز اور بے داغ سفید ساری پہنے ان رنگین غباروں میں ایسی اچھی نظر آرہی تھیں جیسے کاغذ کے پھولوں میں ٹکا مہک دیتا ہوا ہی کا پھول۔ اللہ اب ان عورتوں سے واسطہ پڑے گا۔ غنچہ نے دہل کر سوچا۔ اسے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے ان عورتوں کی زبانیں کترنی کی طرح چل رہی تھیں، انگریزی بلی پنجابی، بیچ بیچ میں اردو کے چھینٹے ساتھ ساتھ پشتو اور انگریزی کی کھچڑی، کچھ عجب جناتی زبان بول رہی تھیں یہ عورتیں، اس پر طرہ یک لخت پھٹ پڑنے والے قہقہے۔ پیٹ بھری عورتوں کے خوفناک دل دہلا دینے والے قہقہے۔ چائے اور سموسوں کے ساتھ باتوں کے دور چلتے رہے، کچھ کام کی باتیں بھی ہوئیں۔ اس کے بعد دوکان کے لیے آنے والی عورتوں کا انٹرویو شروع ہوا۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں باری باری جاتی رہیں۔ ہر عورت کے پیچھے دروازہ بند کر دیا جاتا اس لیے مختلف عورتوں کے سوالات اور اس کے جوابات کی صرف بھن بھن سنائی دیتی آخیر میں غنچہ کا نمبر آیا۔ اس کو دیکھ کر عورتوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ معنی خیزی غنچہ نے محسوس ضرور کی مگر معنی اس کی سمجھ میں نہیں آئے۔ سوالات اس سے بھی کیے گئے۔ کہاں تک پڑھی ہو، گھر کہاں ہے، ابھی کیا کرتی ہو، حساب کتاب کا سلیقہ ہے وغیرہ۔

غنچہ ان کے سامنے اتنی پریشان نہیں تھی جتنا اس کا خیال تھا کہ ہوگی کچھ نروس ضرور تھی مگر بظاہر وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتی رہی۔ اس کا جنرل امپریشن بڑا عمدہ رہا۔ کچھ دیر بعد اسے واپس اسی کمرے میں جانے کو کہا گیا۔ آپس میں کچھ کھسر پھسر ہوئی، قہقہے لگے، پھر اسے بلایا گیا اور بہت سی باتیں سمجھائی گئیں۔ ایک مہینے تک اس کا کام دیکھا جائے گا۔ دوکان کی ہر چیز اس کے قبضے میں رہے گی۔ اسے پائی پائی کا حساب رکھنا ہوگا، اور ایک سوئی بھی اِدھر سے اُدھر ہوئی تو وہ جواب دہ ہوگی۔ کہیں باہر آنا جانا ہو تو مائی کو ساتھ رکھنا ہوگا اور ادارے میں مردوں کی آمد و رفت نہیں ہوگی۔

"پہلی سیلز گرل کو اسی لیے نکالنا پڑا ہے۔" رنگین غبارے نے اسے مطلع کیا۔

"میرا ایک بھائی ہے، وہ کبھی کبھار مجھ سے ملنے آیا کرے گا۔"

"اچھا، اس سے کہنا وہ کل صبح آئے اور ہم سے بات کرے۔"

"بھائی بھی شام کو دو ایک گھنٹے کے لیے آ سکتا ہے بس۔"

"کل تم اپنا سامان لے کر ادارے میں آ جاؤ اور کل ہی سے کام شروع کر دو۔ آج تم اپنا کمرہ اور دوکان دیکھ جاؤ۔"

سیکرٹری اسے دوکان دکھانے لے گئیں۔ دوکان یوں تو ادارے

احاطے کے اندر تھی مگر اس کا ایک دروازہ باہر سڑک پر کھلتا تھا جس پر ادارے میں بنائے گئے بیج رنگے کپڑے کا پردہ پڑا ہوا تھا، خریدار عورتیں اسی طرف سے آتی تھیں۔ دوکان خاصی بڑی تھی اور مختلف قسم کے سامان سے بھری ہوئی تھی۔ شیشے والی الماریوں میں موٹی مرغیوں اور مرغوں کی شکل کی ٹی کوزیاں کڑھے ہوئے میزپوش، ٹرے کلاتھ، کھانے کی میز اور سنگھار میز کے سیٹ بھرے ہوئے تھے۔ شوکیس میں نائلون کی لیسیں، بٹن، دھاگے، سوئیاں موتی وغیرہ بے شمار چیزیں تھیں۔ بغیر شیشے کی الماریوں میں ادارے میں بنائے جانے والے کپڑے اور ساڑھیوں کے ڈھیر تھے۔ ایک طرف دیوار پر لٹکائی جانے والی مرغابیاں، اُونٹ، ہاتھی دانت کے پھول جڑی ٹرے اور چاندی کا سامان بھی تھا، لکڑی کی بنی اُونٹ کی کاٹھیاں جنہیں امریکن بڑے شوق سے اپنے ملاقاتی کمروں میں بیٹھنے کے لیے رکھتے تھے اور پشاور ہی میں بننے والے چینی کے گلدان اور سجاوٹ کی دوسری چیزیں۔ غنچہ نے یہ سب چیزیں بڑے شوق سے دیکھیں اور دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی، اتنی بہت سی اور اتنی خوبصورت چیزیں سب صرف اس کے قبضے میں رہیں گی، کل کیوں وہ آج ہی اس دھول اڑاتے ہاسٹل کو خیرباد کہہ آئے گی۔

تھوڑی دیر میں اس نے دیکھا وہ چاروں موٹی عورتیں ادارے

سے باہر نکلیں اور اپنی یہ لمبی چوڑی کاروں میں بیٹھ کر ہوا ہو گئیں۔
دوکان دیکھنے کے بعد اس نے اپنا کمرہ بھی دیکھا، وہ اوپری منزل میں تھا اور وہاں سے دُور دور کا نقشہ نظر آتا تھا۔ ادارے کے پاس دوکان کے عین سامنے تو کار پارک تھا، سامنے دوکانوں کی قطار تھی۔ بائیں ہاتھ کو امریکن لائبریری تھی جہاں چست چست کپڑے پہنے لڑکے لڑکیاں کتابیں اور ریکارڈ ہاتھ میں لیے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس لائبریری کے سامنے دوسری طرف لڑکیوں کا کالج تھا جس کے بڑے سے لان میں لڑکیوں کی ٹولیاں بکھری ہوئی تھیں ان کے سفید کپڑوں میں سُرخ کالر اور کف اور سفید دوپٹے میں سُرخ گوٹ بڑی بہار دکھا رہی تھی۔

اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ اپنا حساب کتاب سب بے باق کر سب سے رخصت ہو اپنا سامان لے کر شام ہی کو چلی آئی۔ اسی وقت مائی کو ساتھ لے وہ چولہا، کھانا پکانے اور کھانے کے چند برتن اور کھانا پکانے کا سامان لے آئی اور دُوسرے دن سے باقاعدہ ادارے میں کام کرنے لگی، صبح آٹھ بجے وہ دوکان کھولتی اس وقت زیادہ تر نوجیوں کی کاہل بیگمات اس کے پاس آتیں جو لپک جھپک تھوڑے سے بٹن اور اون وغیرہ لیتیں اور بازار جاتے ہوئے اپنی لمبی قمیضیں چھوٹی کرنے کو اور ڈھیلی

قمیصیں تنگ کرنے کو دے جاتیں یا گنوار عورتیں آتیں جو کروشیا کی نیلی
پیلی لیسیں، دھاگے اور ادارے کے بنے ہوئے کپڑے لیتیں، اصل بِکری
شام کو ہوتی، جب ڈیم میں کام کرنے والی امریکنوں کی بیویاں چاندی کے
زیور، لکڑی اور ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چیزیں خریدتیں یا دوسری کھاتی
پیتی بیگمات خرید و فروخت کرنے آتیں۔ کوئی نہ ہوتا تو وہ کوئی کتاب لیے
دوکان میں بیٹھی رہتی یا باہر دیکھتی رہتی جہاں ہر لحظہ ایک نیا منظر، ایک
نئی چہل پہل ہوتی۔ دوکان کے پاس کار پارک پر شام کو ایک سے ایک
جدید کار کھڑی ہوتی، سجی بنی بیگمات سامنے دوکانوں میں شاپنگ کرتی نظر
آتیں، لڑکے لڑکیاں امریکن لائبریری میں سینما شو کے لیے جاتے دکھائی
دیتے۔ دوپہر کو دوکان دو گھنٹے کے لیے بند ہوتی تھی اور شام کو پانچ بجے
تک کھلی رہتی تھی۔ پانچ بجے تو دوکان بند کر کے وہ اپنے کمرے میں جاتی،
اس وقت صبح کے مقابلے میں ادارے میں ہو کا عالم ہوتا۔ وہ ہوتی،
بوڑھی مائی اور ادارے کی نرس جس کو اس کی طرح ایک کمرہ رہنے کے
لیے دے دیا گیا تھا۔ وہ عمر میں غنچہ سے ذرا بڑی، شوقین مزاج سی لڑکی
تھی۔ اس کا کمرہ غنچہ کے کمرے سے خاصا دور تھا اور اس کی مصروفیات
بھی الگ تھیں، تاہم غنچہ جب اس سے ملتی بڑی ہی خندہ پیشانی سے۔
دوکان سے واپسی پر غنچہ منہ ہاتھ دھو کر بال سنوار کر ذرا دیر آرام کرتی

تاوقتیکہ مائی کی آواز آتی۔

"بی بی آپ کے بھائی آئے ہیں"

"بھیج دو اندر"

رحمان جسے غنچہ نے اپنے بھائی کی حیثیت سے پہلے دن ہی سب سے متعارف کروا دیا تھا اندر آجاتا۔ دونوں ساتھ چائے پیتے، مائی رات کا کھانا پکانے میں لگی رہتی۔ شروع میں تو وہ کئی دن باہر نہ نکلے مگر آہستہ آہستہ مائی کی اجازت سے اُنہوں نے باہر جانا شروع کر دیا۔ مائی کی کمزوری تھی، چھٹی اور نسوار، غنچہ یہ دونوں چیزیں اسے وافر مقدار میں مہیا کرتی۔ گو کوئی خاص خدشہ نہیں تھا پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر غنچہ نے نرس سے بھی دوستی کر لی، کبھی کبھار بازار سے اس کے لیے بھی کوئی چھوٹا موٹا تحفہ لے آتی، اتوار کے دن صبح کے وقت وہ مائی کو لے کر ثریا سے ملنے بھی ضرور جاتی اور اسے اپنی موجودہ زندگی کے قصے بڑے مزے لے کر سناتی۔ ادارے میں کیا گول مال ہوتا رہتا ہے امداد میں ملنے والے گھی کے ڈبے اور پرانی ریشمی فراکوں کی کتنی مرتبہ چھانٹی ہوتی ہے اور کن کن کے حصے نکل کر مال غریب غربا تک پہنچتا ہے۔ اسے ممبر عورتوں کی آپس کی چپقلش اور جلاپے کے قصے سناتی۔ ان امریکن مرد عورتوں کی داستان سناتی جو ادارے میں آکر بیبیوں

چیزیں خرید کر لے جاتیں، فقیر ان کے پیچھے ایسے چمٹے رہتے جیسے برسات کی مکھیاں۔ وہ ان مانگنے والوں کو دو روپیہ سے کم کبھی نہ دیتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ فقیروں کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔ دیسی لوگوں کے آنے دو آنے تو وہ انہیں دکھا کر نالی میں پھینک کر چلے جاتے تھے، (چاہے بعد میں نکال لیتے ہوں) عورتیں پہلے تو جھپٹ ہو کر مانگتی رہتیں مگر جیسے ہی دیسی بیگم صاحب بغیر کچھ دیئے گاڑی میں آگے بڑھتیں وہ خوب مغلّظات سُناتیں۔ یہ سب تماشے وہ دوکان میں سے دیکھتی رہتی تھی اور ثریّا کو سُنانے کے لیے جمع رکھتی تھی، اپنی روزمرّہ مصروفیات میں سے جو باب وہ پورے کا پورا نکال دیتی تھی وہ رحمان کی ملاقات کا باب تھا۔

ہفتے میں ایک دن اداسے میں لیڈیز کلب کی میٹنگ ہوتی تھی۔ غنچہ کے لیے اس دن دیکھنے اور سیکھنے کو بہت کچھ ہوتا تھا۔ یہ کام بھی ایک طرح سے شروع سے اس کے ذمّے ہو گیا تھا کہ کلب کی سیکرٹری اور دوسری عورتوں کے ساتھ انتظامات میں شریک ہو۔

کھانے پینے کا سامان سجاتی، اکثر چائے اور شربت بنانے میں عورتوں کی مدد کرتی۔ کبھی کبھار اسے کسی کھیل میں شامل کر لیا جاتا ورنہ وہ دُور چائے کی پیالیوں کے پاس بیٹھی عورتوں کی باتوں اور قہقہوں کی

آواز سنتی رہتی اور کڑھائی یا بنائی کا کوئی کام لاتعلقی سے کرتی رہتی، مگر درا‌صل وہ چپکے چپکے ہر عورت کے کپڑوں کے رنگوں پر، ان کے ڈیزائن پر، تراش خراش پر، جوتوں اور پرس پر، بالوں کے اسٹائل اور نقلی زیورات پر نظر رکھتی۔ ان کو غور سے دیکھتی اور ذہن میں محفوظ کرتی جاتی۔ کتنے ہی اچھوتے خیالات ان عورتوں کے ڈیزائن دیکھ کر خود اس کے ذہن میں آنے لگے تھے۔ کتنی ہی چیزیں بڑی آسانی سے اس نے جوں کی توں نقل کرلی تھیں۔ جو ڈیزائن پسند آتا جھٹ سے کپڑا خرید کر بنا ڈالتی کہ بھول نہ جائے۔ یہ عورتیں مٹھی بھر بھر روپے دے کر درزیوں سے کام بنواتی تھیں اور وہ ذرا سی دیر میں ادارے کی مشین پر بیٹھ کر قریب قریب وہی چیز تیار کرلیتی تھی۔ اس کو وہ چیز پہنے دیکھ کر بہت سی عورتیں جو درزی کے نخرے اور اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھیں وہ کام اس سے کروالیتی تھیں۔ فرصت میں اس طرح کے کام کرکے بھی اسے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔

غنچہ صبح کے وقت کوٹھے سے جھانکتی تو اسے پیدل تانگوں اور گاڑیوں میں لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آتیں۔ کالج کے احاطے میں سفید لبادوں میں سر سے پیر تک چھپی نَنیں تیز تیز ادھر سے اُدھر جا رہی ہوتیں کالج کے برابر میں چھوٹے بچوں کا اسکول تھا۔ پی ٹی گراؤنڈ میں کوٹھے کی

طرح سیاہ پی ٹی ماسٹر سفید براق کپڑے پہنے بینڈ پر بچوں کو مارچ سکھاتے نظر آتے، چھوٹے چھوٹے بچوں کا ایک سی وردی میں پھرنا بھی غنچہ کو بڑا اچھا لگتا مگر زیادہ تر اس کا دل کالج میں اٹکا رہتا، کئی دفعہ بلا ضرورت بھی وہ دوکان چھوڑ کر اوپر چڑھ جاتی اور کالج کا نظارہ کرنے لگتی۔ کالج کی یہ صاف ستھری بے فکر لڑکیاں جیسے بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچتیں۔ ایک دن وہ کالج میں داخلہ لینے کے بہانے کالج دیکھنے بھی گئی۔ عمارت کسی لکھ پتی سکھ نے اپنے رہنے کے لیے بنوائی تھی، گھر کیا تھا اچھا خاصا محل تھا۔ چوکور سیاہ و سفید ٹائلوں والا پورچ اور برآمدہ اتنا چکنا تھا کہ وہ گرتے گرتے بچی ——— ڈرائنگ روم کے جواب کالج کا ریسپشن روم تھا ایسے جہازی دروازے تھے کہ ہاتھی گزر جائیں۔ دروازوں پر، پردوں کے لیے پیلمٹ پر اور آتشدان پر لکڑی پر بڑا باریک اور خوبصورت کام تھا۔ چھت منقش تھی اور اس پر آئینے جڑے ہوئے تھے۔ ہر کمرے میں جو اب کلاس رومز تھے بڑی بڑی الماریاں لگی ہوئی تھیں جن کے پٹ پورے پورے آئینوں سے بنے ہوئے تھے۔ تقریباً ہر کمرے میں آتشدان کے اوپر لکڑی کی خوبصورت محرابیں تھیں تمام برآمدے بے حد چکنے تھے چھتیں سارے کمروں کی منقش تھیں۔ باہر باغ میں سنگ مرمر کی بینچیں اور نئی وضع کے گملے تھے، ایک طرف

خوبصورت سی ایک بارہ دری تھی اور فوارہ تھا۔ غنچہ کو یوں محسوس ہوا
جیسے وہ کالج میں نہیں اپنے ہی خوابوں کے کسی محل میں گھوم رہی
ہو۔ حیرہ........ اس کی قسمت میں یہ بھی تو نہیں کہ پڑھائی کے بہانے
ہی وہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس محل میں گھوم پھر سکے، ہائے رے
اس کے نصیب! ——

(۱۲)

ثریا کا وہی عالم تھا۔ ٹھیک ہو جاتی تو کام شروع کر دیتی، پھر
کسی دن بے ہوش ہو کر گر پڑتی تو کئی دن بستر پر پڑی رہتی۔ بظاہر
وہ اپنی زندگی سے بڑی مطمئن تھی جیسے اس میں کوئی غیر معمولی بات ہی
نہ ہو، بیمار رہنا اور بے ہوش ہو کر گر پڑنا بھی جیسے اس کے لیے بالکل
نارمل بات تھی۔ غنچہ حیران تھی کہ ثریا نے زندگی سے اس قدر خاموش
سمجھوتہ کیسے کر لیا تھا، نہ زندگی میں آگے بڑھنے کی لگن اس کے دل
میں مچلتی تھی، نہ کسی کے قیمتی کپڑے اسے متاثر کرتے تھے نہ لمبی لمبی کاریں
دیکھ کر اس کا دل دکھتا تھا جانے کس مٹی کی بنی تھی وہ! غنچہ تو ہر وقت
یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی تھی کہ آخر ان عورتوں میں کون سے سرخاب
کے پر لگے ہوئے ہیں جو چمکتے دمکتے مکانوں میں عیش کرتی ہیں اور شام

کو سج بن کر بازاروں میں اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ ان میں کئی تو اتنی بدصورت
تھیں کہ دیکھ کر گھن آئے، اکثر جاہل لٹھ تھیں تو آخر انہیں کیا حق تھا کہ وہ
اچھے سے اچھا پہن اوڑھ کر بھرے بازار میں توندیں ہلاتی، پیسے لٹاتی پھریں
جب کہ وہ ایک ایک پیسہ دل مسوس کر خرچ کرے۔ ایسی عورتوں سے وہ
اور بھی جلتی تھی جن کے پاس پیسہ تو تھا مگر ظرف نہیں تھا۔ لیڈیز کلب
میں جب یہ چھچھوری سی اپنے زیور کپڑوں، کئی کئی کاروں اور ریفریجریٹروں
کی باتیں کرتی تھیں تو غنچہ کا دل جل جل جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کو
ثریا شاید محسوس بھی نہ کرتی اس کے دل پر یوں نقش ہو جاتی تھیں کہ پھر
نکالے نہ نکلتی تھیں۔ ایک دن وہ اپنی دوکان کی کھڑکی میں کھڑی یوں ہی باہر
دیکھ رہی تھی کہ سڑک پر ایک بے حد بڑی ہوائی جہاز ایسی کار تیرتی ہوئی
آئی اور کار پارک پر کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے ایک امریکن مرد اُترا،
تیزی سے جا کر دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ بڑی شان سے ایک امریکن
عورت اُتری۔ عورت تھی کہ حسن و خوبصورتی کا مجسمہ۔ اب تک غنچہ ان
بدیسیوں کو بڑی تعداد میں دیکھ چکی تھی اور سفید چمڑے سے رُعب کھانے
والا عرصہ گزر چکا تھا مگر اس عورت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ڈھلا ڈھلا
جسم اور بے داغ چہرہ یوں بنا سنورا جیسے دوکان میں سجا کوئی ماڈل ہو۔
کار سے میچ کرتا فالسئی رنگ کا چست لباس پہنے ہوئی تھی، فالسئی جوتے

اسی رنگ کا پرس، لبوں پہ فانسی لپ اسٹک۔ نیچے تک چلے گئے گول گلے
میں کیا کم کشش تھی کہ وہاں سفید موتیوں کا ایک خوبصورت بروچ بھی
اٹکایا تھا۔ اسی سے میچ کرتے گول موتیوں کے ٹاپس کانوں میں تھے۔
کار سے اتر کر وہ سیدھی اس کی دوکان کی طرف بڑھی اور غنچہ کو یوں لگا
جیسے آسمان سے کوئی حور اتر کر اس کی دوکان میں گھس آئی ہو۔ ہڑبڑا کر
وہ شوکیس کی طرف لپکی۔ عورت کے ساتھ امریکن مرد بھی اندر گھس آیا اور
بڑے مزے سے جیب میں ہاتھ ڈالے زبان گول گول کر کے عورت سے
باتیں کرتا رہا۔ غنچہ کی ہمت ہی نہ ہوئی اس سے کچھ کہنے کی۔ عورت شوکیس
میں سے چیزیں نکلوا کر دیکھتی رہی، غنچہ اٹک اٹک کر انگریزی میں اس
کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ اس نے چاندی اور لکڑی کی بنی ہوئی
کئی چیزیں خریدیں۔ جب چیزوں کے پیکٹ ہاتھ میں لے کر مرد باہر نکلا
تو بیچارے نے لشتم پشتم چیزیں بغل اور ٹھوڑی میں دبائیں، اور دروازہ
[illegible] تھام لیا۔ عورت ایسے [illegible] سے گزرتی چلی گئی جیسے
کوئی مہارانی ہو۔ کار میں بیٹھ کر تو وہ اور بھی خوبصورت لگنے لگی۔ کار موڑ
پہ غائب ہو گئی تو غنچہ نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ہائے دنیا میں ایسی عورتیں
بھی ہیں جن کے دم سے یہ بڑی بڑی کاریں سج جاتی ہیں۔ کئی دن تک
غنچہ کو اس عورت کے تصور نے گھیرے رکھا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ غنچہ نے

خود کو ایسے ہی کپڑے پہنا کر اسی اسٹائل سے اسی گاڑی میں بٹھا کر دیکھا کہ آیا وہ بھی ایسی ہی سج رہی ہے یا نہیں، حیرت ہے کہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔

ایک دن ادارے کی پریذیڈنٹ اسے سوئمنگ پول لے گئیں۔ وہ اپنی بچیوں کے سوئمنگ کاسٹیوم غنچہ سے سلوانا چاہتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ وہ وہاں جا کر مفت سے نئے ڈیزائن دیکھ لے۔ صبح تین گھنٹے کلب کا سوئمنگ پول عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اس سے پہلے غنچہ نے عورتوں کو تیرتے ہوئے صرف انگریزی پکچرز میں دیکھا تھا (انگریزی پکچر اب وہ رحمان کے ساتھ خوب دیکھنے لگی تھی) آٹھ بجے تھے، لیکن گرمی ابھی سے اپنے شباب کی طرف اشارہ کر رہی تھی، سوئمنگ پول کے ایک کنارے پر کرسیاں پڑی تھیں۔ ادارے کی پریذیڈنٹ اور ان کی لڑکیاں ایک ایک جوڑا اور لے آئی تھیں اس لیے وہ شلوار قمیص میں ہی پانی میں اتر گئیں۔ ڈیڑھ من کی بیگم سات گز کپڑے میں لپٹی تیرنے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کی شلوار میں پانی بھر جاتا تھا اور یوں نظر آتا تھا جیسے کوئی رنگین مشک پانی میں غوطے لگا رہی ہو۔ غنچہ نے سوئمنگ کاسٹیوم کے ڈیزائن کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اس نے دیکھا کہ ایک صاحبہ عام سفید چولی پہنے اور سر پر کپڑے کی ٹوپی منڈھے اپنے تین چار سالہ بچے

کو بنلوں سے پکڑ کر پول کی چوڑائی طے کروا رہی ہیں، بچے کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں گردن بیٹھی ہوئی تھی اور آنکھیں بھینگی تھیں شاید اسے تیرانے کا مشورہ کسی ڈاکٹر نے دیا تھا۔ دور ایک کرسچن لڑکی گلابی کاسٹیوم میں اپنا سیاہ جسم جھلکاتی نیلے پانی میں کھڑی جگمگا رہی تھی۔ اس کے بال گیلے ہو کر چپک گئے تھے اور بغیر میک اپ کے چہرہ باسی سالن کی طرح بے رونق تھا۔ جب وہ باہر نکل کر تختے پر سے چھلانگ لگانے کو پر تولتی تو جسم کے کئی حصے کچھ کٹتے ہوئے سے معلوم ہوتے۔ اس وقت غنچہ جلدی جلدی کاسٹیوم کی تراش دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرتی۔ سفید دبلی سی ایک کم عمر لڑکی گھر کے بنے ہوئے سوتی کاسٹیوم میں بلا وجہ لجائے جا رہی تھی۔ وہ گندھی ہوئی چوٹی کے ساتھ پانی میں اتر گئی تھی جو اب بھیگے ہوئے چوہے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اسی وقت دو خوبصورت بچیاں بے حد پیارے ننھے منے کاسٹیوم پہنے آئیں، سر پر ربڑ کی ٹوپیاں تھیں اور ہاتھ میں ہوا بھرے ہوئے سرخ اور سبز ٹیوب۔ ان کی جگمگاتی شخصیتوں نے ایک دم رونق سی کر دی۔ ان کی ماں کا پنسلین کے ٹیکے کے ردِ عمل سے حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور باپ ہسپتال میں خطرے کے وارڈ میں پڑے تھے۔ آیا ان کے ساتھ آئی تھی معصوم بچیاں اپنے اوپر گزرنے والی مصیبتوں سے بے خبر تھیں، پھر بھی اداسی کا

ہلکا سا پر تو ان کے چہرے پر نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور لڑکی سُرخ رنگ کے کاسٹیوم میں آگئی، سرخ کاسٹیوم اس کے سفید جسم اور نیلی آنکھوں پر بڑا کھل رہا تھا۔ وہ کرسچن لڑکی کے پاس چلی گئی وہ دونوں بڑا اچھا تیرنا جانتی تھیں باری باری غوطے لگاتیں اور مچھلی کی طرح تیرتی دور نکل جاتیں۔ کبھی کبھار ان کے قہقہوں کی آواز سے فضا گونجنے لگتی۔ پھر وہ دونوں باہر نکل کر چلتے ہوئے فوارے کی منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ گئیں۔ چھوٹی بچیاں ان کے نیم برہنہ جسموں پر پڑتے ہوئے پانی کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

اب دھوپ میں شدت آچلی تھی، پانی میں رہنا تو آسان ہوگا مگر غنچہ کو دھوپ میں کرسی پر بیٹھنا دوبھر معلوم ہو رہا تھا، اس کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ پانی میں اتر جائے اور سب کی طرح ٹھنڈی ہو جائے مگر نہ اس کے پاس دوسرے کپڑے تھے نہ کسی نے اس سے کہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لمبی لمبی گاڑیاں آنی شروع ہوئیں جن میں سے امریکن عورتیں اتریں، اپنے کپڑوں، تولیوں، تھرماس اور بسکٹ کے پیکٹ سے لدی پھندی وہ اس سمت آئیں اور کرسیوں پر بیٹھ کر اطمینان سے سگریٹ پینے اور باتیں کرنے میں مشغول ہو گئیں۔ جب عورتوں اور بچوں کا وقت ختم ہونے لگا تو وہ غسلخانے میں گئیں اور چولا بدل کر نکل آئیں۔ وہ ان کے ٹھکے

جسموں پر شوخ رنگوں اور نئی نئی وضع کے کاسٹیوم۔ ساری عورتیں اور لڑکیاں
چوری چوری انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس کو ساتھ لانے والی صاحبہ نے اسے
اشارہ کیا یعنی اب وہ اچھی طرح دیکھ لے جو کچھ دیکھنے آئی تھی۔ غنچہ سب کو
بڑے غور سے دیکھنے لگی، مگر انہوں نے کسی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی
نہیں دیکھا، سب کی نگاہوں سے بہت بلند، بے پرواسی ہو کر وہ
پھر کرسیوں پر بیٹھ گئیں گویا واضح طور پر سب کے جانے کا انتظار کر
رہی ہوں۔ دس بجے تک دھوپ اور گرمی اور بڑھ گئی۔ وقت ختم ہو
چکا تھا، رفتہ رفتہ سب کپڑے تبدیل کر کے آگئیں اور رخت سفر باندھا
گیا۔ گاڑی میں ادارے کی پریذیڈنٹ نے غنچہ سے کہا کہ وہ روز صبح ان
کی بچیوں کے ساتھ تیرنے چلی جایا کرے، لڑکیاں صبح جلدی جانا چاہتی
ہیں اور وہ دیر سے سو کر اُٹھتی ہیں، ڈرائیور کے ساتھ تنہا وہ لڑکیوں
کو بھیجنا نہیں چاہتیں۔ واپس آ کر وہ ذرا دیر سے بھی دوکان کھول
سکتی ہے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ! غنچہ تو اس خیال سے ہی کھل اُٹھی۔ دوسرے
دن سے غنچہ نے سوئمنگ کے لیے جانا شروع کر دیا، اپنے لیے بھی
اس نے بڑا خوبصورت سا سُرخ رنگ کا تیراکی کا لباس سی لیا اور
تیرنا سیکھنے میں تو اس نے حیرت انگیز ترقی کا مظاہرہ کیا۔ لمبی سی گاڑی
میں بیٹھ کر تیرنے کے لیے جاتے وقت اس کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلا

کرتا۔ وہ بھول ہی جاتی کہ وہ ادارے کی ایک معمولی سی ملازمت کر رہی ہے اور یہ گاڑی اس کی نہیں ہے، اس کی حیثیت اس ڈرائیور کی سی ہے جو گاڑی میں بیٹھتا تو ضرور ہے مگر ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ وہ بڑے صاحب کا ادنٰے سا ملازم ہے۔

رحمان کو وہ اپنی صبح کی سیر اور تیراکی کے قصے بڑے شوق سے سنایا کرتی اور وہ ہنس کر کہا کرتا کہ کسی دن وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں آئے گا اور اسے سوئمنگ کا سٹیوم میں تیرتا ہوا دیکھے گا۔

ایک دن غنچہ تھوڑی دیر تیر کر باہر نکلی تو اچانک اسے زور کا چکر آیا، اس نے کرسی تھام لی۔ ہائے یہ کیسی گھن چکر لے رہے، جیسے کوئی گول جھولے پر بیٹھا گھومنی کھا رہا ہو، ہمت کر کے وہ کپڑے بدلنے غسلخانے کی طرف چلی تو زور کا جی متلایا اور الٹی آئی، وہ سر پکڑ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں بھاگی آئیں تو اس نے ان سے گھر چلنے کو کہا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئیں اور غنچہ بھر کرسی پر نڈھال سی ہو کر گر پڑی۔ بیمار بچے کو لے کر تیرنے والی ماں اس کے پاس آگئیں اور پوچھا "صبح کچھ کھایا تھا؟"

"نہیں" غنچہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"صبح تھوڑا سا کچھ کھا کر آیا کرو، پیٹ پہلے ہی رات بھر کا خالی

ہو، اس پر اتنی ورزش۔"

"میں تو ہمیشہ واپس جاکر کھاتی ہوں" غنچہ نے مری ہوئی آواز نکالی۔

"نہیں نہیں صبح ضرور کچھ کھانا چاہیئے، بھوک سے جی متلاتا ہے ایک توس اور چائے پی آیا کرو۔" انہوں نے نصیحت کی۔ غنچہ نے ان کے کہنے پر عمل کرنے کا ارادہ کیا، دوبارہ ہمّت کر کے اٹھی، تیار ہوئی اور لڑکیوں کو لے کر واپس چلی آئی۔ گھر آکر اس نے ادارے کی نرس سے ذکر کیا تو اس نے بھی یہی کہا۔

"بھوک کی وجہ سے ہوگا، آجکل تم نے کھانا پینا بھی تو چھوڑ رکھا ہے شاید سلم ہونے کے شوق میں، حالانکہ پہلے ہی تمہارا جسم اتنا اچھا ہے، خوب ڈٹ کر کھایا کرو" ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے شوق میں وہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتی اسی سے ابکائی آنے لگتی، پراٹھے کا نوالہ سینے پر بیٹھتا ہوا معلوم ہوتا تھا، انڈے کی بو برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھی، دو ایک نوالے بمشکل کھا کر اس نے بس چائے پی لی اور جا کر اپنی دوکان میں بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک اس کا جی جانے کیسا ہوتا رہا۔ دوسرے دن اتوار تھا اس نے ثریا کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ آج اس کی طبیعت کل سے بہتر تھی مگر کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تھوڑا سا ناشتہ کر کے اس نے مائی سے ساتھ چلنے کو کہا۔ مائی وہاں جانے کو ہر وقت

تیار رہتی تھی، یہاں کھانا پکانے کی مصیبت سے چھوٹتی تھی کیونکہ ثریا دوپہر کا کھانا با اصرار وہیں کھلاتی تھی، دن بھر گپیں مارنے اور نسوار کھانے کو کئی ساتھنیں مل جاتی تھیں پھر وہ غنچہ سے پوچھ کر نزدیک کے گاؤں میں ہو آتی تھی جہاں اس کی بیٹی بیاہی ہوئی تھی غنچہ کے پیسوں سے سیر اور بیٹی کے گھر جانا ہو جاتا تھا اسی لیے وہ ثریا کے پاس جانے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتی تھی۔

ثریا بستر پر دراز تھی۔ اس کے کمرے کی ایک لڑکی نے چپکے سے غنچہ کو بتایا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے ثریا کے گردے خراب ہو چکے ہیں۔ ثریا بستر پر پڑی بالکل جلی لکڑی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے سانولے ہاتھ اب کھچے ہو گئے تھے مگر ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ اب بھی تھی جیسے وہ زندگی پر یا خود اپنی بیماری پر طنز کر رہے ہوں۔ غنچہ اس کے بستر پر بیٹھ گئی، اور اس کا پتلی پتلی زرد انگلیوں والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"تم کیسی ہو غنچہ؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"کچھ کمزور نظر آ رہی ہو۔"

"جانے کیا بات ہے آج کل کچھ بھوک نہیں لگتی، چکر سے آتے رہتے ہیں اور آلٹی ——"

دفعتاً ثریا کا زرد رنگ اور زرد ہو گیا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ اسے خالی پاکر اس نے غنچہ سے کہا۔

"ایک بات پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتاؤ گی؟"

"ہاں"

"رحمان تم سے ملتا ہے؟"

"رح ـــــ رحمان ـــــ بھائی" غنچہ گڑبڑا گئی۔

"چھوڑو بھائی وائی کا جھگڑا، یہ بتاؤ وہ تم سے ملتا ہے؟" ثریا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"نہیں ـــــ ہاں ـــــ کبھی کبھی بازار میں نظر آجاتے ہیں۔"

"میں بازار کی بات نہیں کر رہی" ثریا کے لہجے میں ترشی نہیں مگر کچھ عجیب قسم کی سختی تھی۔ "وہ گھر پہ ـــــ تمہارے یا اپنے یا کسی اور جگہ تم سے ملتا ہے؟"

غنچہ نے نظریں جھکا لیں۔ اس نے سوچا رحمان کچھ بھی کہے مگر اب وہ ثریا سے نہیں چھپا سکتی، آخر وہ اس کی دوست ہے اور رحمان اس کا بھائی ہے۔ بالآخر نگاہیں جھکائے جھکائے وہ بولی۔

"میں نے تو ان سے کئی دفعہ کہا ثریا کو بتا دو مگر وہ تیار ہی نہیں ہوتے تھے، کہتے تھے میری ترقی ہونے والی ہے پھر دونوں خبریں

ایک ساتھ سنائیں گے، سچ کہتی ہوں میں تو ان سے ہمیشہ کہتی ہوں ثریا کو دیکھ آئیں آخر آپ کی بہن ہیں" غنچہ نے اپنی رَو میں ثریا کی طرف نہیں دیکھا اور اس کی بدلتی ہوئی حالت بھی نہیں دیکھی۔ رخشادہ کمزور سی آواز میں چلائی۔

"رحمان میرا بھائی نہیں ہے" وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑی۔" تو وہ تم سے ملتا ہے اور اس نے تمہیں شادی کا لالچ دے کر ضرور ——"

"ہماری شادی ہو چکی ہے" غنچہ نے نظریں جھکائے دوپٹے کا کونا موڑتے ہوئے کہا۔

"ہو چکی ہے؟" تعجب سے ثریا چلائی۔" کب ہوئی، کہاں ہوئی، کیا تمہارے ماموں نے خود کی؟"

"نہیں" غنچہ نے بدستور نظریں جھکائے آہستہ سے کہا۔" ہم نے چھپ کر کی ہے —— مگر کیا کیا وہ آپ کے بھائی نہیں ہیں" غنچہ اپنے تعجب میں گرفتار تھی۔ یہ اس کے لیے بالکل نیا انکشاف تھا کہ رحمان ثریا کا بھائی نہیں ہے۔ ثریا کے لیے رحمان کی غنچہ سے شادی بم کا گولہ بن کر پھٹی تھی۔ وہ مُردہ سی پڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھی۔ آخر وہ بولی:" سچ بتاؤ تمہاری شادی ہوئی ہے یا یونہی؟"

"قسم سے —— اللہ کی قسم —— قرآن کی۔ آپ کیا سمجھتی ہیں میں اتنی بری ہوں کہ ایسے ہی ——"

"یہ کب کی بات ہے؟"

بتاتے ہوئے غنچہ کا منہ شرم سے لال ہو گیا "جب ـــــ جب میں یہاں تھی اور تار آیا تھا نا کہ ماموں بیمار ہے، تب میں کہیں نہیں گئی تھی رحمان کے گھر تھی ـــــ وہیں ہماری شادی ہوئی تھی۔"

"مگر تمہیں تو غفور گاڑی میں بٹھا کر آیا تھا۔"

"ہاں رحمان بھی اسی گاڑی میں تھا ہم دونوں بستی پہ اتر گئے تھے۔"

"کون کون تھا تمہاری شادی میں؟"

"کوئی بھی نہیں، بتا تو رہی ہوں چھپ کر ہوئی ہے۔"

"مولوی صاحب تو تھے جنہوں نے نکاح پڑھایا تھا۔"

"ہاں" اگر موقع اتنا نازک نہ ہوتا تو غنچہ کو ثریا کی اس بات پر ضرور ہنسی آجاتی کیا اُلٹی بات پوچھ رہی ہیں مولوی صاحب کے بغیر بھی نکاح ہوتا ہے کہیں!

"اور گواہ!"

گواہ وواہ تو پتہ نہیں، شاید دوسرے کمرے میں ہوں میرے پاس تو مولوی صاحب آئے تھے۔"

"ارے پاگل تجھے پتہ نہیں کہ شادی میں گواہ ضروری ہوتے ہیں، تو نے پہلے کسی کی شادی نہیں دیکھی۔"

"دیکھی ہے مگر گواہ وواہ تو میں نے نہیں دیکھے، میرا خیال تھا جب

چھپ کر شادی ہوتی ہے تو صرف مولوی صاحب نکاح پڑھا دیتے ہیں۔"

"اچھا، نکاح نامہ کہاں ہے تمہارا؟"

"نکاح نامہ! پتہ نہیں، رحمان کے پاس ہوگا۔"

ثریا کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جارہا تھا اس نے دانتوں سے نچلا ہونٹ دبا رکھا تھا۔ خود پر قابو پاکر بڑی ہمت کے بعد وہ بولی "کاش تو نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔"

"کیا ہوا" غنچہ نے بے وقوفی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تیری شادی وادی کچھ نہیں ہوئی ہے میں بتائے دیتی ہوں —— رحمان نے تیرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی شادی کا وعدہ کیا تھا۔"

آخری جملہ غنچہ کے ذہن پر یوں پڑا جیسے کسی نے من بھر کا پتھر گھما کر اس کے سر پر دے مارا ہو۔

"آپ سے شادی کا وعدہ!"

"ہاں بی بی" ثریا کے لہجے میں بلا کی کڑواہٹ تھی "وہ میرا بھائی نہیں ہے، اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا اور پھر یہ چاہا میں وعدے سے ہی خوش ہوکر اس کی ہو جاؤں مگر میں تیری طرح احمق نہیں بنی، گھر سے بھاگ آنے کے باوجود میں نے شادی سے پہلے اسے ہاتھ تک لگانے سے

انکار کر دیا، اس پہ وہ ناخوش ہوگیا اور ٹال مٹول کر کے، میرا بھائی بن کے مجھے یہاں ڈال گیا، آخر وقت تک وہ مجھے یہی دم دلاسے دیتا رہا کہ وہ علیحدہ مکان تلاش کر رہا ہے مکان لیتے ہی شادی کر لے گا۔ اس دوران میں بھی وہ برابر مجھے پٹانے کی کوشش کرتا رہا کہ اور کچھ نہیں تو میرا زیور ہی لے لے۔ میں نے تمہیں اپنے ساتھ اسی لیے لے جانا شروع کیا تھا کہ وہ ناجائز مطالبے نہ کر سکے، جب میں نے اس کی نظریں بدلتی دیکھیں تو جانا ہی چھوڑ دیا مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنے دن ہی میں نوبت کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے۔ تم نے اُس کے کہنے پہ یہ جگہ چھوڑی اور اُس نے تمہارے ساتھ شادی کا راس رچایا۔ بنو اتنی بھولی نہ بنو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتیں کہ یہ چکر اور اُلٹیاں اس بات کی نشانی ہیں کہ تم ماں بننے والی ہو، رحمان کے ناجائز بچے کی ماں"۔

"میری اور رحمان کی شادی ہو چکی ہے۔" غنچہ نے قدرے ناراضگی سے کہا "مولوی صاحب نے خود نکاح پڑھایا ہے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے"

"اگر شادی ہوگئی ہے تو وہ تمہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتا، اب تک چھپ چھپ کر کیوں ملتے ہو۔ اب اگر تمہاری حالت کا پتہ ادارے والوں کو چل گیا تو وہ تمہیں جوتے مار کر نکال دیں گے۔"

"میں رحمان سے کہوں گی تو وہ مجھے اپنے ساتھ رکھے گا۔ وہ ترقی کا انتظار کر رہا تھا ترقی ہو گئی تو اسے فرم کی طرف سے بنگلہ ملے گا۔"

"وہ تمہیں کبھی بھی اپنے ساتھ نہیں رکھے گا، اس نے جو کچھ کہا ہے جھوٹ کہا ہے۔"

غنچہ کو اس بات کا یقین تو نہیں آیا مگر وہ روہانسی ہو گئی۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے، کیا اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہو سکتا ہے اگر ایسا ہوا تو وہ کہاں جائے گی۔ دُنیا اس پر تھوکے گی اور یہ اس کی ناساز طبیعت کا خالق ——— ہائے اللہ ———" وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ثریا اسے آنکھیں پھاڑ سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے پار کوئی بہر مری چیز دیکھ رہی ہو۔ غنچہ روتی رہی اور ثریا اسے اسی طرح دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"اب رونے دھونے سے کیا ہو گا۔ کس وقت آتا ہے وہ؟"

"شام کو"

"روز"

"تقریباً"

"بس تو آج ہی اسے ساری بات بتا دو۔ اگر شادی ہو گئی ہے تو اس سے کہو کہ اسی وقت تمہیں لے جائے اور نہیں ہوئی ہے تو اس سے

شادی کرے، سمجھیں۔"

"ہاں۔"

اس کے بعد باتوں کا سارا خزانہ جیسے خالی ہو گیا، دونوں کئی منٹ خاموش بیٹھی رہیں۔"اب چلوں گی" غنچہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ثریا نے کچھ نہیں کہا۔

"اچھا ثریا خدا حافظ" غنچہ کمرے سے باہر نکل گئی، ثریا خالی خالی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ مائی سے اس نے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ واپس جانا چاہتی ہے۔

"چلو۔" مائی نے مایوسی سے کہا۔ ابھی وہ بیٹی کے گھر جا کر نواسے کو کھلانے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا، پرائے بس کی بات تھی۔

واپس آ کر غنچہ شام تک بستر پہ یوں کروٹیں بدلتی رہی، جیسے انگاروں پہ لوٹ رہی ہو۔ ثریا کی بات کا یقین کرے یا اپنی آنکھوں اور کانوں کا اعتبار کرے۔ مگر پھر کیا بات ہے جو وہ ثریا کی بات کو جھٹلا نہیں سکی، اس پہ ہنس نہیں سکی اس کا مذاق نہیں اڑا سکی اور اس وقت بھی وہ کیوں انگاروں پہ لوٹ رہی ہے۔ کاش وہ ثریا کو پہلے اشارہ

دے دیتی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب وہ رحمان کے رحم و کرم پر تھی آج اسے رحمان سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنی تھی، آج اس کی زندگی کا فیصلہ ہونا تھا، آج کی شام پر بہت کچھ منحصر تھا۔ یہ داؤ وہ پورے زور شور کے ساتھ لگائے گی اس نے فیصلہ کیا۔

آج لیڈیز کلب کی میٹنگ بھی تھی۔ اس بہانے غنچہ نے وہ گلابی جوڑا پہنا جو شادی کے دن رحمان نے اسے تحفتاً دیا تھا۔ کانوں میں گلابی رنگ کے ٹاپس پہنے۔ پاؤں میں گلابی چپل اور ہلکی سی گلابی لپ اسٹک لگا وہ ان کمروں کی طرف چلی گئی جہاں بیٹھنے کا اور چائے کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ اس نے منتظم خواتین کے ساتھ برتن لگوائے، کھانے پینے کی چیزیں رکھیں۔ رفتہ رفتہ ممبر خواتین آنے لگیں۔ باتوں اور قہقہوں کے دور چلنے لگے۔ پھر بڑا سا ایک دائرہ بنا کر میوزک پر لڑکیاں اور عورتیں کرسیوں کے پیچھے بے حد تیز بھاگنے لگیں۔ جیسے ہی موسیقی بند ہوتی سب کرسی ہتھیانے کی فکر کرتیں۔ اس کھیل میں بعض عورتیں بوڑھی گھوڑی لال لگام بنی کھیل رہی تھیں۔ سیکرٹری نے غنچہ سے بھی شامل ہونے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ آج اس کا ذرا دل نہیں چاہ رہا تھا کسی چیز میں حصہ لینے کو۔ اس کے کان دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے کب چوکیدار یا مائی آکر کہے "آپ کے بھائی آئے ہیں۔" آج تو مائی بھی یہاں مشغول رہے گی اور وہ اطمینان سے رحمان سے باتیں کر سکے گی۔ لو ہے

کے پھاٹک کے پیچھے کسی پتلون پوش ٹانگیں دیکھ کر وہ باہر لپکی۔ ہو سکتا ہے رحمان نے گھر کے دروازے پہ آواز دی ہو اور کوئی شنوائی نہ ہوئی ہو تو وہ یہاں آگیا ہو۔ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ وہ رحمان ہی تھا۔

”اوہو آج تو غضب ڈھا رہی ہو۔“ رحمان نے پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”گھر کے دروازے پر چلو“ میں آئی“ غنچہ چپکے سے کھسک آئی اچھا ہوا اس نے ہی رحمان کو دیکھ لیا ورنہ اتنی عورتوں میں جانے کون کیا شک کرتی۔

اس نے دروازے کی کنڈی کھولی تو رحمان ہلکے قدموں سے اندر آیا اور کمرے میں پہنچنے کا انتظار کیے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

”شی، کوئی دیکھ لے گا“ وہ پرے سرک گئی۔

”اُف، تمہیں معلوم بھی ہے تم کتنی پیاری لگ رہی ہو، ان کپڑوں میں“ رحمان نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور غنچہ کھل اٹھی، اس کے مشن کا پہلا حصّہ کامیاب رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر جب وہ ذرا اطمینان سے بیٹھے تو غنچہ نے اس ادائے دلبری سے کہا۔“ اب ہمیں ساتھ کب رکھو گے؟“

”جب کہو، ابھی چلو“ خلاف توقع رحمان نے کہا۔ غنچہ گڑبڑا گئی۔ ابھی

اصل بات تو وہ کہنے بھی نہ پائی تھی۔

"میں مذاق نہیں کر رہی سچ کہہ رہی ہوں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا سچ کہہ رہا ہوں، بتاؤ کب چلو گی؟"

"اور میری نوکری؟" وہ باتیں جو وہ سوچ رہی تھی رحمان بہانے کے طور پر پیش کرے گا اُلٹی وہ خود پیش کرنے لگی۔

"بھاڑ میں ڈالو نوکری، مگر یہ بتاؤ اچانک تمہیں یہ خیال کیسے آیا پہلے تو تمہیں وہ گھر پسند ہی نہیں تھا۔"

"پسند تو اب بھی نہیں ہے مگر خیر۔"

"خیر کیا، کوئی خاص بات؟"

"ہاں" غنچہ شرم سے گلابی پڑ گئی۔

"کیا بتاؤ؟"

"بھئی تم خود سمجھ لو بتانے والی بات نہیں۔" اب تو غنچہ کے گال دہک کر لال انگارہ ہو گئے۔ رحمان چونک پڑا۔

"کوئی گڑبڑ ہے۔"

"ہاں"

"کب سے؟"

"بھئی پتہ نہیں دو مہینے صاف گزر گئے تھے مگر میں نے کوئی دھیان

ہی نہیں دیا کل صبح جب آئے ادہ اُلٹی تو ۔"

"کسی ڈاکٹر واکٹر کو دکھایا تم نے ؟"

"ارے واہ ابھی تک کسی کو شادی کا پتہ نہیں تو میں ڈاکٹر کو کیسے دکھاتی اور ضرورت بھی کیا ہے ایسے ہی نہیں پتہ چل جاتا کیا ۔"

"ارے ہاں ابھی تو شادی ہی کی کسی کو خبر نہیں، اس بات کا پتہ تو نہیں چلا کسی کو ؟"

"نہیں تو"

"ہاں ابھی کسی کو مت بتانا"

"مگر بات چھپی تھوڑی رہے گی اگر روز اسی طرح طبیعت خراب ہوئی ۔ جبھی تو میں کہہ رہی ہوں اب شادی کی بات بتانی پڑے گی اور ساتھ رہنا پڑے گا ۔"

"ہاں ہاں ۔ بھئی مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ ناچنے کو جی چاہ رہا ہے میرا بس چلے تو ابھی اُٹھا کر لے چلوں تمہیں ۔ کتنے دن میں چھٹکارا مل سکتا ہے ادارے سے ؟"

"پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا، اگر کل نوٹس دے دوں تو پندرہ دن بعد ۔"

"ہاں مگر ٹھہرو آج کیا تاریخ ہے، دس، پندرہ تاریخ کو نوٹس دو

اور بجلی کو تنخواہ لے کر چھٹی، میں بھی اتنے دن میں اس مکان کو کچھ ٹھیک کر لوں، باہر بیٹھنے کے لیے تھوڑا سا پردہ بنوانا ہوگا، لگے ہاتھوں سفیدی بھی کروالی جائے۔"

"کیا ضرورت ہے جب جلد ہی دوسرے مکان میں جانے کی امید ہے۔" غنچہ نے فوراً بچت کی سوچی۔

"جیسی تمہاری مرضی، ہو سکتا ہے پندرہ دن میں نیا مکان مل ہی جائے، بہت امید ہے اب تو"

اتنی آسانی سے معاملہ طے ہو جائے گا غنچہ کو امید ہی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ رحمان حجت بحث کرے گا تو اسے رو دھو کر منانا پڑے گا یا جانے ڈرانا دھمکانا پڑے گا۔ یوں ہی خواہ مخواہ ثریا نے اسے ڈرا دیا اور وہ بھی ایسی پاگل کہ اپنے نکاح کو بھی بھول گئی اور خواہ مخواہ کے شک میں گرفتار ہو گئی۔

"اچھا اب اسی بات پہ" آگے بڑھ کر رحمان نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "بھئی خدا کے لیے تم آئندہ یہ کپڑے نہ پہننا ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا سچ" غنچہ گردن میں ہونے والی گدگدی کی وجہ سے سر اِدھر اُدھر پھینک رہی تھی اور ہلکے ہلکے ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہنستے اس نے بڑی شوخی سے کہا "ایک بات اور ہے جی۔"

"فرماؤ"

"میرا نکاح نامہ کہاں ہے؟"

"کیا؟"

"نکاح نامہ۔"

"میرے پاس ہے کیا کرو گی؟ نکاح نامہ تو طلاق کے وقت کام آتا ہے کیا خطرناک ارادے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے" غنچہ نے رحمان کو غصّے سے دیکھا "بس میں یونہی دیکھوں گی۔"

"کل، نہیں کل تو شاید میں نہ آسکوں پرسوں لے آؤں گا۔"

"کل کیوں نہیں آؤ گے؟"

"بھئی ترقی کی بات ہے ذرا، کام دکھا رہا ہوں آجکل، اگر آسکا تو آجاؤں گا ورنہ پرسوں —— تم نے تو خوشخبری ایسی سنائی ہے کہ مزہ آگیا۔ منہ میٹھا کراؤ نا۔"

"تم کراؤ" غنچہ ہنسی۔

"تم آج کراؤ، کل ہم کرائیں گے۔"

"اچھا" غنچہ کو ایک اچھوتا خیال سوجھا۔ چوکیدار کے لڑکے کو اس نے مائی کے پاس بھیجا کہ دو پیالی چائے اور کھانے کو کچھ دے دے۔ اسے

معلوم تھا اتنی گڑبڑ میں مائی دو پیالی چائے اور تھوڑی سی مٹھائی ضرور بھیج سکتی ہے۔ ذرا ہی دیر میں لڑکا دو پیالی چائے مٹھائی اور پیپڑی لے کر آ گیا۔ چائے پی کر رحمان نے پوچھا۔

"اب جاؤں ؟" اکثر ایسے موقع پر غنچہ اور ٹھہرنے پر اصرار کرتی تھی مگر آج بڑی دھیرج سے کہا "ہاں، مجھے بھی جا کر عورتوں کے لیے چائے وائے بنانی ہے۔"

کلب کی طرف سے دھڑا دھڑ تالیاں پیٹے جانے کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی کھیل ختم ہوا تھا۔ رحمان رخصت ہو گیا تو غنچہ من ہی من میں مسکراتی بڑے ہلکے دل کے ساتھ کلب کی طرف چلی گئی جہاں عورتیں لپاک جھپاک چائے پینے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

(۱۳)

نجیب بالکل ٹھیک ہو کر واپس جا رہا تھا اس کی یونٹ بھی باقی فوج کی طرح ابھی سرحد پر ڈیرہ ڈالے پڑی تھی۔ گرمیوں کی جھلستی دوپہریں اور حبس بھری راتیں کیمپ میں گزارنے کے بعد اب وہ سردی کی کٹیلی لہریں سہنے کے لیے تیار تھا۔ ان چند ہفتوں میں جو اس نے یہاں گزارے تھے اس نے غم جاناں کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھ لی تھی مگر یقینی تھا کہ فوج کی کٹھن زندگی جو آگے اس کی منتظر تھی اس کا یہ چھوٹا سا تجربہ بہلانے میں معاون ہو گی۔ ابھی وہ زندگی کی اس منزل میں تھا جب کوئی بھی من موہنی صورت دل پر نقش ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر چند دن کی جدائی کے بعد وہ نقش بر آب ثابت ہو جاتی ہے ـــــ کسی دیرپا تاثر کے لیے ابھی عمر اور تجربے کی پختگی درکار تھی۔ لیکن ماجد کو برابر یوں محسوس

ہوتا تھا جیسے صحرا میں بھٹکتے اس نے نخلستان کی ایک جھلک دیکھی ہو اور اس کی طرف چلتے ہوئے وہ پھر راہ بھول گیا ہو۔ گل ابھی یہیں تھی۔ اس کا استعفے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گیا تھا۔ بریگیڈیر صاحب کا ارادہ ابھی چند دن یہاں آرام کرنے کا تھا اس کے بعد شادی کے لیے لمبی چھٹی لینے کا۔ ماجد نے عرضی دی تھی کہ اسے کسی ایسے اسپتال میں بھیج دیا جائے جو اس کے گھر کے نزدیک ہو تاکہ گھر والے گاہے بگاہے آکر اسے دیکھ سکیں۔ اس کی درخواست منظور ہو گئی تھی اور آج ہی نجیب کے ساتھ وہ بھی جا رہا تھا خیال تھا راستے میں نجیب اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ پھر اسٹیشن پر اس کی بہنیں آکر اسے لے جائیں گی۔ ابھی اس کو کئی مہینے اسپتال میں رہنا تھا کیونکہ زخم بھرنے کے بعد نقلی ٹانگ لگائی جا سکتی تھی اور ابھی زخم بھرنے کے لیے بھی ایک عرصہ درکار تھا۔

آج صبح سے گل ان کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ اپنے دائمی مریض سے خاص طور پر اس بات کی اجازت لے کر آئی تھی کہ آج آفیسر وارڈ میں ڈیوٹی دے، وہ چیزیں پیک کروانے میں ان کی مدد کر رہی تھی، اور ان دونوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جس چیز کو وہ ہاتھ لگا دیتی ہے وہ اپنی شکل بدل کر کسی اور ہی آسمانی اور غیر مرئی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ غسلخانے سے ان کا شیو کا سامان دھو کر لائی تھی تو انہوں

نے محسوس کیا تھا کہ اب وہ ساری عمر یہی شیور استعمال کریں گے، اسے پھینک دینے کا اب سوال ہی کیا رہ جاتا ہے۔ لیفٹیننٹ نجیب چل پھر سکتا تھا اس لیے وہ اپنے کپڑے وغیرہ خود رکھ رہا تھا، ماجد کی ہر چیز گل رکھ رہی تھی۔ درازوں سے کپڑے نکال کر اپنی مخروطی انگلیوں والے ہاتھ سے وہ کس خوبصورتی سے تہہ کر رہی تھی اور ماجد سوچ رہا تھا کہ اس کا بس چلے تو ان چیزوں کو یونہی پڑا رہنے دے کبھی نہ کھولے۔ واقعی کیا گل جیسی لڑکیاں بھی نرس بن جاتی ہیں! اب تک تو وہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ جن کو دنیا زمانے میں کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا، شادی وادی کا بھی کوئی امکان نہیں ہوتا نرس بن جاتی ہیں۔ کالی کالی، سوکھی سوکھی۔ ایک سے ایک اوربڑی سوبڑی۔ سسٹر صبیحہ گوری تھی مگر کیسی بے رونق جیسے چھلا شلغم جیسے دھلا انڈا، سسٹر لوپ گوری نہیں مگر توبہ ——— ہاں مگر گل ایسی کمبخت لڑکیوں کو نرسنگ سے کیا کام جو ٹھیک کرنے کے بجائے اور بیمار ڈال دیں، جن کی چال قیامت ہو، جن کا چہرہ فتنۂ محشر۔ جن کے جسموں کی آگ ہیں لوگ دور ہی سے سلگ سلگ کر جل جائیں۔ اچھا یہی ہوا جو اس نے یہ کام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا مگر غلط آدمی کا ساتھ دینے کے لیے۔ کاش وہ اس کی ٹوٹی ٹانگ نظر انداز کر سکتی۔

سارا سامان پیک کرنے کے بعد وہ تھوڑی دیر کو باہر گئی۔ واپس

آئی تو اس کے ہاتھ میں دو پیکیٹ تھے۔ یہ میری طرف سے آپ کے لیے ہیں۔ اس نے ایک ایک پیکیٹ دونوں کو دے دیا۔

"تھینک یو ــــــــ سسٹر، سو نائس آف یو۔" نجیب نے کہا۔

"تھینک یو گل۔" ماجد نے کہا۔ دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ہر ایک کو دوسرے کی موجودگی مانع تھی۔ دونوں پیکیٹ کھول کر دیکھنا چاہتے تھے مگر تذبذب میں تھے۔ اگر دوسرے کی چیز بہتر ہوئی تو خواہ مخواہ دکھ بھی ہوگا اور شرمندگی بھی۔ دونوں نے اپنے پیکیٹ اسی طرح ہینڈ بیگ میں رکھ دیے تاکہ موقع ملنے پر جلدی سے کھول کر دیکھ سکیں۔

اوپر کی منزل کے لوگوں کو خدا حافظ کہہ کر وہ نیچے چلے۔ نجیب کھٹ کھٹ کرتا سیڑھیاں اتر گیا۔ گل ماجد کی وہیل چیئر لے کر چلی۔ لفٹ کے چھوٹے سے بند کمرے میں ماجد نے گل سے اپنے سامنے کھڑے ہونے کی درخواست کی۔ "اس تحفے کو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا گل ــــ اس ہاتھ سے اگر زہر بھی مل جاتا تو میں ــــــ" اس نے گل کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا، ساتھ ہی دو موٹے موٹے قطرے ہاتھ کی پشت پر گرے۔

گل نے اپنی آنکھ میں چلے آنے والے موتیوں کو ذرا سی محنت سے نگل لیا۔ لمحے بھر کو وہ گلے میں اٹکے پھر پانی کی طرح نیچے چلے گئے۔ ہمدردی سے

اس نے ماجد کا ہاتھ تھپتھپایا۔

نیچے پہنچ کر وہیل چیئر اس نے میڈیکل آرڈلی کے حوالے کر دی اور خود ماجد کے برابر چلتی اسپتال کے بڑے دروازے تک آئی۔ اسپتال کا کچھ عملہ انہیں خدا حافظ کہنے آیا تھا اس میں سسٹر لوپ بھی تھی سسٹر لوپ نے وہیں باغ سے توڑ کر ایک ایک پھول دونوں کی نذر کیا۔

"ویل تم کو پھول بہت پسند ہے نا کیپٹن ؟" اس نے پھول دیتے ہوئے ماجد سے کہا۔ ماجد نے شکریہ ادا کیا اور گل کی طرف دیکھا "پھول میری زندگی ہیں سسٹر مگر میری زندگی سے بہت دور ہیں ۔" گل نے اپنی پلکیں جھکا لیں۔

"اوہ تم ، پتہ نہیں کیا پوئٹری بولتا ، ہم تمہاری بات کبھی نہیں سمجھ سکتا۔" موقع کی گھمبیرتا کو کم کرنے کا ایک بہانہ مل گیا۔ سسٹر لوپ کی بات پر سب زور سے ہنس پڑے۔ دونوں نے باری باری سب سے ہاتھ ملائے ، دونوں نے سب سے آخیر میں ہاتھ ملانے کے لیے گل کو چنا جیسے اس کے ہاتھ کا لمس وہ ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔ پھر وہ ایمبولنس میں بیٹھ گئے جو انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہی تھی۔ ایمبولنس چلنے کے بعد دونوں دور تک سب کو ہاتھ ہلاتے رہے اور پھر ایک موڑ پر نظروں سے غائب ہو گئے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق لوٹتے ہوئے سارا

عملہ انہیں بھول چکا تھا۔ سب اپنے آج کے مسئلوں پہ بات چیت کر رہے تھے، صرف گل خاموش تھی۔ وہ اپنے جیون ساتھی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ان دونوں جانے والوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

---

(۱۴)

دوسرے دن رحمان نہیں آیا۔ تیسرے دن غنچہ بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اسے کچھ شک تھا کہ اس دن جو معاملہ اتنی جلدی سلجھ گیا تھا تو اس میں اس کے کپڑوں اور بننے سنورنے کا بھی کچھ ہاتھ ضرور تھا۔ چنانچہ آج بھی اس نے بننے ٹھننے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے اس نے شام کو ثریا سے مل آنے کا پروگرام بنایا، شربتی رنگ کا سوٹ نکال کر پہنا، خوب دھیان سے بال بنائے، جوتے بدلے، مہین، خوشبو لگا تیار ہوئی اور بہت دیر ہو جانے کا بہانہ کر کے جانا ملتوی کر دیا اور رحمان کا انتظار کرنے لگی۔ آج وہ نکاح نامہ اپنے قبضے میں کر لے گی اور لیجا کر ثریا کو دکھلائے گی ظاہر ہے اسے رنج تو ہوگا کہ اس سے وعدہ کر کے اس نے غنچہ سے سچ مچ شادی کر لی مگر اب وہ کیا کر سکتی ہے۔ اگر ثریا پہلے بتا دیتی

تو وہ اس کی خاطر رحمان کو یقیناً ٹھکرا دیتی مگر اب تو وہ اس کی بیوی
بن چکی ہے اور حالات ابھی اتنے نازک ہیں کہ وہ ثریا کی طرف سے ایسی
سے جواب دہی نہیں کر سکتی۔ رحمان شرمندہ ہوگا ممکن ہے ثریا کو جھٹلا
اور اسے ثریا سے ملنے کو منع کر دے۔ بات زیادہ بڑھ گئی تو دل برائی
بھی ہو سکتی ہے بہرحال ابھی موقع نہیں تھا یہ بتلانے کا کہ وہ ثریا کو شادی
کا بھید بتا چکی ہے یا ثریا اسے کسی راز سے آگاہ کر چکی ہے۔ امریکن لائبریری
میں شاید کوئی فلم تھی، لڑکے لڑکیاں تنگ کپڑے پہنے جوق در جوق جا
اندر جا رہے تھے۔ ان کے کپڑے اور اونچے اونچے بالوں کی وضع دیکھنے
میں کچھ دیر کو وہ رحمان کو بھول گئی۔ پھر سامنے کتابوں کی دوکان میں
جانے والے امریکن مرد عورتوں نے توجہ اپنی طرف کر لی۔ خاصی دیر گھومتی
رہی اور چیزوں کی طرح یہ لوگ کتابیں بھی خوب فراخدلی سے خریدتے ہیں
اس نے کتابوں کے ایک دوکاندار کو کہتے سنا تھا کہ یہ لوگ 'ویک اینڈ'
کے لیے باقاعدہ کتابیں خریدنے آتے ہیں جس میں گھر کے تمام چھوٹے
بڑے ممبر شامل ہوتے ہیں جب کہ پاکستانی حضرات سال میں ایک دفعہ
بھی اس شد و مد سے کتابیں خریدنے کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ کتابیں
ہی تو ہمارے ملک میں ایک ایسی چیز ہیں جن کو مانگتے ہوئے بڑے
سے بڑا اور امیر سے امیر آدمی نہیں شرماتا۔ بہت سے لوگ کسی کے گھر

جاکر پانی کا ایک گلاس مانگتے ہوئے ہچکچاتے ہیں مگر قیمتی کتاب یہ کہہ کر بلا جھجک اُٹھا لیتے ہیں کہ پڑھ کر واپس کر دیں گے۔ اس نے کتابوں کی دوسری دوکان پر جہاں ہر وقت مفت اخبار اور رسالے پڑھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی واضح الفاظ میں لکھا ہوا دیکھا تھا " یہ دوکان ہے لائبریری نہیں ہے " مگر اسی بورڈ کے سائے میں کھڑے لوگ گھنٹوں اخبار پڑھتے تھے۔ امریکن مرد عورتیں کتابوں کے بنڈل لے کر دوکان سے نکلے تو اسے کچھ افسوس سا ہوا کہ اس کی دوکان بند تھی ورنہ شاید وہ اس طرف بھی آتے۔ وہ لوگ دوسری دوکانوں کی طرف چلے گئے۔ ان کی طویل و عریض گاڑیاں دوکان کے پاس کھڑی تھیں۔ وقت کاٹنے کو انہیں ہی دیکھنے لگی۔ پچھلے شیشے کی طرف کیمرے، تھرماس اور رسالے بے پروائی سے پڑے ہوئے تھے۔ اکثر وہ کاریں کھلی ہی چھوڑ جاتے تھے۔ دو کاروں میں سے کتّے لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے اور گول گول آنکھوں سے راہگیروں کو تک رہے تھے۔ اُف وہ ان کتوں کی ایسی قسمت! وہ رشک سے جل اُٹھی۔

ان خیالات سے چونکی تو اسے احساس ہوا کہ رحمان کے آنے کا وقت کب کا نکل چکا ہے۔ پھر بھی وہ انتظار کرتی رہی ہو سکتا ہے دیر ہو گئی ہو۔ پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ وہ دیر سے آیا تھا اور آج کل تو بقول اس کے

وہ کام دکھا رہا تھا۔ آخر نو بجے تک اس کا انتظار ناامیدی میں بدل گیا،
ہو سکتا ہے کام کی وجہ سے نہ آسکا ہو غنچہ نے اپنے دل کو تسلی دے
لی مگر جب چوتھا، پانچواں اور چھٹا دن بھی صاف گزر گیا تو غنچہ کا انتظار
پریشانی اور پھر تشویش میں بدل گیا۔ پندرہ تاریخ آگئی تھی۔ اسے استعفیٰ
دینا تھا ادھر رحمان نے نہ آنے کی قسم کھالی تھی۔ اس نے استعفیٰ تو نہ دیا
مگر سارا دن رحمان کا انتظار کرتے کرتے جیسے اس کا انگ انگ دکھنے
لگا۔ آج کسی بات میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا، نہ خریدار عورتوں
میں نہ لمبی کاروں میں اور نہ کالج کے لڑکیوں لڑکوں میں۔ دل میں رہ رہ
کر ہوک سی اٹھ رہی تھی، اور ہر چاپ پر دل دھڑک رہا تھا جیسے آج
رحمان پہلی مرتبہ اس سے ملنے آرہا ہو۔ آخر رات کے دس بجے آج کی
آس بھی دم توڑ گئی۔ وہ رات اس کی زندگی کی بے چین ترین رات تھی
جیسے بستر میں کانٹے بچھے ہوئے ہوں۔ جدھر کروٹ لیتی بے چینی اور
بے آرامی۔ آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ وہ رات کاٹے
نہ کٹ رہی تھی۔ کیا وہ راتیں بھی اتنی ہی لمبی ہوتی ہیں جو سونے میں
گزر جاتی ہیں۔ آج غنچہ حیران تھی۔ روز تو تھک ہار کر لیٹو تو یوں معلوم
ہوتا تھا کہ ابھی آنکھ لگی کہ مرغ بانگ دینے لگے اور آج مرغے اور
کتے جیسے سب مر گئے ہوں صرف گلی کے کتے تھے جو بھونک بھونک

کر اس کی نیند اڑائے دے رہے تھے۔ (روز جو وہ پیر پھیلا کر سوتی تھی تو کیا یہ کتے یونہی بھونکتے رہتے تھے؟)

خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو رات بھر کی بیداری نے اس کا حلیہ خراب کر دیا تھا ادھر چکر اور متلی نے آ گھیرا۔ آخر بائی کے اٹھانے پر اس نے اعلان کر دیا کہ اس کی طبیعت خراب ہے نہ وہ لڑکیوں کے ساتھ تیرنے جا سکتی ہے نہ روز کے وقت پر دوکان کھول سکتی ہے، اگر طبیعت سنبھل گئی تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ چائے پی کر کچھ طبیعت سنبھلی تو کروٹیں بدلتے بدلتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو بھری دوپہریا تھی۔ دھوپ سفید چادر کی طرح صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بے دلی سے تیار ہوئی دوکان کھول خریداروں نے محسوس کیا کہ اس میں اس پہلی پھرتی کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ کوئی سوئی مانگتی تو وہ سلائیاں پکڑا دیتی۔ چیزوں کی قیمتیں جو اسے ازبر تھیں آج بار بار بھول رہی تھی۔ ادارے میں کام کرنے والی عورتوں کے جاتے ہی اس نے دوکان بند کر دی اور بائی سے کہا کہ وہ ذرا ڈاکٹر کے پاس دوا لینے جا رہی ہے۔ اب تھوڑے دنوں سے وہ بائی کے ساتھ جانے کے بجائے صرف اسے اطلاع دے کر چلی جاتی تھی۔ ادارے میں آنے کے بعد سے اس نے رحمان کے کہنے پر برقع میں باہر جانا شروع کر دیا تھا۔ برقع اوڑھ کر وہ باہر نکلی اور لڑکھڑاتی

قدموں سے سڑک پر ہولی۔ ادارے کی دوسری طرف پہنچ کر اس نے رکشالی اور رحمان کے گھر کا رخ کیا۔ اگر رحمان بیمار نہ ہوا تو وہ آج اس سے دو دو ہاتھ کر ہی لے گی۔ اس نے دل ہی دل میں طے کیا نکاح نامہ تو وہ اپنے ساتھ لے کر ہی آئے گی اس کے علاوہ اس بات کا دو ٹوک فیصلہ بھی کرے گی کہ ....

.... رحمان اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔ سیدھی انگلیاں گھی نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہیں ضرورت پڑی تو وہ ثریا کی بات بھی اگل دے گی اور ڈرائے دھمکائے بغیر بھی نہ چھوڑے گی۔

یہ دیکھ کر غنچہ کو بڑا اطمینان ہوا کہ گھر کے باہر تالا لگا ہوا نہیں تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے پہلے آہستہ سے پھر زور سے کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔ وہ خاموش رہی ذرا دیر اندر بھی خاموشی رہی، پھر جیسے کوئی بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور چپل گھسیٹتا دروازے کی طرف چلا۔ غنچہ کو پھر موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اگر کوئی گڑ سے مر جائے تو اسے زہر دینا مناسب نہیں۔ اس نے نقاب الٹ کر چہرے پر بڑی دلنواز سی مسکراہٹ بکھیر لی مگر —— وہاں رحمان کے بجائے کوئی اور مرد کھڑا تھا۔

"رحمان صاحب ہیں؟" غنچہ نے اب نقاب ڈالنی بے کار سمجھی صرف مسکراہٹ سمیٹ لی۔

"جی نہیں ہیں"

"کہاں گئے ہیں؟"

"سوڈان"

"کہاں؟"

"سوڈان"

غنچہ کی ذرا سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس جگہ کا نام لے رہا ہے۔

"کب آئیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"پانچ سال بعد۔"

"جی" غنچہ گڑبڑا گئی اور دوبارہ اس جگہ کا نام پوچھا جہاں رحمان گیا ہے۔

وہ شخص مسکرایا اور بولا "معاف کیجئے میرے پاس اٹلس نہیں ہے یہاں پاس ہی کتابوں کی دوکان میں مل جائے گی دیکھ لیں، افریقہ میں ایک ملک ہے۔"

افریقہ! کیا بک رہا ہے یہ شخص، پاگل ہو گیا ہے۔ غنچہ غصّے میں جھنجھلائی۔ پھر بھی اپنا مطلب تھا، غصّہ دکھانا بے معنی تھا اور معلومات

کرنی ضروری۔

"کب گئے اور اتنے اچانک کیسے چلے گئے؟"

"اتنے اچانک تو نہیں گئے، کئی مہینے سے ان کے جانے کا امکان تھا، تیاری بھی ہو رہی تھی، بارہ تاریخ کو ان کو جانا تھا اور بارہ ہی کو وہ گئے ہیں۔"

اگر غنچہ کے دل میں یہ شک نہ ہوتا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے تو وہ ضرور وہیں گر کر بے ہوش ہو جاتی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ کوئی نہایت نامعقول شخص ہے جو محض اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ ابھی اندر سے رحمان نکل آئے گا اور اسے پریشان دیکھ کر خوب ہنسے گا۔ دروازے کی آڑ سے اسے رحمان کی میز کرسی، پلنگ یہاں تک کہ کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑے صاف نظر آ رہے تھے۔

"آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہیں رہتا ہوں" اب تو غنچہ کو اس کے جھوٹ کا یقین ہو گیا کیسا کمبخت جو تیوں سمیت آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ غنچہ پانچ دن یہاں رحمان کے ساتھ رہ کر گئی ہے۔ دل تو چاہا کہ غصے میں یہ بات جوتے کی طرح پھینک کر اس کے منہ پر دے مارے مگر وہ کچھ سوچ کر پی گئی۔ ایک قدم آگے بڑھا کر اس نے کڑے تیوروں سے

پوچھا "آپ ہیں کون؟" وہ چاہتی تھی کہ رحمان اگر اندر ہے تو اس کی آواز سن لے، نہیں تو وہ خود ہی آگے بڑھ کے دیکھ لے کہ وہ ہے یا نہیں، کیوں اس بیہودہ کے منہ لگے۔

وہ شخص اس کے سوال کے جواب میں بڑی فراخدلی سے مسکرایا اور بولا "سچ بتاؤں؟"

"جی ہاں" غنچہ سنبھل کر سنجیدہ ہو گئی۔ شاید رحمان واقعی اندر نہیں تھا۔

"میں ہوں ——— مولوی صاحب"

"جی" غنچہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مولوی صاحب، جنہوں نے آپ کا اور رحمان کا نکاح پڑھایا تھا یقین نہ ہو تو ابھی داڑھی نکال کر دکھا دوں، اندر آجائیے۔ دیکھیے نا پانچ سال تو بہت ہوتے ہیں کیا واقعی رحمان آپ کو بتا کر نہیں گیا یہ تو بہت زیادتی ہے میں اس کی جگہ ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتا۔"

غنچہ دھڑام سے کمرے کی چوکھٹ پر گری۔ شکر ہے کہ اس وقت گلی سنسان تھی۔ لشتم پشتم اسے اٹھا کر پلنگ پر ڈالنے کے بعد وہ شخص یہ سوچ کر گھبرا گیا کہ اب کیا کرے۔

ثریا کو وہ رحمان کی بہن کی حیثیت سے جانتا تھا، دو ایک دفعہ وہ یہاں آئی تھی اور اس کے لیے دبے انداز سے وہ اسے رحمان کی

بہن ہی سمجھا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ رحمان کی معیبت اس کی بہن کے حوالے کرے۔ جلدی سے کپڑے بدل کر اور باہر تالا لگا کر وہ بھاگم بھاگ ثریّا کے ہاسٹل پہنچا اور اسے صورت حالات سے آگاہ کیا۔ ثریّا نے جا کر پرنسپل کو بتایا کہ غنچہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور اسے فوراً بلایا ہے۔ ان سے اجازت لے کر وہ رحمان کے مکان پر پہنچی جہاں غنچہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی زار و قطار رو رہی تھی۔ ثریّا نے اسے تسلی دی مگر اسے کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ کیا شکل لے کر ادارے میں جائے گی اور وہاں سے وہ آوارہ عورتوں کی طرح دھتکار کر نکال دی جائے گی۔ پھر در در کی بھیک مانگنے کے سوا اس کے لیے کیا چارہ ہے۔ وہ روتی رہی اور اس کے ساتھ ثریّا بھی روتی رہی۔ ان کے سامنے وہ نیلا ایروگرام پڑا تھا جو رحمان کے واقعی سوڈان چلے جانے کے ثبوت میں اس کے دوست نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس کے ٹکٹ پر ایک سوڈانی جولاہے کی تصویر تھی جو کرگھے پر کپڑا بنا رہا تھا۔ انگریزی میں ائیر لیٹر کے برابر ہی "خطاب جمہوری" چھپا ہوا تھا، اور ساری ہدایات انگریزی اور عربی میں چھپی ہوئی تھیں۔ غنچہ نے سارا خط نہیں پڑھا تھا مگر پر پھیلائے پڑے ہوئے ایروگرام کی تحریر وہ خوب پہچانتی تھی اور اس پر پڑی ہوئی

"الحصاحیصہ" کی مہر بڑی بے دردی سے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ ثریا نے
یہ خط پورا پڑھا تھا جو بے تکلفی اور روا روی میں لکھا گیا تھا۔ اس سے
نہ صرف یہ معلوم ہو گیا تھا کہ رحمان واقعی سوڈان چلا گیا ہے بلکہ اس کے
پانچ سال تک نہ لوٹنے کی بات کی بھی تصدیق ہو گئی تھی کیونکہ اس نے
لکھا تھا " پانچ سال یہاں رہا تو یہ بھول جاؤں گا کہ اُردو زبان کس
چڑیا کا نام ہے، یہاں تو مستقل فرشتوں کی زبان سے سابقہ ہے " ؟
آگے لکھا تھا :- آجکل ٹمپریچر ۱۰۷ ہے۔ سُنا ہے گرمی میں باقاعدہ گرمی
ہوتی ہے اور صرف ۱۲۵ تک پارہ چڑھتا ہے، ۱۳۵ کی بھی خبر سُنی گئی
ہے۔ ان اعداد و شمار کو کاغذ پر دیکھ کر ہی پسینہ آجاتا ہے بہرحال اب
اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل کا کیا ڈر، خرطوم سے کم و بیش سو میل کے
فاصلہ پر یہ جگہ واقع ہے۔ بالکل ویران بیابان، دور دور تک چڑیا کا بچہ
نظر نہیں آتا، قریب ترین آبادی " الحصاحیصہ" گاؤں ہے جو دریا پار گیارہ
میل ہے۔ ریلوے اسٹیشن فیکٹری سے دو میل دُور ہے اور اس کی راہ میں
نیل حائل ہے جس پر کوئی پل نہیں۔ فیکٹری کی پاور بوٹ دریا پار کرا دیتی ہے
یہ گویا دریا برد کرنا ہوتا ہے کیونکہ ایک بار ادھر آنے کے بعد البا لگتا ہے
جیسے دنیا سے الگ ہو گئے۔ وہ تو خیریت ہے کہ اوّل تو فیکٹری نہایت
خوبصورت اور جدید ترین وضع کی ہے پھر کالونی اس سے بھی عمدہ۔ رہنے

کے لیے نہایت عمدہ ائر کنڈیشنڈ اور فرنشڈ ہیں صرف وہ جنس گراں دور دور نہیں ملتی جس کے بغیر تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا گزارہ نہیں۔ خیر وہ مسبب الاسباب ہے کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ وہاں کی سفید معشوقائیں یاد آتی ہیں مگر یار تم جانتے ہو برف کے ساتھ ٹھنڈک اور کوئلے کے ساتھ تپش کا تصور غلط نہیں۔ ہماری معشوقائیں ملیں تو سلام کہنا ــــــ تمہارا رحمان۔

آخر ثریا نے کچھ فیصلہ کر لیا۔ اس نے غنچہ سے کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جائے اور اس کی واپسی کا انتظار کرے۔ غنچہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ثریا کرنا کیا چاہتی ہے۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل ماؤف تھا اور ثریا کی مدد کے بغیر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ثریا اس شخص کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ غنچہ کا سامان لیے واپس آئی۔ اس نے غنچہ کی یک لخت بیماری کی اطلاع ادارے میں دی اور انہیں بتایا کہ وہ اسے لے کر اس کے گاؤں جا رہی ہے۔ پھر وہیں بیٹھ کر اس نے ایک خط لکھا، لفافے میں بند کر کے اوپر پتہ لکھا اور غنچہ کے حوالے کیا: "تم اس پتے پر لاہور چلی جاؤ۔ ڈاکٹر تمہاری پوری دیکھ بھال کریں گی تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" پتہ اس نے اچھی طرح زبانی بھی سمجھا دیا، پھر اس نے اس شخص کی طرف دیکھا جو سر جھکائے ایک طرف بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اور تحکمانہ لہجے میں بولی: "تم غنچہ کو لاہور والی گاڑی میں بٹھا آؤ۔ کوئی ایسی ویسی

حرکت نہ ہو، ورنہ یاد رکھو وہ کمینہ نکل گیا مگر تم ابھی موجود ہو۔"

وہ آدمی سر جھکائے جھکائے بولا "آپ کیوں شرمندہ کرتی ہیں، آپ جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں، میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس میں میری کوئی غلطی نہیں۔ رحمان نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ صرف ایسی ویسی عورتوں کو لاتا ہے۔ جب اس نے شادی کا ڈھونگ رچایا ہے میں گھر گیا ہوا تھا، مجھے تو یہ قصہ بعد میں ان لوگوں نے بتایا تھا اور میں نے یونہی ——— مذاق میں مولوی صاحب والی بات کہہ دی تھی، دراصل وہ کوئی اور لڑکا تھا ——— میں یہ بات کہنے پہ سچ مچ بے حد شرمندہ ہوں" اس نے آخری جملہ غنچہ کی طرف دیکھ کر کہا مگر غنچہ نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔

"بس ٹھیک ہے تم انہیں لاہور والی گاڑی میں بٹھا کر مجھے ہاسٹل میں اطلاع دینا" "سجاد جاکر ٹکٹ لے آؤ۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ غنچہ نے ثریا کی طرف دیکھا وہ زرد ہو رہی تھی شاید اس پہ پرانی بیماری کا حملہ ہوا تھا۔

"میں اس آدمی کے ساتھ نہیں جاؤں گی، میں اب کسی مرد پہ اعتبار نہیں کر سکتی کسی پہ بھی نہیں۔"

"اچھا، میں تمہارے ساتھ چلوں گی" ثریا نے کہا، اور تکلیف سے

دانتوں کو بھینچے بیٹھی رہی۔ دونوں راستے بھر خاموش رہیں۔ غنچہ کا ٹکٹ خریدنے کے بعد اس نے کچھ روپے زبردستی غنچہ کے پرس میں ڈال دیے۔ اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد وہ بولی "غنچہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اب میں جاؤں گی۔"

غنچہ اس کے گلے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، مارے رِقّت کے وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی، اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا صرف اس کے گلے سے لگی روتی رہی۔ ثریا نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی سے اُتر کر بغیر پیچھے دیکھے پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ اس وقت غنچہ کو اندازہ ہوا کہ ثریا کی طبیعت بہت خراب ہے اپنی پریشانی میں اس نے ثریا کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی اور ایسی حالت میں اسے یہاں تک گھسیٹا تھا، اس کا دل چاہا گاڑی سے اُتر کر بھاگتی ہوئی جائے اور اس فرشتہ صفت عورت کے قدموں میں گر پڑے مگر وہ وہیں بیٹھی صرف خاموشی سے روتی رہی۔

"ذرا سنیے" کسی کی آواز آئی غنچہ نے پلٹ کر دیکھا۔ کھڑکی سے لگا وہی رحمان کے کمرے والا شخص کھڑا تھا۔ غنچہ نے منہ پھیر لیا۔

"میں معافی مانگنے آیا ہوں، میں اپنی حرکت پر سخت نادم ہوں، سمجھ میں نہیں آتا ایسے وقت میں وہ بات میری زبان سے کیوں نکل گئی،

میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔"

"چلے جائیے آپ، میں آج کے بعد دُنیا کے کسی مرد کو معاف نہیں کر سکتی۔" غنچہ نے نفرت سے کہا۔

گاڑی کھسکنے لگی۔ وہ لڑکا پیچھے ہٹ گیا اور چپ چاپ کالے برقع کے ہالے میں اس گیہواں چہرے کو تکتا رہا جس پر لمبی اور بھیگی پلکوں کی ریشمی جھالر پڑی ہوئی تھی، گہری کالی بھنوؤں کی کمانیاں کھنچی ہوئی تھیں اور گلابی ہونٹ بھنچے ہوئے تھے نامعلوم رنج سے یا غصّے سے۔

---

(۱۵)

گل کو اب بھی کبھی کبھی اپنی زندگی پر خواب ہی کا گمان گزرتا۔ جب صبح کے وقت دروازہ کھٹکھٹا کر بیرا چائے لے کر آتا تو گل نیم بیداری کے عالم میں سوچتی کیا یہ دستک اور یہ بھاپ اڑاتی چائے حقیقت ہے ؟ یہ فوم کا نرم گدا، پلش کی نرم گرم سرخ چادر، گرم چائے اور سب سے بڑھ کر اپنا وقت ——— وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ کیا اس پر اکڑی ہوئی وردی پہن کر وقت پر اسپتال پہنچنے کی پابندی نہیں ؟ کیا واقعی وہ جب تک چاہے اس چوڑے بیڈ پر پڑی اینڈتی رہے۔ صرف یہ بات آزمانے کے لیے اور شعوری طور پر اس سے محظوظ ہونے کے لیے وہ خواہ مخواہ ہی بستر پر پڑی رہتی۔ پھر سنتی کسی کا فون آیا ہے۔ اردلی کہہ رہا ہے۔ "بیگم صاحب ابھی سو کر نہیں اٹھیں، جی نہیں، اٹھانے کا آرڈر نہیں ہے۔"

آپ تھوڑی دیر بعد پھر فون کر لیں۔"

"جی نہیں اٹھانے کا آرڈر نہیں ہے۔" گل یہ سن کر بڑی فراخدلی سے مسکراتی۔ یہ اس کے میاں کا حکم تھا کہ جب تک وہ خود سو کر نہ اُٹھے اسے کسی طرح پریشان نہ کیا جائے۔ اتوار کے دن وہ خود جلدی اُٹھ جاتے تھے ایک عمر کی عادت تھی علی الصبح اُٹھنے کی، وہ چاہتے بھی تو دیر تک سونا یا بستر پڑے کروٹیں بدلنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ وہ اپنی حسین بیوی کو جوانی کے بے سدھ نیند میں چھوڑ کر چپکے سے بستر سے نکل جاتے تھے اور صبح کے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اخبار لے کر بیٹھ جاتے تھے۔

"کس کا فون ہے خان؟" گل اندر سے ہی پکارتی۔

"جی اسپتال سے کوئی سسٹر بول رہی ہیں۔"

"اچھا یہاں لے آؤ۔" فون بستر پہ آ جاتا اور وہ اس پہ لوٹ لوٹ کر انگریزی پکچر کی ہیروئن کے انداز میں اپنی پرانی سہیلیوں سے باتیں کیا کرتی۔ پھر اطمینان سے چینی شنگھائی کا گاؤن پہن کر اُٹھتی۔ پہلے گرما گرم ناشتہ کرتی اور پھر فراغت سے تیار ہو کر سوچتی کہ اب کیا کیا جائے۔ شادی کے بعد سب سے پہلا اہم کام اس نے یہ کیا تھا کہ کار چلانی سیکھ لی تھی۔ کار چلانی اس کی زندگی کی ایک بڑی تمنا تھی یہ تمنا پوری ہوئی تو اس نے ارد گرد دیکھ کر اور بہت سی باتیں سیکھنے

کی ٹھانی۔ بریگیڈیر شمسی اس کی ہر بات پہ نہ صرف صاد کرتے تھے بلکہ
دل سے خوش ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے لوگ یہ نہ کہیں کہ ان کی
بیوی نری نرس ہے جس کو اپنے آرام کی خاطر وہ بیاہ لائے ہیں۔
تیمارداری کے ساتھ اگر وہ واقعی بریگیڈیر کے قابل بیوی بن سکے تو
اس سے اچھی اور کیا بات ہے۔ ان کو دل کا دورہ پھر نہیں پڑا تھا
مگر مکمل آرام ان کے لیے ضروری تھا اسی لیے شادی کے بعد وہ
کہیں باہر نہیں گئے تھے۔ گل ان کی خوراک اور آرام کا پورا خیال
رکھتی تھی اس لیے دوپہر کو وہ ان کے سونے کا مشورہ دے کر کار
لے کر باہر نکل جاتی تھی۔ کبھی شاپنگ کرلی، کبھی چینی یا ایرانی ہیئر ڈریسر
سے نئی وضع کے بال بنوا لیے، کبھی میک اپ کی کسی مشہور کمپنی کی
ایجنٹ خاتون سے میک اپ کرنا سیکھ لیا۔ ان چیزوں سے دل بھرا
تو اس نے انگریزی رقص سیکھنے جانا شروع کر دیا۔ اپنے روزمرہ کے
ایڈونچر کی داستانیں وہ مزے لے لے کر میاں کو سناتی اور وہ بڑے
شوق سے سنتے۔ کسی چیز کی یونہی چلتے پھرتے تعریف کر دیتی تو وہ اس
کے خرید لینے پر اصرار کرتے۔ عجلت سے رقص سیکھنے کے لیے انہوں
نے اسے چند ریکارڈ بطورِ خاص خرید کر دیے تاکہ وہ گھر میں ان کے
ساتھ پریکٹس کر سکے، وہ خود تو بہت جلد تھک جاتے مگر خیر گل کو کچھ

نہ کچھ مشق ہو ہی جاتی۔ شام کو وہ اسے کلب لے جاتے۔ جہاں ان کی طبیعت اور چھینے کے بہانے اچھا خاصا جمگھٹا لگ جاتا۔ کچھ لوگ ان سے باتیں کرتے اور چند مصاحب نما گل کی ہر سنجیدہ بات پہ زور زور کے خوشامدانہ قہقہے لگا کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ گل بھی سب سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی۔ احتیاط کی جو ردا اسپتال میں کام کرنے کی وجہ سے اس نے اوڑھ رکھی تھی اب اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میاں کی موجودگی میں ہر شخص سے خوش مزاجی سے بات کر لینا محض خوش اخلاقی ہی تو ہے! بریگیڈیر شمسی کو برج کا شوق تھا۔ شادی کے بعد جب ان کے گھر میں یہ بیٹھکیں شروع ہوئیں تو مجبوراً گل کو برج بھی سیکھنی پڑی کیونکہ لوگوں نے اسے بتایا کہ اگر وہ خود نہیں کھیلے گی تو کئی کئی گھنٹے یقیناً بور ہو گی۔ پھر کبھی کبھی یوں بھی ہونے لگا کہ بریگیڈیر شمسی تھک کر ہاتھ کھینچ لیتے صوفے پر دراز ہو جاتے اور گل کھیلے جاتی۔ کبھی نیند کا بہت غلبہ ہوتا تو وہ چپ چاپ اٹھ کر سونے کے کمرے میں چلے جاتے اور گل ربر پورا کرنے کے بعد سب کو رخصت کر کے چپکے سے آ کر سو جاتی گل کے بہت جلد برج سیکھ لینے کی تعریف ہونے لگی۔ بعض اسے بتاتے کہ جتنی عمدہ کار وہ چلاتی ہے کم ہی عورتیں چلا سکتی ہیں۔ بعض

سمجھتے کہ جس خوبصورتی اور وقار سے وہ رقص کرتی ہے وہ بہت کم پاکستانی خواتین کو نصیب ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے کپڑوں کے رنگ، بالوں کے اسٹائل اور میک اپ کی تعریف ہوئی پھر ہمت بندھی تو لوگ اس کے جسم اور اس کی آنکھوں کی تعریف بھی کرنے لگے۔ ایسے موقعوں پر گل ہنس کر ٹال جاتی، اور ایک خاص ادا سے بار بار استدعا کرتی کہ موضوع بدل دیا جائے۔

دھیرے دھیرے ہلکی ورزش کے طور پر بریگیڈیر شمسی نے گالف کے چند "ہول" کھیلنے شروع کیے تو گل بھی ان کے ساتھ جانے لگی۔ وہ چھوٹے سے ٹیلے پر جسے "ٹی گراؤنڈ" کہتے ہیں چڑھ کر کلب سے گیند کو مارتے تو گل انہیں بغور دیکھا کرتی، پھر وہ دونوں گیند کی طرف چلتے، پیچھے کیڈی کندھے پر کلب کا تھیلا لیے آتا۔ سو دو سو فٹ چل کر جہاں گیند پڑی ہوتی وہ ٹھہر جاتے، بریگیڈیر ناپ تول کر مناسب کلب مانگتے پھر گیند پر ضرب لگائی جاتی اور پھر وہ گیند کی تلاش میں آگے چل دیتے۔ تین چار ضربوں کے بعد گیند گھاس کے اس دائرے میں آجاتی جسے "گرین" کہا جاتا ہے، جس کے بیچ میں ایک سوراخ ہوتا ہے جہاں نشان دہی کے لیے ایک جھنڈا گڑا ہوتا ہے۔ اس سوراخ میں گیند ڈال دینے کے بعد ایک منزل پوری ہو جاتی اور وہ دوسرے "ہول"

کھیلنے کے ٹیلے یعنی "ٹی گراؤنڈ" پر چل دیتے۔ ساتھ چلتے چلتے گل کو بھی شوق ہوا اور دوسرے دن سے،
اس نے کلب کی عمارت کے باہر جالی پر مشق شروع کر دی۔ گل کے اس اقدام کو بہت لوگوں نے،
سراہا۔ اسکو بہترین ضرب سکھانے کیلئے اپنی خدمات مفت پیش کرنے لگے اور ایک ڈیڑھ
ہفتے کی مشق کے بعد گل نے بھی اپنے میاں کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ بھاری
کپڑوں میں چلنا بھی دو بھر تھا اور ہاتھ پوری طرح جھلائے نہیں جا سکتے
تھے جو اچھی اسٹروک کے لیے بہت ضروری ہے اس لیے گل نے شوخ
رنگوں کی چند جینز اور بلاؤز سلوا لیے۔ آہستہ آہستہ یہ بات پھیلنے لگی کہ
گالف کے سبزہ زار آجکل رنگین چست کپڑوں والی کسی پاکستانی سیم تن
کے دم سے آباد ہیں۔ بہت سے لوگوں نے محض دوسروں کے
دیکھا دیکھی اور کھیل چھوڑ کر گالف کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔
گالف ایکا ایکی بے حد مقبول ہو گیا۔ ممبر شپ بے تحاشہ بڑھنے لگی۔
بات ان عورتوں تک بھی پہنچی جن کے میاں تنہا کھیلنے آتے تھے۔
ان عورتوں نے بہانوں سے یا چوری چھپے اس حسینہ کو دیکھا اور جل کر
کباب ہو گئیں۔ ایسی عورت سے کون بیوی خار نہ کھائے گی جو نازک
ہو، حسین ہو، کم عمر ہو، رنگین جینز پہنتی ہو، بغیر دوپٹے کے پھرتی ہو
بالوں کے پہاڑ سجاتی ہو، مردوں کے مجمع میں اکیلی بیٹھی قہقہے لگاتی
ہو اور جس کا میاں بڈھا ہی نہیں اتنا کاٹھ کا الو ہو کہ سب کچھ چپ چاپ

بیٹھا دیکھتا ہو۔ ایک سرے سے سب کو اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی اور گل کے خلاف خفیہ محاذ بننے لگے۔ ان میں ان مردوں نے بھی دل وجان سے حصّہ لیا جن کی اس تک رسائی نہیں تھی۔ جتنے لوگ ان کے ہاں آتے تھے سب کے ساتھ اس کے معاشقے کے قصے مشہور ہونے لگے۔ کتنے ہی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ مردوں میں بیٹھی برج کھیل رہی ہے اور اس کا میاں پیڈسٹل لیمپ کے سائے میں بیٹھا "ٹائم" میں آرٹ کے ننگے نمونوں سے دل بہلا رہا ہے۔ ہارنے کے بعد وہ شرمساری سی پارٹنر سے لاکھ لاکھ معافی مانگ رہی ہے کہ اس کی ایک ذرا سی غلطی سے وہ ہار گیا اور ساتھی دریا دلی سے کوئی بات نہیں، کہہ کہہ کر اسے یقین دلا رہا ہے کہ ابھی تو وہ ایسی ہزاروں ہار سہنے کی قدرت رکھتا ہے بشرطیکہ وہ اسی لہجے میں اسے پارٹنر کہتی رہے۔ کتنے ہی لوگوں نے دیکھا تھا کہ گاڑی میں وہ کسی اور کے ساتھ بیٹھی ہے اور اس کا میاں آگے یا پیچھے اکیلا بیٹھا ہے۔ کتنے ہی لوگوں نے دیکھا تھا کہ پارٹی میں ناچتے ہوئے چاندنی رات کا لطف اُٹھانے کے لیے وہ ساتھی سے چپکی چپکی باہر چلی گئی ہے اور رقص ختم ہونے پر تالی بجاتی پھر آگئی ہے۔ یہی نہیں، لوگ قسم کھانے کو تیار تھے کہ انہوں نے گل کو شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے صبح کے پانچ بجے کسی کمرے

سے نکلتے ہوئے پکڑا ہے یا میاں کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے دیکھا ہے، اگر یہ باتیں بہت دور دور کے گوشوں میں ہوتی تھیں، اس تک ان میں سے کوئی بات نہیں پہنچی تھی۔ اسے اتنا معلوم تھا کہ عورتیں اسے پسند نہیں کرتیں جب کہ حقیقت یہ تھی کہ عورتیں اس کی شکل سے جلتی تھیں۔ جس پارٹی میں وہ ہوتی عورتوں کی نظریں اپنے شوہروں کی رکھوالی میں لگی رہتیں اور جیسے ہی ان کے میاں اس کی طرف دیکھتے یا ایک آدھ بات کر لیتے ان کے چہرے لمبوترے ہو جاتے۔ پرانے میک اپ کے عادی جھڑتے ہوئے چہرے تپ اُٹھتے، پنسل کی مدد سے بنائی گئی بڑی بڑی آنکھیں خوف ناک ہو جاتیں اور چربی کی تہوں میں چھپے ہوئے جسم آگ سے دور ہوتے ہوئے بھی جل اُٹھتے۔ دور ہی دور سے وہ اس کی ایک ایک ادا پر جل کر کوئلہ اور راکھ ہوئی جاتیں۔ کمبخت کا جسم اور اس پر گھنٹوں سیدھے کھڑے رہنے کا انداز۔ موٹی بھدی عورتیں دو چار منٹ بھی سیدھی کھڑی نہ رہ سکتیں اور بھد بھد صوفے پر گرنے لگتیں اور وہ کیا مجال جو کسی جگہ ٹک کر بیٹھے۔ جوس کے گلاس کو انگلیوں میں خوبصورتی سے پکڑے وہ ایک ٹکڑی سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں پھرتی رہتی۔ کمبخت کو اپنے رنگ کے کپڑوں پر کھلتا ہوا جوس لینے

کا بھی تو سلیقہ ہے، ہاں اگر نظر انداز کرتی تو عورتوں کے مجمع کو اس کی خوبصورتی سے جیسے اس نے دیکھا ہی نہ ہو کہ صوفوں پہ سجے ہوئے رنگین گلدستے اسے دیکھ دیکھ کر دھواں چھوڑ رہے ہیں۔ ننگی گردن اور باہوں پہ جو رنگ بہتی وہ مردوں کو چھوڑ عورتوں تک کو اشارے کرتا۔ سینے کے لاکٹ کے چمکتے ہیرے جانے کس کس کو آنکھ مار کر پھر اس کے ہلکے ہلکے قہقہے جو گزرے دور سے عورتوں کے جلتے بھنتے دلوں پہ نمک کی پھوار بن کر گرتے رہتے۔ ایمان دار عورتیں دل ہی دل میں اس کو سراہتیں بھی۔ اس کی آنکھیں، میک اپ کے باوجود خوفناک نہیں لگتیں بلکہ جانے کیسی پگھلی پگھلی رہتی ہیں، ہونٹ نہ جانے کیسے بھرے بھرے لگتے ہیں اور جلد ایسی صاف کیسے نظر آتی ہے جیسے ابھی لانڈری سے دھل کر اور استری ہو کر نکلی ہو اور بال —— خیر بالوں کے لیے تو مشہور تھا کہ ہر پارٹی کے لیے دوکان سے سیٹ کروا کے آتی تھی بلکہ کہنے والیاں تو یہاں تک کہتی تھیں کہ میک اپ بھی "بیوٹی پارلر" میں ہوتا ہے۔ دانتوں میں بھی کچھ نہ کچھ کتر بیونت کروایا ہو گا ورنہ ایسے موتی جڑے دانت صرف کہانیوں کی شہزادیوں کے ہی ہوتے ہیں۔ رہ گیا جسم تو اس کو اور کام ہی کیا ہے سوائے اپنے جسم کو بنانے سنوارنے کے۔ بچے کی اب

اس بڈھے سے اُمید ہی کیا ہے، بچے کے بجائے بھی اپنے جسم ہی کو
پال رہی ہے۔ کیا چکنا چپڑا اہرا بھرا جسم ہے جیسے سرو کا درخت،
جیسے یوکلپٹس کا تنا مگر نزاکت جیسے چھوئی موئی اور لچک جیسے سفیدا۔
یہاں ایک سال دو بن کر گزرتا ہے، دانتوں کی جڑیں کھوکھلی اور بالوں
کی جڑیں چونا بنا نا چلا جاتا ہے اور وہاں مہینے جیسے عمر کے سال چھینتے
چلے جا رہے ہوں۔ بڈھے کے ساتھ جوان ہوتے اسی کو دیکھا ہے۔
عورتیں اس کی بے تحاشہ کشش کا سبب اس کا جسم سمجھتی تھیں جب کہ
اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ وہ تھا اس کا ہر ایک سے مخاطب ہو کر بات
کرنا، مردوں کی انا کو اس بات سے کتنی تسکین ہوتی تھی کہ اتنے بڑے
افسر کی اتنی حسین بیوی ان سے مخاطب ہو کر بات کرتی ہے۔ مردوں
کی یہی انا انہیں دیکھنے نہیں دیتی تھی کہ وہ کس ذریعے سے ان کی بیویوں کو نظر انداز
کر کے ان سے مخاطب ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیویوں کی تنگ دلی پر
چڑتے تھے۔ بھئی کیا ہوا جو کسی نے ذرا موسم کی بات کرلی یا ان کے
کوٹ میں لگی ہوئی کلی کا نوٹس لے لیا۔ یہ کتنی بے ضرر سی باتیں ہیں جن پر
کوئی جل ککڑی بیوی ہی بگڑ سکتی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی
تھی نہ آسکتی تھی کہ جو بات ان سے کی گئی ہے اس کا مقصد صرف ان کی
بیوی کو نظر انداز کرنا ہے۔ ان کے چہرے پہ ناپسندیدگی کے جو آثار

ابھیر تے تھے وہ گل کو اچھے لگتے تھے۔ ان سے اس کے دل کے کسی
نامعلوم سے گوشے کو انجانی سی تسکین ملتی تھی۔ عورتیں صرف اس سے
جلتی رہیں کبھی انہوں نے اس کی ان اداؤں کی جڑ میں جانے کی کوشش
نہیں کی۔ وہ کیوں ہر مرد کو اپنی طرف متوجہ رکھنا چاہتی ہے، وہ کیوں
اس انداز سے کمرے میں داخل ہوتی ہے کہ ہر نظر اُٹھ کر اس کا استقبال
کرے۔ وہ کسی موضوع کے ختم ہونے سے پہلے کیوں نیا موضوع چھیڑنے
کی فکر میں رہتی ہے۔ وہ کیوں اس طرح ہاتھ اُٹھاتی ہے کہ اس کے
ساتھ بہت سی نگاہیں بھی اُٹھیں۔ کیوں یکایک اس کے ہاتھ سے
رومال گر جاتا ہے۔ کیوں سردیوں میں ایکاایکی اسے اتنی گرمی لگنے لگتی
ہے کہ آتشدان سے دور ہٹنا پڑتا ہے، اور گرمیوں میں یک لخت ٹھنڈ
لگنے لگتی ہے اور لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ اب وہ اس بیچاری
عورت کی کیا مدد کریں۔ اور کچھ نہیں تو کبھی اسے کوئی چڑیا نظر آجاتی ہے
جو بڑے عجیب طریقے سے درخت پر بیٹھی ہے۔ کبھی چاند حد سے
زیادہ بڑا نظر آنے لگتا ہے اور وہ ڈر جاتی ہے اور کچھ نہیں تو کوئی
چیونٹا ہی ایسے مضحکہ خیز انداز میں چلنا شروع کر دیتا ہے کہ اسے
کسی نہ کسی کی توجہ ادھر کرانی پڑتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف
توجہ دلانے سے مردوں کی خودی اور انا کو جو غیر شعوری تسکین ملتی تھی

اس کو ان کی بیویاں نہیں سمجھتیں تھیں اور مرد ان کی حسد کرنے کی اس حیرت ناک قابلیت پر حیران ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی غصّے سے کھول بھی اُٹھتے تھے یعنی اگر چاند کی طرف دیکھ لیا تو —— اور وہ بے چارہ حقیر سا چیونٹا، یعنی وہ بھی اس قابل ہے کہ اس سے جلا جائے حد ہے بھئی۔ اب یہ اور بات کہ بیویاں اس وقت چیونٹا چھوڑ ہاتھی بھی دکھاتیں تو وہ نظرانداز کر جاتے۔ فساد کی جڑ صرف اتنی سی بات تھی کہ وہ کبھی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کو بار بار مخاطب کر کے بیوی کو صریحاً نظرانداز کیا جا رہا ہے اور بیوی سب کچھ برداشت کر سکتی ہے یہ احساس برداشت نہیں کر سکتی کہ دوسروں کی موجودگی میں شوہر اسے بھول جائے یا کوئی اسے بھلانے کی کوشش کرے۔ بیوی کا منہ پھلانا اس کے حسد پر محمول کیا جاتا اور گل دل ہی دل میں خوش ہوتی رہتی۔ وہ کسی سے اظہار عشق تھوڑا ہی کرتی تھی، ہلتے پھرتے ان کی بیویوں کی موجودگی میں معصوم سی دو ایک باتیں ہی تو کرتی تھی۔ ان بیچاریوں کو کیا معلوم تھا کہ اپنے چاروں طرف مردوں کا یہ ہجوم گل کو کیوں اچھا لگتا تھا۔ اس نے خود بھی یہ بات کبھی نہ سوچی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ چاروں طرف مرد ہوں تو وہ خود کو محفوظ خیال کرتی تھی اسے ایک ناقابلِ بیان قسم کی خوشی اور لذت ملتی تھی۔

(۱۶)

غنچہ لاہور کے اسٹیشن پر اُتری تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج ساری دُنیا سے اس کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے اور وہ آدمیوں کی اس بھیڑ بھاڑ میں خود اپنے آپ سے بھی کھوئی گئی ہے۔ قلی کو اپنا مختصر سا سامان تھما کر وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی، بھرے پرے اسٹیشن کی بھیڑ میں بھی اس کا دل کیسا خالی خالی تھا۔ رنگین کتابوں سے بھرا ہوا اسٹال اور تازے پھلوں سے سجے ہوئے ٹھیلے، بڑے بڑے پوسٹروں سے چھپی ہوئی دیواریں، سب اس کے من کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ ائرکنڈیشنڈ کوچ کے آگے کھڑی چست کپڑوں اور اُونچے بالوں والی لڑکیوں میں بھی اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی وہ قلی کے پیچھے یوں جا رہی تھی جیسے سوتے میں چل رہی ہو۔

لمبے سے پل کو پار کر کے وہ نیچے اتری تو ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ لیتے ہوئے اسے بڑے غور سے دیکھا، اور پھر ادھر ادھر نظر ڈالی جیسے دیکھ رہا ہو وہ کس کے ساتھ ہے، اس کا ردِ عمل دیکھنے سے پہلے غنچہ آگے بڑھ گئی۔ لمبے چکنے چھت والے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے اس نے قلی کو اپنی منزل کا پتہ بتایا اور پوچھا کہ کیا اس جگہ بس جاتی ہے۔

"تانگے میں چلی جاؤ بی بی، زیادہ دور نہیں ہے، بس میں سامان کے ساتھ کہاں جاؤ گی۔"

قلی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے غنچہ نے تانگہ لے لیا۔ تانگے والے نے بھی اسے غور سے دیکھا، مگر اس کے پتہ بتانے پر خاموشی سے سامان رکھنے لگا۔ کوئی نرس ورس ہوگی اس نے سوچا مگر ہے غضب کی چیز، مریضوں کے تو مزے ہوں گے۔ دل ہی دل میں مسکراتا، گھوڑے کی ہمت بندھاتا وہ لاہور کی سڑک پر دھینگا مشتی کرتی بہتی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ غنچہ نے سامان اسپتال کے برآمدے میں پڑی ایک بنچ پر رکھوایا، تانگے والے کو پیسے دیئے اور پھر ڈرتے ڈرتے ایک آیا نما موٹی سی عورت سے لیڈی ڈاکٹر شہناز کا پتہ پوچھا۔

"کیا کام ہے ان سے؟" آیا نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"ان کی سہیلی کا پیغام دینا ہے۔"

"آجاؤ میرے ساتھ۔" آپا نے کہا۔ غنچہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ بیچ لگے ایک کمرے کے باہر اسے کھڑا کر کے آپا اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کوئی مریض عورت نکل کے گئی، پھر آپا اسے بلانے آئی۔ جھجکتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی، ذرا دیر بعد جب انہیں اس کی روئداد معلوم ہو جائے گی تو وہ کیسے ان سب سے آنکھ ملائے گی؟ ڈاکٹر نے جو دبلی پتلی سانولی سلونی سی ایک خاتون تھیں اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ غنچہ کا دل چاہا یہ وقفہ بہت لمبا ہو جائے مگر نہیں، ڈاکٹر سراپا انتظار تھیں۔

"کہاں سے آئی ہیں آپ؟" وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھیں۔

جواب دینے کے بجائے غنچہ نے پرس کھولا اور لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ ڈاکٹر کھول کر پڑھنے لگیں۔ غنچہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خط پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر کا چہرہ یکایک سرخ ہو گیا، اس پر عجیب عجیب رنگ دوڑنے لگے اور شاید خط ختم کیے بغیر وہ غنچہ سے بولیں۔ "کہاں سے آئیں ہیں آپ، کس نے دیا ہے یہ خط آپ کو، کیا ثریا نے خود دیا ہے؟"

"جی ہاں" غنچہ نے آہستہ سے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خط میں ایسی کیا بات ہے جو ڈاکٹر صاحب یوں ہیجان میں مبتلا ہیں۔

"کہاں ہیں وہ؟ کہاں ملیں ثریا آپ کو؟"

"پشاور میں۔"

"کہاں رہتی ہیں وہ؟"

"یونیورسٹی کیمپس میں ولیج ایڈ کی ٹریننگ لے رہی ہیں۔"

"ولیج ایڈ کی ٹریننگ؟" جانے کیوں ڈاکٹر کا چہرہ بجھ گیا، کچھ دیر وہ سوچ میں کھوئی رہیں۔ سینکڑوں اندیشے اتنی دیر میں غنچہ کے دل میں جھانک گئے۔ اپنی سوچ سے نکل کر شاید ڈاکٹر کہیں گی، مجھے افسوس ہے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی ــــــ مگر کچھ دیر بعد اُنہوں نے سر اٹھا کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، غنچہ نے نظریں جھکا لیں، اسے معلوم تھا ڈاکٹر اسے کن نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں، پھر آیا کو بلا کر اُنہوں نے کہا: "انہیں میرے گھر لے جاؤ، ایک کمرہ ان کے لیے ٹھیک کر دینا اور مائی سے کہہ دینا ان کا خیال رکھے، کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔"

غنچہ کا دل چاہا اس مسیحا صفت عورت سے لپٹ جائے، وہ تو یہ سوچ رہی تھی یہاں سے جواب ملے گا تو وہ کہاں جائے گی، اداسی کی لہروں کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نظر نہ آتا تھا ــــــ مگر اب بھی دیکھو قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہ مہمان داری کب تک کی ہے، کشمکش پیچ میں وہ اُٹھی اور آیا کے ساتھ چلی گئی۔ اسپتال کے ایک کونے میں ڈاکٹر کا

چھوٹا سا صاف ستھرا مکان تھا۔ آپا نے اسے ڈاکٹر کی ملازمہ کے سپرد کر دیا جس نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کے لیے کمرہ ٹھیک کرنے چلی گئی۔ غنچہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہو کر تھکن اتارنے لگی۔ پھر مائی نے آ کر اس کا کمرہ درست ہونے کی خبر سنائی۔ غنچہ اس کے ساتھ گئی چھوٹا سا کمرہ تھا، ایک چارپائی پر اس کا بستر بچھا ہوا تھا، ایک طرف ایک کرسی اور میز پڑی تھی، دیوار پر ایک آدھ تصویر تھی اور بس۔ غنچہ غسلخانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی اور مائی کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی۔ ذرا دیر بعد ڈاکٹر گھبرائی ہوئی سی آئیں "ذرا مجھے ثریا کا پورا پتہ تو لکھ دیجیے۔" انہوں نے ایک کاغذ اور قلم غنچہ کی طرف بڑھایا۔ اور جس تیزی سے آئی تھیں اسی تیزی سے نکل گئیں۔ غنچہ نے کاغذ پر ثریا کا پورا پتہ، ہاسٹل کا کمرہ نمبر تک لکھ دیا۔ پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر پھر بڑا ہی ہوتی آئیں، پتہ لے کر پڑھا اور بولیں "میں ایک ضروری کام سے لاہور سے باہر جا رہی ہوں، مائی سے کہہ دیا ہے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی، جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف مانگ لیں۔" اس سے پہلے کہ غنچہ کچھ بولتی وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

تھوڑی دیر بعد غنچہ باہر نکل کر ٹہلتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ مائی نے بتایا......................

کہ ڈاکٹر صاحبہ تو اسی وقت ٹیکسی منگا کر چلی گئی تھیں۔ وہ کہاں گئی ہیں یہ تو اسے بھی معلوم نہیں صرف یہ کہہ گئی ہیں کہ وہ دو دن میں لوٹ آئیں گی اور یہ کہ ان کے کمرے میں ایک اور بستر بچھا دیا جائے اور جب وہ لوٹ کر آئیں تو گھر صاف ستھرا ملے۔ مائی کا اندازہ تھا کہ کسی مہمان کی آمد ہے مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مہمان کون ہے، ڈاکٹر خود اسے لے کر آئیں گی یا وہ ان کے پیچھے نازل ہوگا۔ غنچہ کے پوچھنے پر کہ کیا اکثر مہمان آتے رہتے ہیں، مائی ہنسی "مہمان کیا، بس ایسی ہی الٹی سیدھی عورتوں سے گھر بھرے رکھتی ہیں اپنا جن کا دنیا میں کوئی نہ ہو وہ ہماری ڈاکٹر صاحبہ کے ہاں آکے دند نانے لگتی ہیں۔"

غنچہ کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ مائی اس کی چوٹ سے بے خبر بولتی رہی "آپ کچھ دن یہاں رہیں گی تو خود ہی دیکھ لیں گی۔" پھر اس نے آواز کو ہلکا اور پُر اسرار بنا کر کہا "جانے بی بی تم بیاہتا ہو کہ کنواری ہو تمہارے سامنے کیا کہوں پر آجکل تو ساری کنواریاں بھی یہ باتیں جانتی ہیں، ہماری بی بی تو ایسی نیک ہیں اللہ قسم نو تو مہینے لڑکیوں کو اپنے پاس رکھ کے خود کیس کیا ہے، ایسی لڑکیوں حرامزادیوں کی شادی کروائی ہے، ان کے بچے تک خود رکھے ہیں اور کوشش کر کے ایسی ایسی بڑی جگہ گود دلوائے ہیں کہ عیش کر رہے ہیں حرامزادے۔

گاڑیوں میں گھومتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ حرامی پلے ہیں۔
غنچہ سر جھکا کر جلدی سے مائی کے آگے پڑا ہوا پالک صاف کرنے لگی اور مائی نے سوچا بیٹھے بیٹھے کنواری بالی کے سامنے میں جانے میں کیا کیا بک گئی۔ وہ جلدی سے موضوع بدلنے کو موسم کو کوسنے کاٹنے لگی۔

اس دن غنچہ نے مائی کے ساتھ کھانا پکوایا، دوسرے دن سارے گھر کی صفائی کروائی، نئے میز پوش بچھوائے تازہ پھول لگوائے تو یکایک مائی کو غنچہ بہت اچھی لگنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب کی دوست ہو کے، کسی کھاتے پیتے گھر کی اور ایسی خوش شکل ہو کے بھی طبیعت کی کتنی اچھی ہے یہ لڑکی، جانے کتنے دن رہے گی۔ مائی کرید کرید کر پوچھتی مگر اسے کوئی معقول جواب نہیں ملتا۔ بس اتنا ہی پتہ چلا جو ڈاکٹر خود بتا کر گئی تھیں کہ ان سے خاندانی تعلقات ہیں اور کچھ دن یہ لاہور میں رہیں گی اور یہیں ٹھہریں گی۔ کنواری لڑکی ہے کسی کالج وا لج میں داخلے کے لیے آئی ہے مائی نے سوچ کر خود ہی فیصلہ کر لیا۔
تیسرے دن شام رات میں گھل رہی تھی جس وقت ڈاکٹر واپس آئیں، غنچہ بے چینی سے باہر نکل آئی، اس کے دل میں ایک موہوم سی اُمید تھی شاید ڈاکٹر ثریا کو لینے گئی ہوں، آخر انہوں نے پتہ

کیوں مانگا تھا۔ ڈاکٹر اندر آئیں تو اکیلی تھیں، ان کا چہرہ اترا ہوا تھا، آنکھیں سُرخ تھیں، چہرے پر تھکن کے علاوہ درد و غم کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اندر آئیں اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں اور بلا وجہ خلا میں گھورنے لگیں۔ مائی اندر گئی، غنچہ خاموشی سے دروازے پر کھڑی سوچ رہی تھی کہ اندر جائے یا اپنے کمرے میں چلی جائے۔ اسے مائی کی آواز آئی "خیر تو ہے بی بی، چُپ چُپ کیوں ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے، چائے بناؤں؟" جواب میں خاموشی رہی۔ مائی پھر بولی "بی بی کچھ تو کہو کیا بات ہے، میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"کیا کہوں، مائی ــــــ" ڈاکٹر کی دکھ بھری آواز آئی "میری ایک ہی بہن تھی، وہ بے چاری ختم ہو گئی، اسی کے لیے میں نے اپنے کمرے میں بستر بچھوایا تھا۔" پھر سسکی کی آواز آئی۔ غنچہ سے نہیں رہا گیا، وہ اندر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا اور آہستہ سے کہا "ثریا نے خودکشی کر لی۔"

"کیا، ثریا" وہ زور سے چیخی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بے حال ہو ہو کر صوفے سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی اور ڈاکٹر اسے تسلی دے رہی تھیں "غنچہ، ہمت سے کام لو، مجھے دیکھو، وہ میری

بہن تھی، سگی بہن تھی، اکلوتی بہن تھی، تمہیں نہیں معلوم مجھے اس سے
کتنا پیار تھا مگر جب میں نے سنا کہ اس نے کتنے دکھ سہے ہیں تو
مجھے صبر آگیا چلو وہ ان سب مصیبتوں سے چھوٹ گئی —— میں تو
گئی اسی لیے تھی کہ اسے لے کر آؤں گی، ہر قیمت پر، مگر وہ میرے
پہنچنے سے پہلے ایسی جگہ چلی گئی جہاں سے کوئی اسے نہیں لا سکتا۔"

دونوں نے کھانا نہیں کھایا، مائی کے سو جانے کے بعد بھی دونوں
وہیں پڑی رہیں۔ اس گمشدہ ہستی کا ماتم کرنے کے لیے جو دونوں کو پیاری
تھی، ایک اس کی سگی بہن تھی اور دوسری کو اس نے بہن کی طرح سمجھا
تھا ایسی مصیبت میں اسے سہارا دیا تھا جب ماں باپ ساتھ چھوڑ
دیتے ہیں، سگے بہن بھائی دھتکار کر گھر سے باہر نکال دیتے ہیں، اس
نے اپنی بہن کا پتہ بتا کر دوبارہ اس کے سامنے پڑنے کے خوف سے
خودکشی کر لی تھی، ڈاکٹر نے بتایا جب ان غنچہ لاہور کے لیے روانہ ہوئی ہے اسی رات ثریا نے
خودکشی کر لی تھی، اسنے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ روز روز کی بیماریوں سے عاجز آکر خودکشی کر
رہی ہے مگر یہ غلط تھا غنچہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ بیماری کو خاطر میں نہ لاتی تھی بیماریاں
تو اس کی زندگی کا روزمرہ بن گئی تھیں، جس چیز نے اسکو ختم کیا وہ زندگی کی آخری آس
کا ٹوٹ جانا تھا جس کے سہارے وہ ابھی تک لگی ہوئی تھی ابھی تک وہ رحمان کے
دیے ہوئے فریب کھا رہی تھی مگر اب فریب کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ اور
زندگی کی ساری امیدیں صبح کے چراغوں کی طرح گل ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے اسے ثریا کا خط دکھایا اور اس کی چیزیں دکھائیں جو وہ غنچہ کو اور اسے دے گئی تھی۔ صاف شفاف بستر، سفید تکیہ جس پر اس کا سر رکھا ہوتا تھا۔ کپڑے جو اس کے کمزور جسم کو بڑی نفاست سے ڈھانکے رکھتے تھے، پتلا سا قلم اور نازک سی چین کی گھڑی جو اس کے سانولے دُبلے سے ہاتھ کی زینت تھی۔ غنچہ یہ ساری چیزیں دیکھتی رہی اور تڑپتی رہی، اس کی یاد میں موت سے پیدا ہونے والی دائمی جدائی کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر کے دکھ میں ٹھہراؤ اور فلسفیانہ شان تھی۔ وہ کوئی پرانی بات یاد کرتی، ایک ٹھنڈی آہ بھرتی اور ایک آنسو جیسے اس سے چھپ کر گالوں پر ڈھلکتا نیچے گر جاتا۔ آہستہ آہستہ اس نے غنچہ کے سامنے اپنی پچھلی زندگی کے سارے زخم ننگے کر دیے، اس وقت غنچہ کوئی غیر لڑکی نہیں، اس کی محبوب بہن کی محبوب ہستی تھی جو اس کے غم میں اس سے زیادہ ہلک رہی تھی۔ اس نے غنچہ کو بتایا کہ ان کے ہنستے کھیلتے گھر میں دکھ کا پہلا سایہ اس وقت پڑا جب باپ نے دوسری شادی کر لی، کچھ دن تو وہ اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کی کفالت کرتا رہا مگر پھر ان کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا۔ ماں جوں توں گزارہ کرتی رہیں یہ چونکہ بڑی تھیں اس لیے زیادہ ذمہ داری محسوس کرتی تھیں، دونوں

ماں بیٹیوں کی کوشش یہی تھی کہ ثریا کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس کا دل نہ دکھے۔
ثریا نے آنکھ کھولی تو گھر میں تنگ ترشی کا عالم تھا، ماں اپنی فکروں میں غلطاں رہتی تھیں، بڑی بہن پڑھائی اور ٹیوشن کے چکروں میں چنانچہ شروع سے ایک احساس تنہائی اور مایوسی نے اسے گھیر لیا۔ اسکول تک تو خیریت رہی مگر کالج میں اسے غلط صحبت ملی۔ ایسی لڑکیاں جنہیں سوائے کھانے کھیلنے کے اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ اچھے کپڑے اور فیشن جن کی زندگی کا مقصد تھا۔ گھر میں تفریح کی کوئی صورت نہ تھی، ثریا دن بدن گھر سے دور ہوتی گئی اور آخر رحمان کے چکر میں آگئی، اپنی سہیلیوں کے ذریعہ وہ اس سے خط و کتابت کرتی رہی اور آخر ایک دن اس کے ساتھ چلی گئی۔ ماں اسی غم میں چل بسیں، مگر شہناز ثریا کی تلاش میں رہی۔ اخبار میں اشتہار بھی دلوائے کہ وہ جہاں کہیں ہو آجائے یا اطلاع دے مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پہلی دفعہ جو سراغ لگا وہ اسی خط کے ذریعہ تھا جو ثریا نے غنچہ کو دیا تھا۔ کاش ثریا کو پتہ ہوتا کہ بہن اسے کب کا معاف کر چکی تھی، اسے سینے سے لگانے، اسے اپنے گھر رکھنے اور اس کی دیکھ ریکھ کرنے کو بے چین تھی۔ ایک سے دو ہوتیں تو زندگی کی یہ کٹھنائیاں شاید آدھی ہو جائیں، اب تو ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ اپنی زندگی کس کے سہارے بتائیں اس روپیہ کا کیا کریں جو وہ کماتی ہیں

بس جیون کا مقصد مریضوں کے آرام و آسائش کا خیال اور ان لڑکیوں کو تباہی سے بچانا رہ گیا ہے جو ثریا کی طرح حسین وعدوں کے دھوکے میں آگ میں کود پڑتی ہیں اور آخر میں پاگل خانہ یا حرام موت ان کی منزل ہوتی ہے۔ آدھی رات گزر گئی تو ڈاکٹر نے کہا "غنچہ اب تم جا کر اپنے کمرے میں لیٹ جاؤ اور سونے کی کوشش کرو، اور دیکھو تم یہاں سب کو یہی بتانا کہ تمہارا شوہر کار کے حادثے میں مر گیا ہے، سمجھیں نا" جو کچھ ہو سکے گا میں تمہارے لیے کروں گی۔"

غنچہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر تشکر کے آنسو آ گئے اور نہ جانے کس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

"میں میں —— کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں ڈاکٹر" روندھی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

"میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں غنچہ، بس اپنی زندگی کو کارآمد بنانے کی سوچو۔ مجھے یقین ہے اب وہ دھوکا تم کبھی نہیں کھاؤ گی جو ایک دفعہ کھا چکی ہو۔"

"کبھی نہیں، کبھی نہیں" غنچہ نے دل ہی دل میں دہرایا۔

"دیکھو میرا نام شہناز ہے، میں نے سب کو یہی بتایا ہے کہ ہمارے خاندانی تعلقات ہیں تم بھی یہی ظاہر کرنا جاؤ اب سب کچھ بھول کر تھوڑی

دیر سونے کی کوشش کرو۔"

غنچہ تعمیل حکم میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی، اور لیٹنے کے بجائے کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ آسمان پہ تاروں کے چراغ جھلملا رہے تھے۔ ایک کونے میں صاف ستھرے چاند کا سندر مکھڑا جگمگا رہا تھا۔ چاندنی بڑی گھمبیر تھی اور بالکل مناسب حد تک، نہ اتنی تیز کہ دھوپ کی طرح آنکھوں میں چبھے، نہ اتنی اندھی کہ کوئی چیز نظر ہی نہ آئے۔ ایسی چاندنی راتوں میں وہ اور ثریا باہر صحن میں لیٹی گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھیں، آج اس چاندنی کے ہوتے ہوئے وہ قبر کے اندھیرے میں اکیلی پڑی ہوگی، بے چاری ثریا، یہ زندگی کے رشتے بھی کیسے اُلجھے ہوئے، کیسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتے۔ ثریا سے اس کا کیا رشتہ تھا صرف دکھوں اور غموں کا رشتہ۔ اس رشتے نے انہیں نزدیک کیا اس کے باوجود ثریا نے اپنے سینے کے زخم اس کے سامنے کبھی نہیں کھولے، اور پھر جب انجانے میں وہ اسی کے ساتھ بے وفائی کر بیٹھی تب بھی اس نے اسے معاف کر دیا، اسے زندگی کا رستہ دکھا کر خود خاموشی سے موت کی وادی میں اتر گئی۔

دوسرے دن سے غنچہ نے ڈاکٹر شہناز کے ساتھ اسپتال جا کر

چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کر دیے۔ عورتیں اس کے بارے میں پوچھتیں اور اس کی کم عمری کی بیوگی پہ اظہار افسوس کرتیں مگر ان کی نگاہوں میں شک کے سائے ضرور ہوتے جیسے کہہ رہی ہوں، کہیں کوئی اور بات تو نہیں، غنچہ کا دل چاہتا، زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے سب سے زیادہ شرم اسے خود ڈاکٹر شہناز سے آتی جو اس کا بھید جانتی تھیں اور اس کو دوسروں کی نگاہوں میں گرنے سے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا وہ اس سے ساری کہانی پوچھیں تاکہ وہ بتا سکے وہ خود بُری نہیں تھی اسے بڑا زبردست دھوکا دیا گیا تھا مگر انہوں نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا، شاید ثریا نے انہیں لکھ دیا ہو۔ غنچہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے بارے میں کتنا جانتی ہیں اور پوچھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ کئی دفعہ سوچتی خود بات نکال کر سارا قصہ انہیں سنا دے، مگر بات شروع کرنے سے پہلے ہی اس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔

ڈاکٹر شہناز کے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی ـــــ مگر پچھلی باتوں کے بھوت ہر وقت اس سے چمٹے رہتے، انہیں وہ بھلا بھی کیسے سکتی تھی جبکہ ان کا جیتا جاگتا ثبوت خود اس کے اندر پروان چڑھ رہا تھا، اس وجود کی وجہ سے کبھی کبھی اسے خود سے اتنی نفرت

ہو جاتی کہ دل چاہتا وہ بھی ثریا کی طرح اپنا قصّہ پاک کر ڈالے، کئی کئی وقت وہ کھانا نہ کھاتی اور چپ چاپ پڑی رہتی۔ ایسے میں ڈاکٹر شہناز اسے سمجھاتیں کہ وہ کسی اور کی غلطی کی سزا معصوم بچے کو نہ دے، وہ یہ بھول جائے کہ اس بچے کی پیدائش میں کسی اور کا ہاتھ ہے وہ اسے اپنا اور صرف اپنا بچہ سمجھے۔ ایسے وقت غنچہ کے ہونٹوں پر ایک کھری کھری تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوتی "کیسی انہونی سی باتیں کرتی ہیں شہناز، کبھی کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے، انہیں کیا معلوم مجھے اپنے اس جسم سے کتنی گھن آتی ہے اور بعض دفعہ کتنی شدت سے دل چاہتا ہے کہ اپنے جسم سے نکل کر علیحدہ کھڑی ہو جاؤں"۔ یہ باتیں، یہ کیفیت تو وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی، شہناز کو بھی نہیں ——— بس آہستہ آہستہ اس نے خود سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی، جیسے کسی خطرناک مرض میں مبتلا مریض آہستہ آہستہ اپنی بیماری سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ ابھی دل سے بمشکل یہ معاملہ ہوا تھا کہ جسم نے بغاوت کر دی۔ پتلی کمر پہ چھوٹی مٹکی ایسا آگے نکلا ہوا پیٹ اسے زہر لگتا۔ ڈاکٹر شہناز اس کے بارے میں یہ اطلاع ہر ایک کو فراہم کر چکی تھیں اس لیے اس سے تکلیف دہ سوال تو نہ پوچھے گئے مگر چبھتی ہوئی نگاہوں کا مرکز ضرور بننا پڑا، ادھر اسپتال کی کھوسٹ آیائیں کسی وقت اسے نصیحت کرنے سے نہ چوکتیں "یہ بڑھیا کی

سنبھل کر اُترنا؛ "یہ چیز نہ اٹھاؤ" "یہ چیز نہ کھاؤ"۔ جس کو دیکھو اسی کی فکر میں گھلا جا رہا ہے۔ اسپتال میں وہ یوں نظر آتی جیسے بادلسے گاوں میں آدنٹ۔ بعض دفعہ اس کا جی چاہتا کہ چلا چلا کر رو دے یا چیخ چیخ کر کہے خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، مجھے نہیں چاہئیں تمہاری ہمدردیاں ——— وہ تو بھولنا چاہتی تھی مگر کوئی بھولنے بھی دے ———

---

(۱۷)

ایک دن گالف میں جب بریگیڈیر شمسی ہول کھیل کر واپس چلے گئے تھے اور گل تنہا کھیل رہی تھی اس نے تھوڑے سے فاصلے پر ایک شخص کو درخت کی آڑ میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ یوں تو گالف کورس پر کتنے ہی لوگ ادھر ادھر پھرتے نظر آتے ہیں مگر اس شخص کی چال میں گالف کھیلنے والوں کی سی پھرتی اور منزل کی طرف دامنع پیشقدمی نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر گل نے ٹی سے گیند کو مارا اور پھر تیز تیز اس کی سمت بڑھی۔ اس آدمی کے نزدیک سے گزرتے ہوئے گل دفعتہً ٹھٹک گئی۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”گل!“

”ارے ؟“ گل نے ماجد کو پہچان لیا۔ ”یہاں کہاں ؟“

"میں یہیں ہوں سمجھے جی۔ ایچ۔کیو میں اسٹاف میں بھیج دیا گیا تھا مگر اب میں نے استعفیٰ دے دیا ہے، فرم میں ہوں"

"اچھا۔ آیئے چلتے چلتے باتیں کرتے ہیں مجھے اس طرف جانا ہے۔"

گل نے اشارے سے بتایا۔

"مجھے ——— مجھے کچھ کہنا تھا۔"

گل نے کیڈی سے کہا کہ وہ گیند اُٹھا لے اور سیدھا کلب چلا جائے۔ کیڈی کے جانے کے بعد وہ دونوں لوٹے۔ کلب کی عمارت ابھی دور تھی۔ "کہیئے۔" گل نے کہا۔

"گل، تمہارے بارے میں یہاں ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں جنہیں سُن کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔"

گل ہنسی "ماجد صاحب آپ کو ایک سنہری اصول بتاؤں۔ کبھی کسی سنی ہوئی بات کا یقین نہ کیجیئے۔ دُنیا کو بولتے رہنے کی بڑی بُری عادت ہے۔"

"اور جو کچھ خود دیکھا ہو؟"

"اس کے بارے میں یوں سوچیئے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے اس کی تہہ میں شاید وہ بات نہ ہو جو آپ سمجھ رہے ہیں" ماجد لاجواب سا ہو گیا۔

"اب بہت سمجھدار ہو گئی ہو تم" اس نے کہا۔

"عنایت۔" اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ اُٹھا کر شرارت سے آداب کیا۔ معاً ماجد کو یاد آیا یہ وہی ہاتھ ہیں جنہوں نے ایک دن بڑی نفاست سے اس کے کپڑے تہہ کیے تھے مگر اب یہ ہاتھ فیض کے ان کاموں سے بلند ہو چکے تھے۔

"کل! سوچتا تھا کبھی تم ملو گی تو تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا، اپنی ماں اور بہنوں سے ملواؤں گا، مگر ــــ اب تو تم بہت ــــ بدل گئی ہو۔"

"اچھا ــــ مگر آپ نے یہ کیسے جانا کہ اب میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔ جب کہیے، کل ہی سہی۔"

"مگر ــــ اپنے میاں سے کیا کہو گی؟"

"وہ مجھے کہیں جانے سے نہیں روکتے، میری بہت سی پرانی دوست یہاں ہیں، ان کے ہاں جاتی رہتی ہوں۔ آپ مجھے اپنا پتہ بتا دیجیے میں کسی دن ــــ"

"نہیں، میں کل خود اپنی بہن کو لے کر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"کتنی بہنیں ہیں آپ کی؟

"پانچ۔"

"کسی کی شادی ہوئی ہے؟"

"نہیں، دو پڑھاتی ہیں، ایک ڈاکٹری پڑھ رہی ہے، دو کالج میں ہیں۔ پھر کل شام چھ بجے ——؟"

"ہاں ضرور۔"

"ایک بات اور تھی۔"

"وہ بھی کہیے۔"

"جس دن تمہاری منگنی ہوئی ہے اس دن میرا ارادہ امی کو خط میں سارے حالات لکھنے کا تھا، مگر —— اس دن طبیعت اتنی پریشان تھی کہ میں خط نہ لکھ سکا اور بعد میں اچانک یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ جب وہ دیکھ نہیں سکتیں تو کیا ٹانگ کی بات ان سے چھپائی نہیں جاسکتی ان کو اتنا بڑا دکھ کیوں پہنچایا جائے۔ میں نے انہیں لکھ دیا کہ میں یونہی ذرا سا زخمی ہو کر اسپتال میں آگیا ہوں۔ ہم سب نے مل کر یہ بات ان سے چھپا رکھی ہے اور تم بھی ان پر ظاہر نہ کرنا —— ہماری امی بڑی سیدھی سادھی، نیک اور محبت کرنے والی ہستی ہیں، تمہیں ان سے مل کر خوشی ہو گی۔"

"یقیناً، آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ مجھے کسی بزرگ خاتون سے باتیں کیے ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

"ان باتوں کو جانے دیجئے ماجد، میرے ماں باپ نہیں ہیں اور مجھے ان کے بارے میں باتیں کر کے دکھ ہوتا ہے۔"

وہ کلب کی عمارت کے نزدیک آگئے تھے۔ گل نے ماجد کا تعارف اپنے میاں سے کروایا۔ انہیں ماجد کی شکل یاد نہیں تھی البتہ یہ اچھی طرح یاد تھا کہ جس اسپتال میں ان کی ملاقات گل سے ہوئی تھی وہاں کوئی کیپٹن تھا جس کی ٹانگ کاٹی گئی تھی۔ وہ ماجد سے اچھی طرح ملے۔ چمکتے سبزے پر پڑی ہوئی بہت سی کرسیوں میں سے ایک پر وہ تھوڑی دیر بیٹھا۔ بریگیڈیئر شمسی نے اس کی مصنوعی ٹانگ کے بارے میں کئی سوال کیے۔ وہ جواب دیتا رہا مگر اس کے کان ان لوگوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے جو گل سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے چند منٹ بعد اجازت لے کر وہ اُٹھ گیا۔

گل نے اس دن ماجد کے ساتھ جانے کے لیے جو تیاری کی وہ روز کی تیاری سے مختلف تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنا صبح کا کیا ہوا میک اپ اتارا۔ پنسل سے بنائی ہوئی آنکھوں کی مصنوعی سرحدوں کو اکھاڑا۔ اونچے پھولے ہوئے بالوں کو گیلا کر کے کھینچ تان کے جوں توں جوڑے کی شکل میں کس لیا۔ پھر ساری الماریاں اور بکس کنگھال کر ایک بے حد

سادہ سفید جوڑا نکالا۔ اسے پہننے کے بعد وہ پہلی گل۔۔۔۔۔نظر آنے
لگی۔ خود کو اس حلیے میں دیکھ کر وہ کچھ حیران بھی ہوئی کچھ خوش بھی۔
بغیر میک اپ کے سادگی میں بھی وہ ابھی تک ہوش ربا حد تک دلکش
تھی۔ بلکہ اتنے دنوں کی لیپا پوتی کے بعد وہ خود کو زیادہ نکھری نکھری اور
ہلکی ہلکی لگی۔ بریگیڈیر شمسی اور ماجد نے بھی اسے تعجب سے دیکھا اس کی بہن
نے بھی جسے ماجد بے حد فیشن ایبل اور آزاد خیال عورت کو دیکھنے کے
لیے تیار کر کے لایا تھا اسے مسرت اور طمانیت سے دیکھا۔ باقی بہنیں
بھی اس سے بڑی خوش ہو کر ملیں۔ اس وقت گل کا بے اختیار دل چاہا
کہ کاش اس کا بھی ایسا کوئی گھر ہوتا جہاں بہت سے سیدھے سادھے
پڑھے لکھے بہن بھائی ہوتے۔ سرخ نیلی بنارسی ساریوں اور بالوں کے
ٹوکروں سے اکتا کر کبھی وہ چین لینے وہاں چلی جاتی اور چند دن کے لیے
پھر سیدھی سادھی گل بن جاتی۔ مگر اب تو وہ کہاں سے کہاں نکل آئی تھی۔ واپس
لوٹنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ پیچھے سے پکارنے والا بھی تو کوئی
نہیں تھا ہاں آگے بڑھانے والے تھے جن کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم
بڑھاتی غیر محسوس طور پر وہ اتنا دور نکل آئی تھی کہ لوٹنے کا تصور صرف
ایک ناممکن سی خواہش میں بدل گیا تھا ——— اور یہ گھر تو ماجد کا
تھا جس سے اس کا دور دور کوئی واسطہ نہ تھا۔ مگر یہ گھر اسے بڑا

اچھا لگا۔ صاف ستھرا ضرورت کی تمام چیزیں تھیں مگر فضول چیزوں کی بھر مار نہیں تھی، نہ بناوٹی ٹیم ٹام تھی نہ عجائب گھر کی طرح چیزوں کی نمائش کا جذبہ تھا۔ ماجد کی اندھی ماں نے بڑے پیار سے اسے گلے لگایا انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنے بڑے شوہر کی بیوی ہے۔ وہ اسے تخت پر اپنے پاس بٹھا کر خالص مادرانہ شفقت سے کہنے لگیں۔

"مجّی نے بتایا تھا کہ جب وہ بیمار ہو کر اسپتال گیا ہے تو تم نے اس کی بڑی خدمت کی ہے، جیتی رہو، بڑی عمر ہو، اب کہاں کام کرتی ہو ——؟"

"اب کام نہیں کرتیں امی، بتایا تو تھا کہ —— شادی ہو گئی ہے ان کی۔"

"ارے ہاں لو میں بھول گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کسی بڑے افسر نے تم سے شادی کر لی ہے۔ بیٹی یہ تمہارے اچھے کرموں کا پھل ہے۔ ہاں ٹھیک تو ہے خدمت میں عظمت ہے۔ کوئی بچہ وچہ؟"

"نہیں۔" گل نے شرما کر کہا۔

"تھوڑے دن ہوئے ہیں شادی کو ——؟"

"جی ہاں"

"اچھا اچھا، خدا تمہاری گود بھرے۔ بیٹی تمہیں دیکھ نہیں سکتی۔

بہت دن ہوئے آنکھیں جواب دے گیئں۔ جی چاہتا تھا تمہیں دیکھوں
تم ہنسو گی مگر مجھے لگ رہا ہے جیسے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ بھولی سی،
پیاری سی شکل ہے تمہاری۔" لڑکیاں زور سے ہنس پڑیں، ماجد کا
چہرہ کھل گیا۔" امی آپ ضرور دیکھ سکتی ہیں، سچ مچ۔"

" ہاں اور کیا تم لوگ ہی تو میری آنکھیں ہو، تمہیں لوگوں کی نظروں
سے میں بھی دیکھتی ہوں، ارے لڑکیو چائے وائے لاؤ ان کے لیے۔"

"نجمہ بنا رہی ہے۔"

"چائے کے ساتھ بھی کچھ رکھنا۔"

"سب کچھ ہے امی، دیکھا گل امی تم سے مل کر کتنا خوش ہوئی ہیں
ورنہ ہر ایرے غیرے کے لیے اتنی فکر مند نہیں ہوتیں۔"

"ارے تو ان کا نام لیتا ہے اور تم کہتا ہے، اَب تو وہ بڑے افسر
کی بیوی ہیں کچھ لحاظ کر۔" ماجد کی امی اپنے فطری سادہ پن سے
بولیں۔

"بات یہ ہے امی کہ یہ بڑے افسر کی بیوی تو ضرور ہیں مگر دراصل
فوج کے اسی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں جس میں ہم بھی تھے
اس طرح ہم میں اور ان میں ایک طرح کی بے تکلفی کا رشتہ ہے۔"

" فوج کا متوسط طبقہ کون سا ہوتا ہے؟" ماجد کی ایک بہن نے

حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی فوجی افسروں میں بھی عام طبقوں کی طرح تین طبقے ہوتے ہیں۔ایک اعلیٰ طبقہ، دوسرا متوسط طبقہ تیسرا نچلا طبقہ۔اعلیٰ طبقے اور نچلے طبقے کے معیار میں ایک عہدے اور تنخواہ کے باوجود بہت فرق ہوتا ہے۔ہے نا گل ؟ اعلیٰ طبقے والے عموماً کھاتے پیتے گھرانوں اور اُونچے طبقے کے والدین سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے والد وزیر، سفیر یا سیکرٹری رہ چکے ہوتے ہیں۔لڑکیاں عموماً شادی سے پہلے ہی امریکہ یا انگلینڈ کی ہوا کھا چکی ہوتی ہیں۔ان کی تصویریں پینورا ما میں چھپ چکتی ہیں اور آواز بی۔بی سی سے براڈ کاسٹ ہو چکتی ہے۔یہ غیر ممالک میں اپنے ملک کے اسٹالوں پر کھڑی ہو چکی ہیں اور کلچرل شوز میں ناچ دا چ دکھا چکی ہیں۔یہ فر فر انگریزی بولتی ہیں اور پاکستانی خواتین کی کمپنی کو بہت سخت "ناممکن" سمجھتی ہیں،کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا گل ؟"

"گل مسکرائی" اور ان کے لڑکے ؟ ان کے بارے میں بھی کچھ کہیے تاکہ میں اندازہ لگاؤں کہ میرے میاں کون سے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں"

اس طبقے کے لڑکے بھی فوج میں آنے سے پہلے دوسرے

ملکوں کا دانہ پانی چکھ چکے ہیں لمبی لمبی گاڑیاں چلا چکے ہیں، بعض پینے پلانے کا چسکہ بھی لگا چکے ہیں۔ پڑھنے لکھنے سے اکتا کر فوج میں چلے آئے ہیں۔ ان کی گردنیں ذرا اکڑی رہتی ہیں، اردو صرف بیروں سے بولتے ہیں۔ شادیاں اپنے ہی طبقے میں کرتے ہیں۔ بہت جونیئر ہونے کے باوجود سینیئر افسروں کے حلقے میں بڑی عزت سے لیے جاتے ہیں رقص میں میاں بیوی دونوں ماہر ہوتے ہیں اور اکثر اونچی قسم کی پارٹیاں کرتے رہتے ہیں، غرضیکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں آسمان بھی جھک کے ملتے ہیں میرا مطلب ہے بڑے بڑے افسر بھی"۔

"بھیا تو سچ مچ شاعری کر رہے ہیں، اب متوسط طبقے کے بارے میں بھی بتائیے۔"

"اس بیچارے طبقے کی رینج عام متوسط طبقے کی طرح فوج میں بھی بہت لمبی ہے جسے متوسط اور نچلے متوسط طبقے میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اس طبقے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ لوگوں کا معیار زندگی عہدے اور تنخواہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے جب کہ باقی دونوں طبقوں میں عہدہ بڑھنے پر رہن سہن میں نمایاں فرق نہیں ہوتا ہمیں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ شادی ہوئی تو بیوی برقع میں لپٹی لپٹائی اتریں اور دو چار رینک بعد دیکھا کہ سیمز مری میں ٹوسٹ کر رہی ہیں یا کسی

پارٹی میں بتا رہی ہیں کہ انٹرنیشنل لیڈیز کلب کی ممبر شپ کتنی مشکل سے ملتی ہے مگر خیر قابل عورتوں کو مل بھی جاتی ہے۔"

گل ہنس کر بولی "ایک ایسا گھرانہ میری نظر سے بھی گزرا ہے جہاں بیگم صاحبہ جدید ترین فرنیچر اور باہر سے لائے ہوئے سارے سامان کو اپنا جہیز کا بتا رہی تھیں جب کہ ان کی شادی کو بیس سال گزر چکے تھے۔

"ارے کچھ نہ پوچھو، ایسے لوگوں کا بعض دفعہ میاں کے ساتھ ساتھ مرحوم باپ کا عہدہ بھی آپ ہی آپ بڑھتا رہتا ہے۔"

"حد کر رہے ہیں بھیّا آپ تو۔" اس کی چھوٹی بہن ہنستے ہوئے بولی۔

"جھوٹ نہیں کہہ رہا، گل سے پوچھ لو۔ متوسط طبقے کی اور باتیں بتاؤں؟ میاں لوگ جمعہ کی نماز مسجد میں حوالوں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور شام کو باقاعدگی سے کلب میں برج کھیلتے ہیں، عورتیں بغیر آستین کی قمیص پہن کر اپنے بازوؤں کو دوپٹوں سے خوب ڈھانک ڈھانک کر میلاد شریف پڑھتی ہیں۔"

"بھیّا یہ آخری بات تو بالکل گپ ہے آپ نے کب عورتوں کے میلاد دیکھے ہوں گے۔"

"دیکھے ہیں جبھی تو کہہ رہا ہوں۔ ایک صاحب کی بیٹی کی شادی

نہیں ہوتی تھی، بڑی مشکل سے شادی ٹھہری۔ ماں نے منت مانی کہ شادی بخیر و خوبی ہو گئی تو میلاد کراؤں گی، اتفاق سے یہی میلاد میں نے دیکھا جس میں عورتیں شادی کے زرق برق آدھے ڈھکے چھپے کپڑوں میں میلاد پڑھ رہی تھیں۔ سچ کہتا ہوں بڑا مزہ آیا۔

"اب لگے ہاتھوں تیسرے طبقے کی باتیں بھی بتا ڈالیے۔"

"ہاں اس میں یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ بیچارے بچوں کی یلغار میں کہیں بیک گراؤنڈ میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ لوگ شہروں سے دُور کسی دُور افتادہ گاؤں کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ترقی کرتے کرتے افسر بنتے ہیں مگر ظاہری رہن سہن میں زیادہ تبدیلی نہیں کرتے نوکروں کے کوارٹروں میں بھینس رکھتے ہیں اگر وہاں جگہ نہ ہو تو اپنا بیڈ روم اس کے لیے خالی کر دیتے ہیں اور خود پینٹری میں گزارہ کر لیتے ہیں بچے دھاری دار پاجاموں اور سفید لوسکی کی میلی قمیصوں میں پھرتے ہیں۔ اب ان کے گھر کا نقشہ کھینچوں؟ ڈرائنگ روم میں لٹھے کے میز پوش اور کروشیا کی بیلوں کا زور ہوتا ہے۔ الماری میں پہلے بچے کی پیدائش سے لے کر اب تک کے سارے چھوٹے موٹے لکڑی لوہے اور پلاسٹک کے کھلونے سجے ہوتے ہیں۔ آرام کرسیوں پر رنگ برنگے بے حد موٹے اور تکلیف دہ کشن ہوتے ہیں۔ ایسے گھروں

ہیں کبھی کبھی ریکارڈ پلیئر یا ریڈیو گرام جیسی کوئی چیز بھی کروشیا کے میز پوش سے ڈھکی بجلی کے ساکٹ سے کئی گز دور رکھی رہتی ہے اکثر گھر والوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے اور کس مصرف کی ہے؟

"یہ پھر زیادتی کی آپ نے" ایک بہن بولی۔

"نہیں بھئی تم نہیں جانتیں، یہ لوگ گھر میں چادریں باندھ کر بان کی کھری چار پائیوں پہ لیٹتے ہیں اور باتھ روم کی چار دیواری میں گھستے ہوئے ہمیشہ کھیتوں کی آزاد فضا کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔ عورتیں آدھی اُجلی آدھی میلی، بھینسوں کے لیے چارہ یا مرغیوں کے لیے دانہ یا میاں کے لیے کھانا بناتی نظر آتی ہیں"

"مگر بعض دفعہ یوں بھی تو ہوتا ہے" گل نے بات اچک کر کہا۔ "کہ مرد صاحبان ایک دم صاحب بہادر بن جاتے ہیں اور عورتیں بیچاری وہی دیہاتن کی دیہاتن ——"

"جی ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ مرد افسر کے ساتھ صاحب بہادر بن جاتا ہے۔ برج اور ٹینس کھیلتا ہے، کاریں پھرتا ہے، چسکی لگاتا ہے، "بھابیوں" کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے لیکن بیوی کو ڈھیلے ڈھالے میلے کپڑوں میں اس دیوار کے پیچھے جو اس نے بڑی خوشامد

سے ایم۔ای۔ایس سے بنوائی ہے بھینس کے حضور میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔"

"ارے چھوڑ دبیٹے فوجیوں کا مذاق نہیں اڑاتے وہ ہمارے ملک کے محافظ ہوتے ہیں، میں تو کہتی ہوں تو نے کیوں بیٹھے بٹھائے فوج چھوڑ دی۔؟"

ماجد کے شگفتہ موڈ کا ایک دم خاتمہ ہو گیا، اس کے چہرے پر سایہ سا دوڑ گیا۔ وہ ماں کو کیا بتائے کہ اب وہ محاذ پر جانے کے قابل نہیں رہا۔

"لاؤ بھئی چائے لاؤ نا، کتنی دیر ہو گئی۔"

چائے آئی، ابھی چائے کے ساتھ باتوں کا دور چل ہی رہا تھا کہ دروازے میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت دھاڑوں دھاڑ روتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی ساری لڑکیاں ایک دم ایسی تتربتر ہوئیں جیسے اس کی موجودگی میں ان کو سخت خطرہ ہو اور فوراً ہی ماجد ایک بہن کو آواز دیتا اس کے پیچھے چلا گیا۔ اس عورت نے آتے ہی ماجد کی امی کے پاؤں پکڑ لیے اور زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگی "اب کیا ہو گا بی بی، خدا کے لیے بتاؤ اب کیا ہو گا ــــ بیٹی کو روؤں یا اس کو روؤں۔؟" وہ روتی رہی اور ایسے ہی بے معنی جملے کہتی

رہی جن کو گل بالکل نہیں سمجھی۔

"صبر کر رحمتے صبر کر، خدا بہتری کرے گا۔" ماجد کی امیؔ نے کہا مگر ان کے چہرے سے انتہائی دکھ عیاں تھا۔ ان کی اس تسلیؔ پر عورت نے ایک پچھاڑ کھائی اور اپنے لمبے لمبے ہاتھوں کو بے بسی سے مسلتے ہوئے سر دائیں بائیں پھینکنے لگی۔ پھر جیسے کراہ کر ایک دم بول اٹھی۔" بی بی ——— یہ دوسرے بچےؔ نہ ہوتے تو میں دریا میں چھلانگ لگا دیتی ——— ہائے اب کدھر جاؤں ——— کیا اسے پھانسی چڑھا دیں گے؟"

ماجد کی امی کچھ دیر اپنی بے نور آنکھوں سے اس کو تکا کیں، پھر بولیں۔ "نہیں، میرا خیال ہے اسے پاگل خانے لے جائیں گے۔ ایسی حرکت کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے اپنے ہوش حواس میں کون کرے گا۔"

"ہائے میں مر جاؤں بی بی، یہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں ———" یہ کہتے کہتے اس نے جھونک کھائی اور تخت سے زمین پر آ رہی۔ گل اسے سنبھالنے لپکی۔ اس کا رنگ زرد تھا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور بتیسی بند ہو چکی تھی۔

"کیا بے ہوش ہو گئی؟" ماجد کی امی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" گل نے اسے جوں توں تخت پر ڈالا اور پھر صحن میں جا کے ماجد کی بہن ریحانہ کو آواز دی۔

"بیٹی تم ہی کچھ کرو تم تو جانتی ہو بے ہوشی میں کیا کرنا چاہیئے" ماجد کی امی بولیں۔

"آپ بے فکر رہیئے، نبض ٹھیک ہے ابھی ہوش میں آجائے گی شاید کسی صدمے سے ——"

"صدمہ سا صدمہ بیٹی —— ہائے دُنیا میں کیسی کیسی باتیں ہیں جو عقل میں بھی نہیں آتیں کیسے کیسے دکھ ہیں —— میری آنکھیں گیئں تو میں نے سوچا تھا چلو دُنیا کے دکھ دیکھنے سے بچ جاؤں گی مگر یہ دکھ کہیں پیچھا چھوڑتے ہیں جینے جی —— اس کا میاں —— بیٹی کا باپ کمبخت پر جانے کیا شیطان آیا —— سگی بیٹی —— ایک نہ دو —— تین دفعہ —— مر گئی بے چاری، ہسپتال لے گئے تھے مگر نہیں بچی —— اسے پولیس پکڑ کر لے گئی —— ٹھیک تو کہہ رہی تھی غریب بیٹی کو صبر کرے یا میاں کو —— توبہ توبہ اللہ توبہ —— بیٹی دیکھو ٹھیک تو ہے"

"دیکھ رہی ہوں امی ٹھیک ہے۔" ریحانہ کمبل اور گرم دودھ لائی۔ دونوں مل کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہیں اور جب اسے ہوش آگیا تو ریحانہ اصرار کر کے گل کو اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد گل نے دیکھا وہ عورت ماجد اور کسی

دوسری عورت کے سہارے آہستہ آہستہ چل کر گھر سے باہر جا رہی ہے۔ دُنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے! اب بھی وہی سب ظلم، زیادتیاں، دھوکے بازیاں اور پاگل پن جو پہلے تھا۔ وہ یکایک بہت اُداس ہو گئی۔ دُنیا میں مختلف طبقوں کی زندگیوں میں کتنا فرق ہے جیسے وہ الگ الگ کرّے سے ہوں۔ وہ تو غریبی کے یہ دکھ، پریشانیاں، پابندیاں اور مجبوریاں بھولتی ہی جا رہی تھی۔ صرف اپنے گرد حصار بنا کر وہ سمجھ بیٹھی تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اُونچے طبقے کی بناوٹی پناہ گاہ میں پہنچ کر وہ متوسط اور نچلے طبقے کی مشکلات کو سرے سے نظر انداز کر بیٹھی تھی۔ بیٹے کو اپنی اندھی ماں سے اپنی ٹانگ کی حکایت چھُپانے کا کرب، پانچ تعلیم یافتہ خوش شکل اور خوش مزاج لڑکیوں کو بر نہ ملنے کی شکل معصوم لڑکیوں کی باپ کے ہاتھوں عصمت لُٹنے کی داستانیں اور جانے کتنی ہی ایسی آفات جن کو وہ اپنے سینے کے گھاؤ بنائے زندگی کی گاڑی ہنسی خوشی دھکیل رہے تھے۔

واپسی کے وقت ماجد کی امیّ نے گل سے یوں کہا جیسے وہ ان کی راز دار سہیلی ہو "بیٹی تمہارے ہاں اچھے شریف لوگوں کا آنا جانا ہو گا، ان لڑکیوں کے لیے بَر ڈھونڈو ——— تم ہی کچھ کرو ورنہ مجھ اندھی سے کیا ہو گا ——— اور ہاں میرے مجیّ کے لیے بھی

اپنی جیسی کوئی پیاری سی لڑکی تلاش کرو۔"

"ضرور امیّ۔" اس نے انہیں بڑے ادب سے سلام کیا، پھر باری باری سب بہنوں سے رخصت ہو کر واپس آ گئی۔ چلتے وقت اس نے نجمہ کو ریحانہ سے کہتے سنا تھا "آج بڑے دن بعد بھیّا اتنے موڈ میں آئے ہیں۔" اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا تھا جیسے بھائی کے دل میں پڑی ہوئی کوئی گرہ یکایک ان کے سامنے کھل گئی ہو۔ لوٹی تو اسے اپنا گھر کچھ اجنبی اجنبی، کچھ نیا نیا سا لگا کتنی بہت سی فالتو چیزیں اس کے گھر میں ہیں۔ دیوار پر لٹکا ہوا ساٹھ ہزار کا یہ کاشانی قالین۔ ہزار ہزار کی تصویریں جن کو نہ وہ سمجھتی ہے نہ اس کا میاں۔ پانچ پانچ سو کے یہ برمی چاندی کے بڑے بڑے پیالے جن پر تصویروں میں وہاں کی پوری تاریخ کھدی ہوئی ہے، پھر کتنے بہت سے نوکر، کتنے بہت سے برتن، کتنا بہت سامان۔ بجلی کا چولہا جسے اس نے کبھی استعمال نہیں کیا کیونکہ خانساماں مٹی کے تیل کے چولھے پر کھانا پکاتا ہے۔ کپڑے دھونے کی مشین جسے آج تک اس نے کھول کر نہیں دیکھا کیونکہ دھوبی اس کے کپڑے دھوتا ہے۔ بجلی کی استری جو ازل سے بند پڑی ہے، کیونکہ دھوبی اس کے کپڑے استری کرتا ہے۔ ریڈیو گرام، ریکارڈ چینجر، ٹیپ ریکارڈر،

تو بہ کس قدر چیزوں کی بھرتی تھی کہ جی اُکتایا جا رہا تھا —— اور کپڑے! بے شمار کپڑے۔ اس مہینے اس نے کتنی ساریاں خریدی تھیں نہ جانے وہ گنتی بھی بھول گئی تھی اور میک اپ کا سامان اور الا بلا —— اور وہاں وہ عورت تھی جس کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، جن کے باپ کو ایک ناقابلِ بیان جرم میں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ نہیں معلوم اس عورت اور ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا حشر ہو گا —— اُفوہ یہ خود ساختہ حصار کتنے اچھے ہوتے ہیں، کیسی پناہ میں رکھتے ہیں۔ ذرا باہر نکلو تو طوفانی ہواؤں کے کیسے کیسے تھپیڑے ہیں کہ ہوش اڑا جاتا ہے۔

اس رات گل بہت چپ چپ رہی۔ نہ برج کھیلنے پر راضی ہوئی نہ پکچر دیکھنے پر۔ ریکارڈ لگا کر رقص کرنے کی فرمائش بھی اس نے ٹھکرا دی۔ بس ڈرائنگ روم کے ایک اندھیرے کونے میں بیٹھی بڑی سی کھڑکی میں سے بجھے بجھے سے آسمان پہ گول تپتے ہوئے چاند کو دیکھتی رہی، گول سرخ چاند جیسے کسی مجرم کو داغنے کے لیے سرخ کیا گیا سکہ۔

(۱۸)

ایک دن اسپتال کے چوکیدار نے آن کر غنچہ سے کہا۔

"کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ؟"

"یہ نہیں بتاتے۔"

"ان سے کہہ دو وہ کسی صاحب سے نہیں ملتیں اور دیکھو آئندہ بھی جو مجھ سے ملنے آئے تم بغیر بتائے انہیں واپس بھیج سکتے ہو۔"

چوکیدار حیران سا واپس چلا گیا اور وہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ اس نے اس بات پہ ذرا بھی دھیان نہیں دیا کہ اس سے ملنے کون آسکتا ہے۔ ہوگا اسکول کالج کا کوئی آوارہ چھوکرا جس نے اسے اس

اسپتال میں آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا۔

شام کو حسبِ معمول وہ ٹہلنے نکلی تو اسے محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا آخر اس شخص نے برابر میں آکر اس کو نام سے پکارا۔ تب غنچہ نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ یہ رحمان کا وہی دوست تھا جو اسٹیشن پر اس سے معافی مانگ رہا تھا۔ غنچہ نے اسے صرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"کہیے۔"

"اگر کہیں تنہائی میں دو منٹ ——"

"جو کچھ کہنا ہے یہیں کہیے۔ یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔"

"وہ میں نے رحمان کو خط لکھا تھا ——"

"میں اس کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

غنچہ نے آگے قدم بڑھایا۔ "سنیے تو، دراصل میں اس کے بارے میں نہیں —— کچھ اور بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"جلدی کہیے۔"

"اس نے واقعی کمینگی کا ثبوت دیا ہے میں نے اسے ساری بات لکھ دی تھی مگر اس نے لکھا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا،

یہ خط ہے اس کا۔

غنچہ نے وہ خط لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ لڑکا اس کے پیچھے لپکا "آپ نے پوری بات تو سنی ہی نہیں، اس کمبخت نے لکھا ہے کہ اگر تمہیں اس سے اتنی ہمدردی ہے تو تم اس سے شادی کر لو۔"

غنچہ کا چہرہ دفعتاً لال بھبوکا ہو گیا وہ کھڑی ہو گئی اور شعلہ بار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں، مجھے اس کے خط سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی ہے کہ اس کا خط سنانے اتنی دور آئے ہیں تو میرا ایک کام اور کریں، جب وہ دہلی آئے تو اس جملے کے بدلے میں ایک ایسا تھپڑ اس کے گال پر رسید کریں جس کی جلن وہ ساری عمر نہ بھولے اور پھر کسی کو ایسی بات لکھنے کی جرأت نہ کرے، اب آپ جا سکتے ہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"غنچہ، دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

"مگر میں آپ سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

"نہیں۔"

"غنچو، دنیا میں سب لوگ بُرے نہیں ہیں ـــــ مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے ـــــ مگر سچ کہتا ہوں میں اس واقعہ کو بالکل بھلا دوں گا، زندگی بھر یہ بات کبھی میری زبان پہ نہیں آئے گی اس کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ تم اس پیشکش پہ خوش ہو گی۔"

"آپ کا خیال غلط تھا۔"

"ایک بار پھر سوچ لو، ساری عمر آوارہ کہلانے سے کسی شریف آدمی کی بیوی بن کر رہنا ایسا بُرا سودا نہیں ہے۔"

"میں نے سودے کی بات کبھی نہیں سوچی، جب سوچوں گی تو آپ کو بھی دھیان میں رکھوں گی۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس تجربے کے بعد بھی تم میں اتنا دم خم ہو گا اور تم اُس آدمی کو اس طرح دھتکارو گی جو تمہارے ناجائز بچے کا باپ بننے کو تیار ہو۔"

"ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ یہ واقعہ آپ بالکل بھول جائیں گے، کبھی ساری عمر یہ بات آپ کی زبان پہ نہ آئے گی لیکن میں دیکھ رہی

ہوں کہ یہ بات آپ کے ذہن سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں نکلی۔
جھوٹی ہمدردی کے جوش میں اپنی اور میری زندگی جہنم نہ بنائیے۔
جائیے آپ کسی شریف گھر میں بیٹھنے والی لڑکی سے بیاہ کر لیجیے
اور خوش رہیئے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے، میں طعنے اور جوتے
کھا کر خدمت کرتے رہنے کی حد سے دور نکل آئی ہوں، خدا حافظ۔"
غنچہ تیز تیز قدم رکھتی بس اسٹینڈ کی طرف چلی گئی، اس نے ایک
دفعہ بھی مڑ کر نہ دیکھا۔

(۱۹)

ڈاکٹر شہناز نے غنچہ کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اپنے اور بچے کے مستقبل کی خاطر اپنا بچہ کسی اچھے گھرانے میں گود دے دے۔ غنچہ اس بات پر تیار ہو گئی تھی ایک تو اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اپنے ہونے والے بچے پر کبھی اتنا پیار نہ آیا تھا کہ وہ اس کی جدائی کا تصور بھی نہ کر سکے۔ کبھی کبھی وہ یہ خیال شعوری طور پہ ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتی تھی کہ اس کا ایک خوبصورت سا بچہ ہو گا جس سے وہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دی جائے گی مگر یہ تصور اس کے ذہن میں جمتا ہی نہ تھا۔ اس کا بچہ ہو گا —— کیسے ہو گا —— کیوں ہو گا —— اس نے تو کبھی بچے کی تمنا نہیں کی تھی، پھر یہ آپ سے آپ —— خیالات پہ شروع سے

ہی ایک دھندسی چھائی رہتی جو اس تصور کو حقیقت نہ بننے دیتی۔
ہو سکتا ہے رحمان سے نفرت نے یہ صورت پیدا کر دی ہو کہ وہ اپنے
بچے کی مامتا محسوس ہی نہ کرتی تھی یا شاید وہ اس ساری کہانی کو غیر
شعوری طور پر بھولنا چاہتی تھی اور شعوری طور پر سوچتے ہوئے
بھی وہ نارمل احساسات جنم نہ لیتے تھے جو ماں اپنے پہلے بچے کے
لیے محسوس کرتی ہے، پھر کیس نارمل نہیں تھا سیزیرین تھا یعنی
بچہ آپریشن سے پیدا ہونے والا تھا اس بات نے اور دل میں
وحشت سی بٹھا دی تھی۔ کبھی وہ سچے دل سے سوچتی اگر پیدائش
کے وقت وہ اور بچہ دونوں مر جائیں تو کتنا اچھا ہو، دو زندگیاں
تاریک اور نامعلوم مستقبل کے عذاب سے چھوٹ جائیں مگر دل ہی
دل میں اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر شہناز اسے مرنے نہیں دیں گی۔ ان کا تو
ہاتھ ہی شفا کا پیغام تھا کیسے کیسے خطرناک کیس وہ کرتی تھیں اور
ماں بچے کو صاف بچا لے جاتی تھیں۔ ان کی شہرت دور دور
پھیلی ہوئی تھی۔ غنچہ کا وہ باقاعدہ معائنہ کیا کرتی تھیں، جس دوا
کی ضرورت ہوتی اسے دیتیں اور پینے کی تاکید کرتیں، اس کے ساتھ
بڑا ہمدردانہ سلوک کرتیں مگر ان دونوں میں کبھی بے تکلفی کی فضا
قائم نہ ہو سکی، کچھ عمروں کا فرق تھا کچھ غنچہ کا یہ احساس کہ وہ کس

حالت میں ان کے پاس لائی گئی ہے - ان کا آپس کا تعلق کچھ ان بہنوں
کا سا تھا جن کی عمر کا فرق بہت زیادہ ہو، جن کے طبائع مختلف
ہوں اور جو پردیس میں بیاہی جانے کی وجہ سے سالوں بعد ملتی ہوں۔
یہاں غنچہ نے زندگی کی ایسی تلخ حقیقتیں دیکھیں جن کے تصور
سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس تیرہ سال کی معصوم صورت
لڑکی کی آنکھوں میں چھپی ہوئی بے بسی وہ ساری عمر نہیں بھول سکتی
جو لوہے سے داغی گئی تھی اور جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔
اسے کوئی ہیلتھ وزیٹر کسی نامعلوم محلے سے یہاں لائی تھی۔ اسے
دیکھنے کوئی بھی نہیں آتا تھا، اس کی خالی خالی ویران نگاہیں دل کو
چھیدتی تھیں۔ غنچہ کو یقین تھا کہ پتھر کا خدا بھی انہیں دیکھ لے تو اس
کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں۔ یہ تیرہ سالہ ماں لیبر میں جب اپنی بچی کو
ننھے سے سینے سے لگا کر دودھ پلاتی یا سلانے سے پہلے اسے تھپکتی تو
غنچہ کا دل چاہتا، بے اختیار جا کر اس سے لپٹ جائے اور پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگے۔ غنچہ سے اس عورت کا دکھ بھی نہیں دیکھا جاتا تھا جو دردِ
زہ میں مبتلا تھی اور جس کے میاں نے آج ہی دوسرا نکاح پڑھایا تھا
وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ اس کو ہسپتال میں تڑپتا چھوڑ
کر اس کا میاں اس وقت پھولوں سے لدی سیج پہ کسی اور کے ساتھ

دراز ہوگا۔ اس غم کے ہاتھوں وہ خود ادھ موئی ہو گئی اور اس کا بچہ
پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اور پھر وہ پاگل فقیرنی جس نے ایک
چوہے سے بچے کو جنم دینے کے بعد گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا اور
چلاتی چیختی اسپتال سے باہر بھاگ گئی۔

یہ سب باتیں غیر شعوری طور پر غنچہ پر اثر انداز ہوتی رہیں اسے
یہ احساس ہو گیا کہ دنیا میں وہ پہلی اور آخری دکھی عورت نہیں ہے،
ایسی عورتیں بھی موجود ہیں جن پر اس سے زیادہ زیادتی ہوئی ہے،
جو ایک سے زیادہ مردوں کی ہوس کا نشانہ بنی ہیں اور ان میں سے
بعض ایسی ہیں جن کی زندگیاں مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہیں۔ اور جن کے
لیے اب کوئی آس باقی نہیں رہی ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب
وقت آیا تو وہ اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی نہیں تھی جتنا ڈاکٹر شہناز
کا اندازہ تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے ڈاکٹر شہناز کے کہنے پر عمل کرتی
رہی اور آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے وقت تک بڑے صبر و تحمل
کا مظاہرہ کیا جس پر آپا بیگم تک حیران تھیں۔

پھر جب ہوش میں آئی تو وہ پرائیویٹ کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔
اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر وہ ننھا سا جھولا کہیں نہیں
تھا جو ہر نئی ماں کے کمرے میں ہوتا ہے۔ اسے کچھ فکر سی ہوئی۔ آپا کے

آنے پر اس نے سب سے پہلے یہی بات پوچھی۔ آپا نے ٹالنے کے انداز
میں کہا کہ بچہ دوسرے کمرے میں ہے اور پھر وہ اس کی تعریف کرنے
لگی۔ اتنا خوبصورت بچہ اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا اور اتنا موٹا
تازہ، کسی کو دکھاؤ تو کبھی نہ مانے کہ تین مہینے سے کم کا ہے، اور ایسا
ہوشیار کہ ذرا دیر میں اس نے آنکھیں کھول دیں اور ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔
بلکہ آپا کو یقین تھا کہ ایک دفعہ وہ مسکرایا بھی تھا۔ غنچہ اس کی گپ پر
دل ہی دل میں ہنستی رہی مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس کی باتوں سے بچے
کو دیکھنے کا شوق زیادہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر شہناز آئیں
بچے کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا صرف اس کی
طبیعت پوچھی اور چلی گئیں، ذرا دیر بعد مارے تھکن اور کمزوری کے
غنچہ غنودگی میں چلی گئی اور بہت دیر تک سوتی رہی، رات کو بھی
بچہ اس کے پاس نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید اس کے آرام میں
خلل پڑنے کے خیال سے اسے الگ کر دیا ہے مگر دوسرے دن
بھی جب بچہ اسے نہ دکھایا گیا اور اسے دودھ سکھانے کی دوائیں
دی جانے لگیں تو اسے اس حقیقت کا علم ہوا کہ ڈاکٹر شہناز بچے
کو کسی اور کے حوالے کر چکی ہیں۔ شاید انہوں نے اس لیے اسے غنچہ
کو نہیں دکھایا تھا کہ اسے دیکھنے اور دودھ پلانے کے بعد اس کے

ایسی ماممتا نہ پھٹ پڑے کہ وہ اسے دینے سے انکار کر دے۔ یہ بات سنتے ہی غنچہ پر بچے کو بغیر دیکھے ہی مامتا پھٹ پڑی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ ظلم نہیں تھا تو اور کیا تھا کہ جس روح کو اس نے نو مہینے اپنے جسم میں پالا تھا اسے بغیر دکھائے اس سے جدا کر دیا گیا تھا، کہیں ایسا بھی سنا ہے ؟ ایک دن کا بچہ ماں کے دودھ کے بغیر کیسے زندہ رہے گا، وہ بھوکا رہ کر مر جائے گا۔ غنچہ نے اپنے بچپن میں بلی کے کئی چھوٹے چھوٹے بچے ماں سے جدا کر کے پالنے کی کوشش کی تھی مگر ان میں سے ایک بھی نہ بچا تھا، اچھے خاصے کھیلتے مالتے بچے جو ماں کے نرم نرم جسم پر قلابازیاں کھاتے تھے اور گول مٹول ہونے کی وجہ سے خوب بڑے اور چنچل نظر آتے تھے ماں سے علیحدہ ہوتے ہی کچھ نہ کھا سکنے کی وجہ سے سوکھنا شروع ہو جاتے تھے، کیسے کیسے جتن سے غنچہ انہیں دودھ پلاتی تھی ۔ روئی کے پھوئے دودھ میں بھگو کر منہ میں نچوڑتی تھی، سردی میں ان کے لیے گدیلے بناتی تھی اور اپنے ساتھ دھوپ میں لے کر بیٹھتی تھی مگر ماں سے جلدی جدا کر لینے کی وجہ سے ان میں سے کوئی ایک بھی نہ بچا تھا۔ جب بلی کے سخت جان چلتے پھرتے بچے ماں کے بغیر زندہ نہ رہ سکے تو اس کا بچہ کیسے رہے گا، نہیں یہ جیتے جی وہ نہ

ہونے دے گی۔ وہ بہت روئی پیٹی مگر ڈاکٹر شہناز کا دل نہ پسیجا ان کا یہی کہنا تھا کہ بچہ وہ دے چکی ہیں اب واپس نہیں لے سکتیں رہ گیا اس کا زندہ رہنا تو اس کی زندگی کے بارے میں انہیں قطعی کوئی تشویش نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بچے کو پریسیٹ فیڈ کیا جائے گا اور اس کی یہاں سے کہیں زیادہ دیکھ بھال ہو گی۔ ساری آیائیں، جمعداریناں اور دائیاں مل کر اس کے سامنے بچے کی غیر معمولی خوبصورتی کا رونا دن بھر روتیں مگر ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ بچہ کس کو دیا گیا ہے یہ بات ڈاکٹر شہناز کو معلوم تھی اور یہ کام بڑی خاموشی سے راتوں رات کچھ اس طرح ہوا تھا کہ کسی کو کچھ علم نہ ہو سکا تھا۔ جب غنچہ نے یہ بات ڈاکٹر شہناز سے پوچھی تو وہ مسکرا کر بولیں "معلوم ہو جائے گا ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ پہلے تم جلدی سے چلنے پھرنے کے قابل تو ہو جاؤ۔"

اور جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی اور دوبارہ نرسنگ کی ٹریننگ کے لیے جانے لگی تب بھی ڈاکٹر شہناز نے اس کے بیٹے کا پتہ نہ بتایا پوچھنے پر وہ ہنس کر ٹال دیا کرتیں، آخر ایک دن جب معاملہ سنجیدہ ہونے لگا تو انہوں نے غنچہ کو سمجھایا "دیکھو غنچہ اب تم بچہ نہیں ہو، میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے ـــــ جو کچھ ہو چکا ہے اسے تم اس طرح بھول جاؤ جیسے انسان خواب دیکھ کر بھول جاتا ہے اور

دیکھو جس چیز کو آخر میں بھلانا ہی ہو اس کی بعض کڑیاں یاد رکھنا یا انہیں دھراتے رہنا عقلمندی نہیں ہے۔ تم اس بچے کو کسی طرح ساتھ نہیں رکھ سکتی تھیں، تمہیں ابھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہماری بنائی ہوئی کہانی پر کتنے لوگوں نے یقین کیا، یہ بات تو غنیمت اگر سچ بھی ہوتی تو لوگ جھوٹ سمجھتے تم لوگوں کی ذہنیتوں کو نہیں جانتیں ——— ایسی صورت میں نہ تم عزت سے نوکری کر سکتی ہو نہ کوئی شریف آدمی تم سے کبھی شادی کرنا چاہے گا، اب اگر تم بچے کو ساتھ نہیں ساتھ رکھ سکتیں تو دل میں ایک زخم لیے پھرنے سے کیا فائدہ ہے، تم اسے بھول جاؤ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، یقین مانو اگر تم اسے نہیں دیکھو گی تو بھولنا آسان ہو گا، کچھ دن بعد تمہیں یونہی محسوس ہو گا جیسے تم نے کوئی خواب دیکھا تھا ——— اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔ جس گھر میں بچہ گیا ہے وہ بڑا اچھا گھرانہ ہے، میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ بچہ کس کا ہے، خود اس کی ماں کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ یہ اس کا بچہ ہے، سمجھیں ——— میں نے تمہارے لیے پورا پروگرام بنا رکھا ہے، تمہیں پنڈی جا کر فوج میں سسٹر بننے کی ٹریننگ لینی ہو گی، تمہیں رینک مل جائے گا، لیفٹیننٹ اور پھر ذرا دن بعد کیپٹن ہو جاؤ گی، ڈھیر سے روپے ملیں گے، عزت کی زندگی ہو گی۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ وہاں

داخلہ لینے سے پہلے تم کورٹ میں جاکر اپنا نام بدل لینا، جو تھوڑے سے بہت
لوگ تمہیں جانتے ہیں وہ بھی پھر نہیں پہچانیں گے اور اس طرح واقعی
تم ایک نئی شخصیت بن جاؤ گی، تمہیں یوں معلوم ہو گا جیسے غنچہ نامی
کسی لڑکی سے تم زندگی میں کبھی ملی ضرور تھیں، لو اب اسی بات پر مسکرا
دو۔ یہ غنچہ مسکرائی تو نہیں مگر آنکھوں میں آنسو لیے خاموشی سے اُٹھ
کر چلی گئی اور اپنے کمرے میں جاکر ثریّا کے کپڑوں میں منہ لپیٹ کر
وہ دل بھر کر روئی۔ اس کے بعد اس نے ڈاکٹر شہناز سے کبھی
اپنے بچے کے بارے میں نہ پوچھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کا کوئی
فائدہ نہیں ہو گا، ڈاکٹر شہناز بڑی نرم دل، بڑی فراخ دل تھیں مگر
ساتھ ہی اصولوں کی بڑی پکی بھی تھیں۔ آہستہ آہستہ غنچہ کو پتہ چلا کہ
وہ کھلے بندوں اس چیز کا پرچار کرتی ہیں کہ ان لڑکیوں کو جو محض ناسمجھی
اور کم علمی کی وجہ سے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ سوسائٹی میں
بُرا نہ سمجھا جائے، انہیں دھتکارا نہ جائے، ان کو گلا گھونٹ کر مارا نہ
جائے، ان کے بچوں کو کپڑوں میں لپیٹ کر کوڑے کرکٹ پر نہ پھینکا
جائے اور اگر سوسائٹی ایسا نہیں کر سکتی تو کم از کم حکومت ایسی لڑکیوں
کے لیے گھر اور شفاخانے مہیا کرے۔ وہ بڑی بڑی میٹنگوں اور کانفرنسوں
میں یہ بات کہہ چکی تھیں اور ان کے پیچھے بڑے بڑے قابل اور سمجھے ہوئے

لوگ ان کی باتوں پہ ہنستے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ مغرب میں جہاں اتنی آزادی تھی سوسائٹی ایسی لڑکیوں اور ماؤں کو کوئی مقام نہ دے سکی، اور یہ اپنے ملک کو ایسے پھرتی ہیں جہاں کسی لڑکی کو لڑکے کے ساتھ پھرتا دیکھ لیا جائے تو اودھم مچ جاتا ہے اور ایک خط پکڑا جائے تو خاندان بھر کی ناک کٹ جاتی ہے۔ ملّا ٹائپ لوگ کہتے تھے کہ ایسے گھر اور شفاخانے کھولنے کا مطلب ہے کہ سرِعام بدمعاشی کے اڈے کھول دیے گئے ہیں۔ اپنی ان باتوں کی وجہ سے ڈاکٹر شہناز خاصی بدنام بھی تھیں۔ لوگ تو یہاں تک کہنے سے نہ چوکتے تھے کہ یہ بھی اپنے زمانے میں ضرور کوئی گل کھلا چکی ہیں۔ شروع شروع میں ان کی شہرت اور بڑھتی ہوئی آمدنی کے پیشِ نظر ان کے لیے کئی ایسے لوگوں کے پیغام آئے تھے جن کی ڈگریاں پورے پورے صفحوں اور لمبے چوڑے نام کے بورڈوں پہ بمشکل سماتی تھیں مگر ڈاکٹر شہناز کسی سے بھی شادی پہ راضی نہ ہوئی تھیں۔ یہ نہیں معلوم کہ معصوم لڑکیوں کی درگت دیکھ کر انہیں مرد ذات سے نفرت ہو گئی تھی یا وہ شادی کو اپنے کیریر کے لیے مفید نہیں سمجھتی تھیں یا انہیں اپنے لیے مناسب شخص نہیں ملا تھا مگر اب شاید ان کے ابتر خیالات کی وجہ سے مدت سے پیغاموں کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا اور یہ بات بھی طے شدہ سی تھی کہ ڈاکٹر

شہناز ساری عمر کنواری رہیں گی۔

غنچہ کے پنڈی روانہ ہونے سے پہلے اُنہوں نے اس سے کہا۔

"غنچہ! جب بھی تمہیں صلاح مشورے کی یا روپیہ کی ضرورت ہو مجھ سے کہتے ہوئے مت ہچکچانا، تم میرے لیے ثریا کی جگہ ہو، مگر کبھی ایسا موقعہ آئے کہ پُرانی باتیں بھلانے کے لیے مجھے بھلانا ضروری ہو تو تم بڑی خوشی سے مجھے بھول سکتی ہو۔"

غنچہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی اور اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے اسٹیشن پر ثریا سے لپٹ کر روئی تھی۔ ڈاکٹر شہناز اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں اور حد نظر تک اسے دیکھتی رہیں۔

غنچہ ٹیکسی میں بیٹھی روتی رہی۔ ڈاکٹر شہناز تو اسے بھلا سکتی ہیں (ابھی سے اس کی جگہ ایک اور پیاری سی شکل کی دیہاتن لڑکی نے لے لی تھی جس کی ماں روتی پیٹتی اس کے ابارشن کے لیے آئی تھی اور ڈاکٹر شہناز نے ابارشن کے بجائے بچہ ہونے تک اسے اپنے پاس رکھنے کی خوشخبری سُنا کر ماں کو خوش خوش رخصت کر دیا تھا) مگر وہ ثریا اور ڈاکٹر شہناز کے احسانات مرتے دم تک بھی نہیں بھول سکتی۔ ثریا اور شہناز ساری عمر اس کے دل کے سنگھاسن پر سب سے اونچی رہیں گی۔ ان کی جگہ وہ کسی کو نہیں دے گی کسی کو بھی نہیں۔

(۲۰)

ایک دن بے اختیار گل کا دل چاہا کہ پشاور جائے اور وہ ساری جگہیں دیکھے جن کا اس سے تعلق رہا ہے۔ بریگیڈیر شمسی ان دنوں بہت مشغول تھے اس لیے ازراہِ کرم ان کے ایک انڈسٹریلسٹ دوست اکرم گل کو پشاور کی سیر کرالانے پر تیار ہو گئے۔ بریگیڈیر شمسی ان آزاد خیال لوگوں میں سے تھے جن کو اس بات میں کوئی قباحت نظر نہ آتی تھی۔ گل کی بات ٹالنا یا دوست پر شک کرنا ان کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ تھا۔ گل نے آج سر پر گل اناری اسکارف باندھ رکھا تھا اور سفید بڑی سی کار کو خود چلا رہی تھی۔ اکبر پورہ کا بورڈ آیا تو اس کا دل چاہا ادھر مڑ جائے اور گاؤں جا کر اپنے ماموں ممانی اور گاؤں والوں کو حیران کر ڈالے مگر پھر وہ ٹال گئی۔ چلو انہیں یہی سمجھ لینے دو کہ وہ

مرکھپ گئی ہے۔ نصر لپور آیا تو وہ ایک دم کارخانے کی طرف مڑ گئی۔
انہیں دیکھ کر چوکیدار نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ مینجر لپک کر باہر
نکلا اور ان کی کارخانہ دیکھنے کی فرمائش پر خود انہیں ساتھ لے کر ساری
جگہیں دکھائیں۔ وہ ساری جگہیں جو گل کو ازبر تھیں اور جنہیں اس وقت
وہ بڑی مسرت بھری حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ بڑا سا شیڈ جہاں
عورتیں بیٹھی پالک صاف کر رہی تھیں۔ ایک طرف پھل دُھل رہے
تھے، کونے میں بوتلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ پھر وہ اس شیڈ
میں آئے جہاں زمین پر بیٹھ کر اس نے لاکھوں ڈبوں اور بوتلوں پر
لیبل لگائے تھے۔ گل اس کارخانے کو کیوں اتنی دلچسپی سے دیکھ رہی
ہے اور اس شیڈ میں آکر کیوں یکایک اتنی اُداس ہو گئی ہے، اکرم
کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عورتیں بھی کیا پاگل ہوتی ہیں! گل سوچ رہی
تھی کیا یہ واقعی وہی جگہ ہے جہاں اس نے پیار کا پہلا پہلا سپنا دیکھا
تھا۔ گل کو محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ بھول جائے گی مگر یہ جگہ نہیں
بھول سکے گی جہاں اس نے کسی کو پہلی دفعہ دل میں بسایا تھا اور اب
شاید وہ کسی کو اس طرح اپنے دل میں نہ بسا سکے گی۔

گل سب کچھ دیکھتی رہی اور سوچتی رہی، شاید یہاں اسے کوئی پہچان
لے مگر کون پہچانتا! ۔ وہ سب لوگ تو کاروالی میم کو حیرت سے دیکھ رہے

تھے جو آج ان کے کارخانے کو رونق بخشنے آگئی تھی۔ مائی ہجیراں بھی اُسے نہیں پہچانی، بوڑھا چوکیدار بھی اسے نہیں پہچانا اور اس کی ساتھن بھی اسے نہ پہچانی گو سب نے اسے بڑے غور سے دیکھا، ہو سکتا ہے انہیں اس کارخانے میں کام کرنے والی ایک لڑکی غنچہ کی تھوڑی سی جھلک اس میں نظر آئی ہو مگر کوئی بھی یہ بات زبان پر نہ لایا۔

گل نے آخری بار اس کمرے پر نظر ڈالی جس سے اچانک جُدا ہو جانے پر وہ آٹھ آٹھ آنسو روئی تھی۔ آج بھی ڈبوں کے پہاڑ خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے مگر کرسی پر اکبر نہیں تھا چشمے والا کوئی منشی نما آدمی تھا۔ اکبر کی یاد نے برسوں بعد آخری مرتبہ چٹکی سی لی۔ پھر وہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھی اور تیزی سے کار چلاتی ہوئی پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ اب وہ بھی پہلی غنچہ کہاں رہی تھی، اب تو اس کا نام بھی بدل گیا تھا۔ ڈاکٹر شہناز نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ کچھ دن بعد اسے یوں محسوس ہوگا جیسے غنچہ نامی کسی لڑکی سے وہ کبھی ملی ضرور تھی۔ سچ مچ اسے تو ابھی سے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کوئی دوسری لڑکی تھی جس نے اس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، کھیتوں کی ان پگڈنڈیوں پر ننگے پاؤں بھاگتی پھری تھی اور پھر اس کارخانے میں پالک بننے اور لیبل لگانے پر نوکر ہو گئی تھی۔ یہ لڑکی کیسے ہو سکتی ہے۔ کسی سے

بھی پوچھ کر دیکھ لو۔ چوکیدار سے، مائی ہجیراں سے یا اس کی راز دار سہیلی سے۔ اگر وہ غنچہ ہوتی تو ان میں سے کوئی تو اسے پہچانتا۔

پشاور میں بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی ارباب روڈ، وہی گورا بازار، وہی سڑکیں وہی گلیاں۔ لب سڑک اس دوکان پر جہاں وہ کام کرتی رہی تھی، اب شوکیس لگ گئے تھے اور کار پارک کی جگہ کئی نئی دوکانیں بن گئی تھیں۔ اس نے اپنی گاڑی دوکانوں کے پاس اسی جگہ کھڑی کی جہاں کھڑی لوگوں کی گاڑیوں کو وہ حسرت سے دیکھا کرتی تھی اور سوچتی تھی، اللہ یہ کون سی دنیا کی مخلوق ہوتے ہیں جو ان لمبی لمبی گاڑیوں میں سرسراتے پھرتے ہیں۔ آج وہ بلاوجہ اس امریکن لائبریری میں گئی جہاں خوش پوشاک لڑکے لڑکیوں کو اس نے جاتے دیکھا تھا۔ کتابوں کی اس دوکان میں گئی جہاں سے امریکن عورتیں کتابیں خریدا کرتی تھیں۔ بلاضرورت اس نے کئی کتابیں اور رنگین رسالے لیے۔ ارباب روڈ کی دوکانوں سے کئی فضول چیزیں اس لیے لیں کہ ان جگہوں کو دیکھے جہاں وہ پہلے بھی جاتی رہی تھی، ثریا کے ساتھ اور رحمان کے ساتھ۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اپنی دوکان کے دروازے سے، ان سڑکوں سے ان دوکانداروں سے پوچھے۔ تم مجھے پہچانتے ؟ ارے بھئی میں غنچہ ہوں۔ مگر یہاں اسے

کوئی نہیں پہچان رہا تھا —— تو پھر اس تبدیلی کا فائدہ! یوں تو سینکڑوں
عورتیں گاڑیوں میں سے اُتر کر شاپنگ کرتی پھرتی ہیں۔ وہ تو چاہتی
تھی لوگ حیران ہوں، دانتوں میں اُنگلیاں دے لیں اور کہیں۔ ارے
دیکھو غنچہ، مگر یہ سب اسے اجنبی نگاہ سے دیکھتے گزرے چلے جا
رہے تھے۔ کیا وہ ادارے میں چلی جائے، یونیورسٹی کے ہاسٹل میں
جا کر سب کو بتائے کہ وہ غنچہ ہے مگر یہ کرنے کی وہ ہمّت نہ کر سکی
یونیورسٹی کیمپس گئی ضرور مگر سب پرانی چیزوں کو دُور ہی سے دیکھا
ثریّا کی رُوح کو الوداع کہا اور واپس ہوئی۔ واپسی میں وہ شہر سے
ہوتے ہوئے گزرے۔ قصّہ خوانی بازار، چوک یادگار اور کیفے
مارکیٹ جہاں وہ سینکڑوں مرتبہ آئی تھی۔ اسی شہر کی ایک گلی میں
رحمان کا مکان تھا جس کے ایک کمرے میں وہ پہلی مرتبہ دلہن بنی تھی،
ان پرانی جگہوں سے یک طرفہ ملاقات کے بعد شام کو وہ واپس
چل دیے۔ پشاور سے باہر نکلتے ہوئے گل سوچ رہی تھی اب اس کا
ماضی واقعی خواب ہو چکا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ واپسی میں وہ بے حد خاموش
اور اُداس تھی۔ کبھی کبھی کوئی خواب بھی تو دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا
ہے ——

شام کو جب لوگ بریگیڈیر شمسی کے ہاں برج کے لیے جمع ہوئے

تو معلوم ہوا کہ ان کی بیگم پشاور گئی ہوئی ہیں اور ابھی تک نہیں لوٹی ہیں۔ بریگیڈیر شمسی بڑے اطمینان سے کھیلتے رہے۔ وہی ان کا لیا دیا انداز وہی خاطر داری، وہی زیر لب تبسم۔ اگر کچھ فرق تھا تو یہ کہ جب بھی سامنے سڑک پر سے کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز آتی تو وہ لمحہ بھر کے لیے نگاہیں اٹھا کر ادھر ضرور دیکھتے یا جب بھی فون کی گھنٹی بجتی وہ یکایک بڑے بے چین سے نظر آنے لگتے۔ بیرا آنے میں دیر کرتا تو لپک کر خود ریسیور اٹھا لیتے ——— پھر بڑی بے دلی سے باتیں کرنے اور رکھ دیتے کیونکہ ابھی تک فون کی کسی گھنٹی نے ان کی بیگم کی آواز نہیں سنائی تھی۔ برج میں جہاں لوگ دنیا ومافیہا کو بھول کر کھیلتے ہیں ان کا یہ اضطراب ان کے ساتھیوں کو ضرور گراں گزرتا اگر وہ اس سے محظوظ نہیں ہو رہے ہوتے یا خود گل کے منتظر نہ ہوتے

رات کے نو بجے جب ان ہی کی جیسی ایک کار بڑے واضح طور پر ان کے صبر کا امتحان لیتی ہوئی گزر گئی تو انہوں نے پہلی مرتبہ کہا۔

"نو بج گئے گل ابھی تک نہیں پہنچی نہ جانے کیا بات ہے۔"

"کہیں گاڑی خراب نہ ہو گئی ہو۔" ڈاکٹر انور نے کہا۔ بظاہر اس کے لہجے میں تشویش تھی مگر نگاہوں میں تمسخر صاف نظر آرہا تھا جیسے انہوں نے باری باری ساتھیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر

اور ننگا کر دیا۔

"ابھی تک اس گاڑی نے کبھی دھوکا تو نہیں دیا۔" شمسی صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور وہ ادھر لپک گئے۔

"گاڑی دھوکا دے گئی یا بیوی، کون کہہ سکتا ہے۔" شمشاد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے بہانے فاروقی کے نزدیک جھک کر کہا۔ وہ مسکرایا، باقی دو بھی مسکرا لئے۔

"جی وہ پشاور گئی ہوئی ہیں آتی ہی ہوں گی ——— وعلیکم السلام۔" ریسیور رکھ کر وہ واپس اپنی جگہ آ بیٹھے۔ کھیل پھر شروع ہو گیا۔ ماتھے پہ بل، سوچ کا عالم، سگریٹ کا دھواں اور خاموشی۔ کبھی کبھی تھوڑی سی بات چیت، ہر کھیل کے بعد کچھ دیر ردوکد، پھر نئی بازی نئے ولولے اور نئی لگن کے ساتھ۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ بج گئے۔ گیارہ بجے ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت بریگیڈیر شمسی کا ہاتھ تھا، وہ بڑے دھیان سے کھیل رہے تھے۔

"بیگم صاحب کا فون ہے۔" آرڈلی نے کہا۔ پتوں کو ہاتھ میں لیے وہ ادھر بڑھے۔

"ہیلو ڈارلنگ ——— اچھا ——— نہیں، کوئی خاص نہیں،

یہی خیال تھا کہ کار خراب نہ ہو گئی ہو —— کل —— کس وقت تک —— نہیں نہیں (کھسیانی ہنسی) جیسی تمہاری مرضی، شاہ کو اور بیگم کو سلام کہنا میرا —— برج ہو رہی ہے۔ اچھا خدا حافظ، شب بخیر۔"

واپس آ کر انہوں نے پتے کھولے اور کھیلنے لگے۔ اس دوران چھ عدد آنکھوں میں جو تبادلہ خیالات ہوا تھا، وہ اس سے بے خبر، بے نیاز تھے۔ کافی آتی رہی، سگریٹ جلتے رہے، دھواں اڑتا رہا، انگڑائیاں ٹوٹتی رہیں، پھر جمائیوں نے نزول کیا۔ ساڑھے بارہ بجے کھیل ختم ہوا حساب کتاب ہوا کھیل پہ تبصرے ہوئے، پھر خدا حافظ سے پہلے روز کی طرح تھوڑی دیر باتوں کا دور چلا۔ جب سب رخصت ہو گئے تو بریگیڈیر شمسی نے ٹیلیفون سونے کے کمرے میں رکھوایا اور سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بیرے اور آرڈرلی نے کافی کی پیالیاں سمیٹیں، راکھ کے ڈھیر جمع کیے، کرسیاں اور صوفے جگہ پر رکھے، دروازے اور بتیاں بند کیں اور سونے چلے گئے۔

تب بریگیڈیر شمسی نے پشاور کی کال بک کی اور کپڑے بدلنے لگے گاؤن پہن کر غسلخانے سے نکلے ہی تھے کہ گھنٹی بجی اور ایکسچینج کی مخصوص پھر تیلی آواز آئی۔ "پشاور بات کیجئے سر۔"

"ہیلو —— ہیلو —— بادشاہ لعل رہے ہو، سلام علیکم!

کیا حال ہیں۔ بس ابھی برج ختم ہوا ہے سوچا ابھی تو رات وہاں بھی جوان ہو گی ـــــ ہنسی ـــــ بندہ خدا کچھ کم کرو، اب تمہاری وہ عمر نہیں بلانوشی کی ـــــ اُٹھو کہ اب وہ لذت خواب سحر گئی ـــــ ہا ہا ہا ـــــ بیگم؟ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ذرا گئی ہوئی ہیں کل آجائیں گی ـــــ نہیں کوئی خاص بات نہیں تھی، تم یاد آرہے تھے ـــــ ارے نہیں یار یوں نہ کہو ان کی موجودگی میں بھی کئی دفعہ فون کیا ہے ـــــ اچھا بھئی خدا حافظ۔"

ریسیور رکھ کر وہ دونوں ہاتھ ریشمی گاون کی جیبوں میں ڈالے ناپ تول کر قدم رکھتے ہوئے سنگھار میز کی طرف بڑھے۔ وہ شاہ کے ہاں تو نہیں ہے۔ جیسے انہوں نے اپنے آپ کو اطلاع دی اور پھر آئینے میں اپنے سراپے کے دوبدو کھڑے ہو کر بہت دیر تک اپنے آپ کو دیکھا کیے۔ خوبصورت تنومند جسم مگر زوال آمادہ جیسے ڈھلتا سورج۔ کنپٹی پر سفید بال، تیکھی ناک بڑی بڑی آنکھیں جنہوں نے اپنے زمانے میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ نہ جانے کتنی حسینوں نے ان آنکھوں میں ڈوب مرنے کی تمنا کی تھی۔ ایک عورت نے ان کی خاطر زہر بھی کھایا تھا یہ اور بات کہ وہ اب تک زندہ ہے اور میاں بچوں کے ساتھ خوب خوش ہے۔ یہ آنکھیں اب بھی زمانے کی نیرنگیاں دیکھ

رہی تھیں، ہوا کا رخ بدل چکا تھا اور یہ آنکھیں خاموش تھیں، بولتی ہوئی خاموش آنکھیں، جوانی میں ان آنکھوں کے لیے کہا گیا یہ ٹکڑا آج بھی صحیح تھا۔ کئی منٹ تک وہ اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ آئینے کے پار اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں گاؤں پہنے وہ خود کھڑے تھے۔ اپنی آنکھوں میں وہ خود کھڑے خود سے آنکھیں چار کر رہے تھے ——— مگر جلد ہی ان کی آنکھیں جھپک گئیں اور وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ چلتے پانی کو دنیا میں کون روک سکا ہے؟ یہ بیکار ہے، انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔ بہتے دریا کے سامنے بند باندھنا بے کار ہے ——— دریا کو کوئی نہ کوئی گزرگاہ چاہیئے ——— اسے اپنی راہ جانے دو۔ تم ——— تم وہاں سے ہٹ جاؤ یا اس میں ڈوب جاؤ یہ تمہاری مرضی ہے ——— انھوں نے روشنی بند کی اور لیٹ گئے۔ جلتے سگریٹ کا سرخ شعلہ بڑی دیر ان کی انگلیوں کے درمیان تھرتھراتا رہا۔

فون کر کے جب اپنے کوٹ نما سویٹر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گل ہنستی ہوئی اتری تو اکرم نے کہا "کیا کہتے تھے شمسی؟"

"کہتے تھے جیسی تمہاری مرضی۔"

"کمال ہے ——— انہیں تم پر اتنا اعتماد ہے؟"

"اوہ کیا" گل نخوت سے بولی۔

"مگر کیوں؟"

"کیوں نہ ہو" گل ہنسی "میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس کب پہنچائی ہے؟"

"ہاں واقعی" اکرم نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور دونوں اپنے جائے قیام کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ستمبر کے مہینے میں چراٹ کے اس چھوٹے سے ہل اسٹیشن پر اچھی خاصی خنکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اکا دکا پیڑ کے درختوں میں شائیں شائیں کر رہی تھی نیچے بستیوں کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ نزدیکی گاؤں کی بکھری ہوئی روشنیاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے کسی تقریب کے بعد سجا سجایا سنسان پنڈال۔ دور پشاور کی روشنیاں ایک قطار میں جھلملا رہی تھیں۔ سرخ پتھر کے پہاڑی سلسلے ہیبت ناک دیوؤں کی طرح کھڑے تھے۔

اور ان کے سائے میں اندھیری گھاٹیاں اندھے غاروں کی طرح پراسرار تھیں۔

"صبح سات بجے بیڈ ٹی لانے کو کہہ دیا ہے میں نے۔" اکرم نے کہا۔

"بہتر۔"

"گل، آج کی رات کتنی حسین ہے۔"

"سخت ہیبت ناک نظر آرہی ہے مجھے تو۔"

"یہ شاید اپنے اپنے جذبات واحساسات کا فرق ہے —— میرے جذبات حسین ہیں اور تمہارے شاید۔

"جی! مجھے تو آپ کے جذبات کچھ بھیانک نظر آرہے ہیں اف بھئی ذرا کمر سے ہاتھ نکالیے دم گھٹ رہا ہے میرا۔"

"گل —— گل —— کتنے دنوں سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا —— تمہیں نہیں معلوم کتنے دنوں سے۔" آواز فرطِ جذبات و خواہش سے پھٹی جارہی تھی۔

"کیوں؟" دروازے میں داخل ہونے سے پہلے گل نے ٹھٹک کر بناوٹی حیرت سے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے —— آخر میں بھی انسان ہوں گل۔"

"میں نے کبھی اس بات پر شک نہیں کیا —— اچھا شب بخیر صبح ملاقات ہوگی، آپ کا کمرہ اُدھر ہے۔"

"گل یہ کیا نداق ہے۔ کیا اب اس تنہائی میں بھی پرٹینس کی ضرورت

ہے ـــــ مگر ہاں شاید۔ انگریزی پکچرز کی طرح اب میں تم سے درخواست کروں گا کہ کیا میں تھوڑی دیر تمہارے کمرے میں ٹھہر سکتا ہوں؟"

"اور میں کہوں گی نہیں۔"

"مگر ہیروئن نہیں کبھی نہیں کہتیں، وہ کہتی ہیں ضرور ایک پیالی کافی میرے ساتھ پیئیں ـــــ اور پھر سب کچھ یوں ہوتا ہے جیسے خود بخود ہوتا چلا جا رہا ہو اس میں کسی کے ارادے کو کوئی دخل نہ ہو۔" وہ بڑے مزے میں ہنسا۔ "میں نے سُنا ہے شادی کی پہلی رات جب مرد شب عروسی کی خلوت میں آتا ہے تو بہت معصومیت سے کہتا ہے "اب آپ کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ جائیے بہت تھک گئیں ہوں گی ـــــ کتنی ہیپو کریسی ہے، ہے نا ـــــ اچھا یہ بتاؤ کیا شمسی صاحب نے بھی پہلی رات ـــــ"

"آپ کو مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں، گڈ نائٹ۔" گل کمرے کا دروازہ بند کرنے لگی، اکرم نے اچانک اپنا پاؤں درمیان میں رکھ دیا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"کیوں؟"

"ایک بات پوچھنی ہے۔"

"یہیں پوچھ لیجیے"

اکرم نے اپنا منہ اس کی طرف بڑھایا اور گل نے پیچھے ہٹا لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے اکرم — میں کسی شریف آدمی کی بیوی ہوں تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو؟"

شرم اور غصے سے اکرم نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ آخر وقت میں ان عورتوں کو مردوں کو ذلیل کرنے میں کیا مزا آتا ہے۔ اس کا دل چاہا چیخ کر کہے، تم شریف آدمی کی بیوی ہو جبھی تو میرے ساتھ یہاں آئی ہو، جبھی اپنے میاں کو بتایا ہے کہ شاہ اور بیگم نے تمہیں زبردستی روک لیا ہے، جبھی تم پچھلے مہینے ڈاکٹر نور کے ساتھ سوات گئی تھیں وہاں سے واپسی پر اس نے تمہاری شرافت کے وہ ڈھنڈورے پیٹے تھے کہ تمہارا میاں اس میں سے آدھی بات بھی سن لیتا تو کچھ کھا کر سو رہتا۔ آخر اس قدر بننے اور سین کریئیٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کون ہو اور کیوں آئی ہو میں جانتا ہوں اور تمہیں کیوں لایا ہوں یہ تم جانتی ہو تو پھر اس سارے جھگڑے کے معنی! میں نے مانا ایک وقت تھوڑی سی ظاہرداری کرنا پڑتی ہے کہ آخر ہم میں طوائف اور تماشائی کا رشتہ تو نہیں ہے مگر اس کو اس قدر طول دینے کا فائدہ ایک وقت آتا ہے جب انسان اپنے ننگے خیالات کو اور خود کو دوسرے

کی موجودگی میں بھی قبول کرلیتا ہے اور وقت کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے، سب کچھ جانتے بوجھتے ایسے وقت کو ٹالنا میرے نزدیک مضحکہ خیزی ہے اور کچھ نہیں، اب اس وقت تمہارے ماتھے کے یہ بل اس قدر بناوٹی اور مضحکہ خیز لگ رہے ہیں کہ مجھے ہنسی بھی نہیں آرہی بلکہ غصہ آرہا ہے اور جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں خوب کھری کھری سناؤں مگر ڈر ہے کہ کہیں بگڑ کر تم یہ رات واقعی تباہ نہ کردو، اس لیے ——— اکرم نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کہا "میری جان تم اس وقت کسی شریف آدمی کی بیوی نہیں ہو ——صرف میری ہو——— میری ——"

گل نے بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا "اکرم میں مذاق نہیں کررہی ہوں، تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ ورنہ میں چیخ بھی سکتی ہوں - پاس ہی کوٹھری میں چوکیدار اور خانساماں سو رہے ہیں۔"

اب کے اکرم نے واقعی اسے حیرت سے دیکھا، دیکھتا رہا، پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا ——— "تو تم ——— تو تم میرے ساتھ کیوں آئی تھیں گل؟"

"تم نے کہا تھا اچھی جگہ ہے رات وہاں گزارنی چاہیئے ———

میں آگئی۔"

"تو تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں، گل قسم کھا کر کہو تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ایک مرد جب کسی عورت کو تنہا لے کر نکلتا ہے تو —— اور میں نے کبھی تمہارے ساتھ بہن بھاوج کے رشتے نہیں جوڑے —— میں نے کبھی تم سے اپنے جذبات کو نہیں چھپایا —— پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم نے میرے یہاں آنے کو اتنی معصوم سی بات سمجھا —— گل —— تم نے جان بوجھ کر —— مجھے تکلیف پہنچائی ہے —— ذلیل کیا ہے —— شاید یہ تمہاری اور نور کی ملی بھگت ہے۔"

"نور سے کیا مطلب ہے؟" گل نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جب تم اس کے ساتھ سوات گئی تھیں تو اس معصومیت کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا تھا —— اس کے ساتھ —— اس کے ساتھ تم کیوں سوئی تھیں ——" فرطِ غضب میں اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی، وہ خوش شکل و خوش مزاج و خوش گو اکرم نہیں تھا اس وقت وہ کہانی کا وہ خونخوار شیر نظر آرہا تھا جو بھوک میں تڑپ رہا ہو اور ناہنجار خرگوش معصوم شکل بنائے اسے بتا رہا ہو کہ اس جنگل میں ایک اور شیر بھی ہے جو اسے نوالہ بنانا چاہتا ہے۔

"ہونہہ ——— نور نے جو کچھ کہا ہے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہو اور کل جو کچھ جا کر تم اپنے دوستوں سے کہو گے وہ بھی غلط ہو سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے اس کے ساتھ بھی یہی حرکت کی تھی۔"

"جی ہاں۔" گل نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"اس نے بڑی خاموشی سے یہ بات برداشت کر لی اور ابھی تک تم سے اسی طرح ملتا ہے یہ میں نہیں مان سکتا۔"

"اس بیچارے کے لیے اور چارہ بھی کیا تھا۔ سوات سے آ کر جو داستانیں اس نے سنائیں ان کے ثبوت میں اسے مجھ سے ملنا ہی پڑتا ہے۔"

اکرم کا سر چکرا رہا تھا جیسے کوئی بے حد مشکل معمہ حل کر رہا ہو۔ ذہن میں طرح طرح کے سوال آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ وہ بہت سی باتیں ایک ساتھ پوچھنا چاہتا تھا مگر سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا سوال پہلے پوچھے اور کن الفاظ میں پوچھے۔

"تو تم یہ کھیل ہم سب کے ساتھ کھیل رہی ہو ——— تم سب کو بے وقوف بنا رہی ہو مگر جانتی ہو کہ اس میں خود تمہاری کتنی بدنامی ہو رہی ہے۔"

"جانتی ہوں۔"

"میں نے آج تک ایسی عورت نہیں دیکھی جو دل بھر کے بدنام ہونے کو تیار ہو اور خود پارسا رہنے پر مصر ہو۔"

"ایسی عورتیں تو تم نے دیکھی ہوں گی جو سب کچھ کرنے کے بعد خود کو پارسا کہلوانے پر مصر ہوں۔"

"ایسی تو بہت دیکھی ہیں۔"

"سمجھ لو کہ یہ بھی وہی قسم ہے بس ذرا اُلٹی ہے۔"

"لیکن رجمبر، وجہ تو کوئی بتاؤ ——— اس میں تمہیں کیا مزا ملتا ہے؟"

"مزا ہی تو ملتا ہے ——— کبھی کبھی میرا بے اختیار ایسی حرکت کرنے کو جی چاہتا ہے، تم لوگ بڑے لوگ ہو، مشہور لوگ ہو، کھیلنا چاہتے ہو مگر بدنامی نہیں چاہتے، اخباروں میں اسکینڈل نہیں چاہتے جب ایسے لوگ پیر پٹخ پٹخ کر چلاتے ہیں اور یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کوئی سن نہ لے میں واقعی چیخ کر کسی کو بلا نہ لوں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے، اور پھر دوسرے دن جو باتیں جا کر دوستوں سے کہتے ہیں

اور وہ جس طرح مجھے سجاتے ہیں اس میں بھی مزا آتا ہے اور سب سے زیادہ مزہ مجھے اس وقت آتا ہے جب میاں میرے من گھڑت قصے ہنس ہنس کر سنتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ وہ جھوٹ ہیں اس وقت ان کے چہرے پر ہنسنے اور رونے کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے، کل جس وقت وہ فون پر بول رہے تھے تو ان کی آواز میں بھی یہی چیز تھی، تمہیں نہیں معلوم مجھے کتنا مزہ آرہا تھا۔"

"تم پاگل ہو، تم مینٹل ہو —— میں کہتا ہوں تم نارمل نہیں ہو، اگر یہ بات ہے تو۔ میں شمسی سے کہوں گا وہ تمہارا علاج کرائیں۔"

"اچھا ضرور —— بارہ بج رہے ہیں اب سونا چاہیئے۔"

"کیا واقعی —— تم نے سوات میں نور کے ساتھ بھی یہی کیا تھا؟"

"وہاں تو بڑا ہی مزہ آیا۔ یوں ہی باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ سڑک سے کچھ دور دریا کے کنارے ان کا آبائی مکان ہے میں نے اس کا گھر دیکھنے کی ضد کی، مجبور ہو کر بے چارہ لے گیا۔ اس کے خان باپ دریا کے عین اوپر نکلے ہوئے لکڑی کے ٹیرس پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے بڑا سر ور ڈھانک کر انہیں سلام کیا۔ نور نے جھوٹ بولا کہ میں اس کے دوست کی

بیوی ہوں جس کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے وہ تو ایمبولینس میں چلے گئے
ہیں میں بے ہوش ہو گئی تھی اس لیے وہ یہاں لے آیا کہ ذرا آرام
کر کے وہاں جا سکوں۔ باپ نے مجھے بڑے شبہے سے دیکھا۔ ظاہر
ہے میری شکل پر میاں کے ایکسی ڈینٹ یا اس صدمے سے بے ہوش
ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بہرحال وہ بڑے زمیندار اور خان
باپ تھے کچھ نہ کچھ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری درخواست پر
انہوں نے مجھے زنان خانے میں جانے کی اجازت دے دی۔
مردان خانہ ایک الگ بڑی سی کوٹھی تھی جس میں جدید قسم کا
فرنیچر تھا اور برآمدے میں بڑی سی شیو کپڑے سے ڈھکی کھڑی
تھی، اسی کوٹھی میں ان کا مہمان خانہ بھی تھا، ظاہر ہے مردانہ
مہمان خانہ۔ ہم جناب زنان خانے میں پہنچے یہاں مہمان خانے نام کی
کوئی چیز نہیں تھی، بس چھوٹے چھوٹے کمروں اور کچے صحن کی بند
حویلی تھی جس کے برآمدے کی دیواریں وہاں بنے ہوئے چولہوں
کے دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ چھت پر لٹکی ہوئی بڑی بڑی
چارپائیوں میں پیازیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچے صحن میں بھینسیں گائیں
بھیڑیں اور مرغیاں پھر رہی تھیں اور بو کے مارے برا حال تھا۔
صحن کی دیواریں بے حد اونچی تھیں اور پورے گھر میں کوئی کھڑکی

نہیں تھی ـــــ سمجھے آپ؟ یہ ہے ہمارے ان آزاد خیال مردوں کے گھروں کا رہن سہن۔"

"تم ہی دیکھو۔" اکرم نے خجالت سے کہا، کیونکہ فی الفور اپنے آبائی گاؤں کا کچا مکان اس کے ذہن میں اُبھرا اور ڈوب گیا۔ یہ تو بہت پرانی بات تھی اب تو تقریباً ہر بڑے شہر میں اس کی دو کوٹھیاں تھیں۔

"میں نے تو بہت کچھ دیکھا، جس علاقے کے مزدور اور دکاندار بھی نائلون کی پگڑیاں باندھے پھرتے ہوں اس علاقے کے خان، کی عورتیں چھینٹ کے پھول دار کپڑوں میں تھیں اور اکرم نے بتایا کہ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ وہ دو قدم پر دریا کی سیر کو بھی کبھی نہیں جاتیں۔ جس جگہ کو دُور دُور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں وہاں کی عورتوں نے کبھی باہر نکل کر اس کے حسن کو نہیں دیکھا۔ ان کی پوری زندگی ان کچے مکانوں میں بھینس گایوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ برآمدے میں کھڑی ہوئی شیورلیٹ پر ان کا کوئی حق نہیں تھا وہ صرف خان اور ان کے لڑکوں کے لیے تھی، اگر شادی غمی کے موقع پر کہیں جانا ہی ہوتا تو ان بے چاریوں کے نصیب میں کیا تھا، پردہ لگی بیل گاڑیاں ـــــ اسی گھر میں نور کی چچازاد بہن

بھی تھی جو اس کی منگیتر ہے۔ اتنی خوبصورت، اتنی خوبصورت کہ میں بتا نہیں سکتی مگر بے چاری اپاہج ہے۔ بچپن میں ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی ٹھیک علاج ہوا نہیں اور وہ لنگڑی رہ گئی۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ بے چاری اُردو نہیں جانتی تھی۔ ان کے گھر میں کوئی عورت اُردو کا ایک لفظ نہیں جانتی، کوئی بچی آج تک اسکول نہیں گئی ہاں لڑکے ضرور پڑھ رہے ہیں۔ یہ عورتیں جناب مجھ سے گلے ملیں، بڑی خاطریں کیں۔ نور میاں تلملا رہے تھے کہ ہم جلدی سے سوات اپنے ہوٹل پہنچیں۔ انہوں نے جب چلنے پر اصرار کیا تو میں نے کہلوا دیا کہ میں رات یہیں ٹھہرنا چاہتی ہوں، وہ جا کر میرے میاں کے پاس رہیں مجھے ہسپتال میں ڈر لگے گا۔ مذاق سمجھ کر وہ خود آیا اور بہت دیر تک بحث کرتا رہا مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں رات کو یہیں رہوں گی چاہے کچھ ہو جائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی ماں اور بہنیں سب میری طرف ہو گئیں۔ اس کی منگیتر جو مجھے بڑے شبہے سے دیکھ رہی تھی مطمئن ہو گئی اور جناب وہ رات میں نے اس کچے زنانخانے میں چھینٹ کی رضائی میں اور نور بے چارے نے مہمان خانے میں نواڑ کی مسہری پر پلش کے لحاف میں گزاری —— اور کچھ پوچھنا

ہے آپ کو ؟"

"مگر گل ـــــــ نورسنسیئر نہیں ہے، شادی وہ اسی اپاہج لڑکی سے کرے گا مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں، تم اس بڈھے کھوسٹ کو چھوڑ دو تم جو کچھ کہو میں تمہارے نام لکھ دوں، میری ملیں ہیں، زمینیں ہیں کوٹھیاں ہیں"۔

"اس سلسلے میں کل بات کریں گے۔ خدا حافظ"۔

دروازہ اس کی صورت پر دھڑ سے بند ہو گیا اور وہ غصّے سے کھولتا تلملاتا اس ذلیل عورت کو جان سے مارنے یا اس کی صورت پر تیزاب پھینکنے کے بارے میں غور کرتا رہ گیا۔

دوسرے دن اکرم کی آنکھ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سے کھلی گھبرا کر وہ باہر بھاگا۔ گل کا سارا سامان کار میں رکھا تھا اور وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھی "میں جا رہی ہوں، ٹاٹا" اس نے کہا۔

"کیا کر رہی ہو ـــــــ اور میں واپس کیسے جاؤں گا؟"

"میں نے سوچا شاید تم ناراض ہو اور میرے ساتھ جانا پسند نہ کرو"۔

"جی ہاں یہ جانتے ہوئے نا کہ یہاں کوئی سواری نہیں ملتی"۔

"تمہارے دوست تو ہیں جن کا نام لے کر تم بیر سپاٹے کر آئے

تھے، وہ تمہارے لیے سواری کا بندوبست کر دیتے۔"

"اب ان کے پاس جاؤں گا کہ بھئی ایک صاحبہ میرے ساتھ آئی تھیں جو مجھے دغا دے کر چلی گئیں خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دو ——— اور میں یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ یہ راستہ بہت خطرناک ہے اس پر ڈرائیو کرنا اتنا آسان نہیں۔" یہ سب اس نے انتہائی غصے کو بمشکل قابو میں رکھتے ہوئے کہا تھا مگر گل یوں ہنس پڑی جیسے اس نے کوئی شگوفہ چھوڑا ہو۔

"تو پھر آؤ نا چلتے کیوں نہیں۔"

غصے میں ہونٹ کاٹتا ہوا اکرم تیار ہونے اندر چلا گیا۔ گل اُتر کر اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ سامنے پہاڑیوں پر جیسے کسی فرشتے نے ہری مخمل یوں ڈال دی تھی کہ اس پر بے شمار سلوٹیں پڑی رہ گئی تھیں۔ ان لاتعداد چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں ان گنت چھوٹے بڑے راستے تھے جو ایک دوسرے کو کاٹتے چلے گئے تھے، کچھ پگڈنڈیاں تھیں کچھ پانی کی گزرگاہیں تھیں۔ پہاڑی کے دوسری طرف جا کر اس نے دیکھا تو منظر بدل چکا تھا، یہاں دُور دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ دُور گھاٹی میں ہرے بھرے درختوں کے درمیان گول سفید گنبد کسی زیارت کا نشان تھا اور عین نیچے سڑک کے نزدیک مکانوں کی

برابر چھتیں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے بہت سی اینٹیں رکھی ہوں۔
ایک موڑ مڑ کر نیچے دیکھا تو نوجوانوں کے کھیل کے میدان اور ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہاں پہ ہر موڑ، ہر نقطے اور ہر چوٹی پہ ایک نئے منظر کی جلوہ گری ہے۔ زندگی میں بھی تو ہر قدم پر سین یوں ہی غیر محسوس طور پہ بدلتے چلے جاتے ہیں۔

اکرم تیار ہو کر آیا تو بغیر کچھ کہے سنے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا گل برابر میں بیٹھ گئی۔ لال پہاڑی سلسلوں پر کار تیزی سے نیچے اترنے لگی اور ذرا دیر میں سڑکوں کی کئی سیڑھیاں پیچھے چھوڑ آئی اکرم واضح طور پہ خاموش تھا۔ گل دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ذرا دیر بعد وہ بولی۔

"بھئی یہ کیا بات ہے کہیں تو یہ پہاڑیاں اتنی لال ہیں اور کہیں اتنی پیلی جیسے چھپکلی۔" اکرم خاموش رہا۔

"بھئی بتاؤ نا۔"

"کیا؟" بھاری گمبھیر آواز جیسے روٹھا ہوا بیزار بچہ۔

"یہ پہاڑیوں کے اتنے مختلف رنگ کیسے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اور وہ ——— پیڑوں میں گھرا ہوا سفید مزار تاج محل

جیسا لگ رہا ہے نا، ارے ہاں تم نے بسوں کے پیچھے پینٹ کیے ہوئے تاج محل دیکھے ہیں، ٹیڑھے بگڑے اندر دھنسے ہوئے، لمبے پتلے بے تکے مینار اور گندے سے رنگ، سچ اتنا غصہ آتا ہے انہیں دیکھ کر یہ بسوں پہ تاج محل کس خوشی میں بنائے جاتے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

"احمق، بس یہ معلوم ہے انہیں کہ تاج محل بہت خوبصورت اور مشہور عمارت ہے لیکے ہر چیز پہ بنا دیتے ہیں اور اتنی بدصورتی سے کہ دیکھ کر جان جلتی ہے —— ارے دیکھنا دریا —— کیا نام ہے اس دریا کا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اوہ، ناراض ہو شاید —— اسی لیے تو میں اکیلی جا رہی تھی، مگر یہ نہیں ہوگا کہ مطلب پڑا تو روک لیا اور اب بات تک نہیں کرتے۔"

اکرم خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ جو برابر ڈھلان پر نیچے اُتر رہی تھی۔ جگہ جگہ گاؤں تھے۔ کہیں کہیں سبز جھاڑیوں پر بے شمار بجریاں بھی چمٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ گاؤں کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ایک سر سے پیر تک ننگے بچے نے جب بڑی

ادا سے انہیں سلام کیا تو گل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اکرم نہ چاہنے کے باوجود مسکرا دیا اور پھر فوراً مسکراہٹ سمیٹ لی مگر گل نے تاڑ لیا کہ غصّے کی دیوار میں دراڑ پڑ چکی ہے۔

"ارے بھئی سچ ناشتہ تو کیا ہی نہیں، سخت بھوک لگ رہی ہے، پبی سے کھانے کے لیے کچھ لے لینا ذرا۔"

"پبی میں کچھ نہیں ملتا۔"

"پھر نوشہرہ سے۔"

"وہاں بھی کچھ نہیں ملتا۔"

"ارے بھئی پھل پھلار، دُرّانی والی چائے کچھ ہی لے لو، نوشہرہ سے آگے لنچنگ ٹیبل ہیں وہاں بیٹھ کر کھالیں گے۔ دریا کی ٹھنڈی ہوا تمہارے موڈ پر شاید کچھ اچھا اثر کرے۔"

نوشہرہ سے کچھ پھل، کیک اور فلاسک میں چائے لے کر چلے۔ راستے بھر گل یونہی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی جیسے آتے میں کرتی رہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ اس وقت اکرم سراپا جواب تھا اور اب کبھی کبھار بمشکل ہوں ہاں کی آواز آتی تھی۔

دریائے کابل کی ٹھنڈی ہوا اور سبزے کے درمیان چائے پیتے ہوئے یکایک گل پر سنجیدگی کا دورہ پڑا۔ اس کا تجربہ تھا کہ

یہ ایک سنجیدگی اور اداسی کے دور سے فریق مخالف سے ہتھیار چھین لیتے ہیں۔

"اکرم ——— جب میں بہتے ہوئے دریا کو دیکھتی ہوں تو کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ یہ پانی صدیوں سے بہتا جارہا ہے اللہ کوئی حد بھی ہے ——— اور پھر یہ پانی جو اس وقت یہاں سے گزر کے گیا ہے کبھی ——— کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آئے گا اس کے باوجود پانی بہتا رہے گا ——— اتنا پانی کہاں سے آتا ہے۔" اس نے معصوم سی شکل بنا کر اکرم کو دیکھا۔ اور کوئی وقت ہوتا تو وہ گل کی اس بات پر کھلکھلا کے ہنس پڑتا مگر اب بے پناہ سنجیدگی سے وہ بہتے دریا کو دیکھتا رہا اور چائے پیتا رہا۔

"سن رہے ہو ——— جب کوئی بس گزرتی ہے تو ان پہاڑوں میں آواز کیسے گونجتی ہے جیسے کوئی جیٹ جا رہا ہو ——— دیکھو سنو ہے نا بالکل ہوائی جہاز کی سی آواز۔"

"ہونہہ۔"

"اور لڑائی کے دنوں میں یاد ہے ہر آواز پر جہاز اور ہوائی سائرن کا شبہ ہوتا تھا ——— دیکھا جائے تو زندگی میں کتنا دھوکا ہے، ہے نا۔"

گائے بھینس چراتے ہوئے چند بچے آ کر ان کے نزدیک کھڑے ہو گئے اور بڑی فراغت اور دلچسپی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ گل نے کیک کے چند ٹکڑے انہیں دیے، پہلے تو انہوں نے انکار کیا پھر لے کر ذرا دُور جا کر کھانے لگے۔

"تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں اکرم ——— بھئی مجھے تو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے میرے ڈھیر سے بچے ہوں۔"

"اب یہ اُمید دل سے نکال دو۔" روٹھا بچہ پھوٹ پڑا۔ "شمسی تمہیں ڈھیر کیا ایک چوہے کا بچہ بھی نہیں دے سکتے۔"

"یوں نہ کہو بچوں کے بغیر زندگی بڑی سونی ہے۔" گل نے دکھ سے کہا۔

"گل" یکایک وہ بنچ پر بیٹھی ہوئی گل کے قدموں سے جا کر بچوں کی طرح لپٹ گیا۔ "گل اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔ میں تمہیں سب کچھ ——— وہ سب کچھ دے سکتا ہوں جو شمسی کے پاس ہے اور بچے بھی۔"

گل نے اپنے ہونٹ کاٹے۔ اکرم نے ان موٹی سیاہ آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ پھر وہ بولی۔ "کاش آدمی اپنا مستقبل دیکھ سکتا ——— میرا بڑا دل چاہتا ہے دیکھوں میری قسمت میں کیا ہے، آئندہ

کیا ہونے والا ہے۔"

"جو اپنا مستقبل خود بناتے ہیں وہ اسے دیکھ بھی سکتے ہیں۔"

"تم دیکھ سکتے ہو؟"

"کسی حد تک۔"

"مگر میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا ایک دیوار سی کھڑی دکھائی دیتی ہے بس۔"

"یہ دیوار تم نے خود کھڑی کی ہے اس لیے تم اس کے پار نہیں دیکھ سکتیں۔ گل تم اس دیوار کو بڑی آسانی سے توڑ سکتی ہو ——— اور میں ——— میں سچ کہتا ہوں تمہیں کبھی دھوکا نہیں دوں گا" دفعتًا گل کھلکھلا کر ہنس پڑی "آؤ چلیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپہر کو جب وہ گھر پہنچے تو بریگیڈیر شمسی باہر نکل کر آئے۔ اکرم نے ان سے ہمیشہ کی طرح باتیں کیں۔ پشاور کے موسم کی، نصر پور کے کارخانے کی، اپنی کار کے نئے ماڈل کی۔ پھر گیراج میں کھڑی ہوئی اس نے اپنی کار نکالی اور جانے لگا۔ گل نے اس سے کھانے پر ٹھہرنے کے لیے کہا۔ اس نے کام کا عذر کر کے بڑی خوش اخلاقی سے انکار کیا اور چلا گیا۔ بریگیڈیر شمسی نے گل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا رہا ٹرپ؟"

"سو سو" گل نے بے نیازی سے کہا۔" ہاں زرینہ نے تمہیں بہت بہت سلام کہا ہے اور شاہ کہہ رہے تھے کہ شمسی سے کہنا وہ بھی کبھی گھر سے نکلے۔" گل نے نگاہیں اُٹھا کر میاں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہنسنے اور رونے کی وہی کیفیت تھی جس کا ذکر گل نے اکرم کے سامنے کیا تھا۔

(۲۱)

نجمہ کی ننھی سی کار سڑک پر شربر اور بے فکر بچے کی طرح دوڑی جا رہی تھی۔ ریڈیو پر ابھی ابھی اناؤنسر نے اپنی سدا کی ٹھہری ٹھہری آواز میں نے نواز کی بانسری پر نغمہ بجانے کا اعلان کیا تھا۔ گل سیٹ کے پچھلے گدے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اناؤنسر نے بتایا کہ نے نواز کی سنگت طبلے پر کون کریں گے اور پھر دھیمے، بہت دھیمے سروں میں ایک نغمہ پھوٹنا شروع ہوا جیسے کوئی کسی کے کان میں شہد کی سی میٹھی بات کہہ رہا ہو، پھر طبلے پر تھاپ پڑی بانسری کے لیے اونچی ہوئی اور گل نے محسوس کیا کہ نے نواز (ہائے کتنا خوبصورت نام ہے) کی سنگت طبلہ ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ کھیتوں میں لگے ہوئے پودے اور درختوں کے جھنڈوں میں چھپے ہوئے

گھروندے بھی کر رہے ہیں۔ آسماں کے پس منظر میں پہاڑوں کے اُبھرے ہوئے پر وفائل بھی کر رہے ہیں اور ڈرائیور کی کھوئی ہوئی سوئی سوئی آنکھیں بھی کر رہی ہیں جو سامنے سڑک پر دیکھ رہی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے جیسے دراصل وہ دُور بہت دور کہیں کچھ دیکھ رہی ہیں۔ نجمہ نے بتایا تھا کہ ڈرائیور کاغان کا رہنے والا ہے شاید اس وقت بھی اس کی آنکھیں اپنے دیس کی سیر کر رہی ہیں۔ رات کی تاریکی میں شوگران کی تیز چڑھائیوں پر چڑھتی ہوئی جیپ کو دیکھ رہی ہیں یا گلگت سے آنے والوں ان قافلوں کو جو گرتے نالوں سے چوڑی ہو جانے والی سڑک کے کنارے کھلے آسمان تلے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک طرف آگ جلتی رہتی ہے اور چھوٹے چھوٹے گل گوتھنے سے بچے لمبی قمیصیں پہنے اور سُرخ ٹوپیاں اوڑھے بجو کی طرح سڑک پر رات کو تنہا گزرنے والی جیپوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ آگ کی روشنی میں ان کی آنکھوں اور سیب کی رنگت کے گالوں کے ساتھ ان کی ٹوپیوں میں ٹنکے ہوئے موتی اور ستارے بھی چمک اٹھتے ہیں:

الن

کے جانور گدھے، گھوڑے گائیں اور بکریاں پاس ہی کونے میں بڑی مسکینی سے کھڑے رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ڈرائیور کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے خود کاغان جا پہنچی۔ ان کی جیپ کتنی تیزی سے موڑ مڑتی اور عمودی چڑھائیاں چڑھتی جا رہی تھی۔ جمال اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ دریا کے پار پہاڑوں کا دوسرا افلاک بوس سلسلہ چل رہا تھا اور زمین کی تہہ میں جہاں پہاڑوں کے فراز نشیب میں جا کر ڈوب گئے تھے کیسی خوفناک تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں یہ بھی تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس نشیب میں کنار دریا پتھروں کا ہاتھ پکڑے چوروں کی طرح چپکے چپکے چلا جا رہا ہے، اور اس کے سینے پر چڑھ کے چھال اُتر سے موٹے موٹے تنے بہنے کے بجائے پتھروں میں اٹکے ضدی بچوں کی طرح مٹائے پڑے ہیں۔ اسے تو رات کی تاریکی اور تنہائی میں اُوپر اُوپر ہی چڑھتے ہوئے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ اگر ابھی جیپ خراب ہو جائے تو ـــــ عین اسی وقت ایک موڑ پر پانی کی ہلکی شوں شوں کے ساتھ اس نے آگ جلتی دیکھی تھی اور اس کے نزدیک آدمیوں اور جانوروں کا یہ قافلہ دیکھ کر اس کے دل سے سارا ڈر نکل گیا تھا۔ آخر یہ بھی تو انسان ہی ہیں جو رات کی ہیبتناکی

میں یوں اطمینان سے بیٹھے ہیں جیسے لوگ سردیوں میں آتش دانوں
میں آگ جلائے بند کمروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں بڑے ہی
نہیں بچّے بھی تھے اور ماؤں کی گودوں میں شیر خوار بھی۔ جانوروں
میں بھی دو دو چار چار دن کے ننّھے بچّے کالی کالی حیران آنکھیں لیے
گھڑے تھے۔ آج کی رات سڑک کا یہ کونا ان کا گھر ہے، کل جانے
اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔ چلتے ہی چلتے ان کی زندگی کے سارے
مرحلے طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں اسکول کا
جائے بغیر بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ بغیر اخبار، رسالے اور
کتابیں پڑھے بھی یہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ انہیں لائبریریوں کی
ضرورت نہیں ہوتی، انہیں کلب نہیں چاہئیں۔ فلسفے اور سائنس
کی کمی انہیں کبھی زندگیوں میں محسوس نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کو
لکھے بغیر ان کا پیار مکمل ہو جاتا ہے۔ چلتے چلتے ہی لڑکیاں نئے گئے
چاندی کی ہنسلی اور بھاری جھمکے پہن کر دلہنیں بن جاتی ہیں۔ چلتے چلتے
ہی نئے بیاہتا جوڑے ماں اور باپ بن جاتے ہیں۔ پھر زندگی
کے اس دُہرے سفر میں رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں دُھندلانے
لگتی ہیں۔ سُرخ سفید چہرے راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں اب
چلتے ہی چلتے کسی دن وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ قافلہ رات کی جلی

آگ کی راکھ، جانوروں کی غلاظت اور مٹی کا ایک ڈھیر چھوڑ کر
آگے بڑھ جاتا ہے۔ ان لامحدود فضاؤں کے تلے ان کی زندگی
کتنی محدود ہے۔ ان کی ہر قسم کی ضرورت ان کے ساتھ ہے۔ گھر
خوراک اور جیون ساتھی۔ گدھوں اور گھوڑوں پر چھوٹے چھوٹے
بچوں کے ساتھ ان کی مرغیاں بھی سفر کرتی ہیں۔ راہ میں جب کسی
جانور کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کا مالک اس کے تھک جانے
کے خوف سے اس کی ٹانگوں کا ہار بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے
اور یوں چند دن وہ مالک کی گردن پر سوار ہو کر سفر کرتا ہے جب
مالک کے اپنے بچے تھک جاتے ہیں تو انہیں بھی اسی طرح کندھے
پر چڑھا لیا جاتا ہے۔ ان کے سر پر اُون کی بھیڑ کا موٹا سا کمبل ڈال
دیا جاتا ہے اور دُور سے یہ باپ بیٹے کپڑوں کا ایک اُونچا سا
چلتا پھرتا بنڈل نظر آتے ہیں۔ گل کو ان قافلے والوں کی زندگی
میں اتنا رومانس نظر آیا تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا جیپ سے اُتر کر
ان میں جا بیٹھے۔ اس وقت اسے کیا معلوم تھا کہ واقعی ایک وقت
اسے ان کے ساتھ انہیں کے جلیبے میں سفر کرنا پڑے گا۔ اگر اس
نے اس قافلے کے ساتھ سفر نہ کیا ہوتا تو وہ آج نجمہ کی کار میں
اپنے بیٹے کو لینے لاہور نہ جا رہی ہوتی۔ شاید وہ اس معصوم ہی کی

قسمت سے کاغان کے برفانی تودے میں تبدیل ہونے ہوتے حرارت اور زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ جس وقت جمال نے اسے سیف الملوک کے اس راستے میں نہ پایا ہو گا تو کتنا حیران ہوا ہو گا۔ صنوبی کے ابّا نے بتایا تھا کہ وہ جیپ میں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ایک ڈاکٹر، چند اور آدمی کمبل اور دوائیں لے کر اس کی مدد کو گیا تھا۔ واقعی گل کو وہاں نہ پاکر وہ سب لوگ حیران ہو گئے تھے۔ برف اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ ایک بھرپور عورت اس میں پوری طرح چھُپ جائے۔ برفانی ریچھوں کا اس موسم میں گزر نہیں تھا۔ کوئی ایسے آثار بھی نہیں تھے جس سے گل کو کسی جانور کے گھسیٹ لے جانے کا شُبہ کیا جا سکتا۔ تازہ برف کی وجہ سے کسی کے قدموں کے نشان بھی واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے ـــــــ کیا یہ ممکن تھا کہ گل خود ہوش میں آ گئی ہو اور نیچے اترنے کی کوشش میں راہ بھٹک گئی ہو۔ یہ بھی ایسا قرین قیاس نہ تھا۔ اوّل تو اس کا ہوش میں آکر خود چل دینا مشکل تھا۔ اگر جاتی بھی تو سڑک سڑک۔ اس صورت میں ان کا ملنا یقینی تھا۔ احتیاطاً جمال نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کے گل کو کئی آوازیں بھی دیں مگر وہ ان برف پڑے پہاڑوں میں صرف گونج بن کر رہ گئیں

—— ہر طرح دیکھنے بھالنے اور تسلی کر لینے کے بعد جب گل کا کوئی سراغ نہ ملا تو وہ واپس لوٹ آئے۔ یہی ایک اُمید تھی کہ شاید وہ کسی طرح ناران پہنچ گئی ہو مگر یہاں تو کسی نے اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ کیا طلسماتی کارخانہ تھا! جمال پریشان تھا کہ کیا کرے بہت تگ و دو کے بعد بھی جب گل نہ ملی تب بھی اس نے پولیس میں رپورٹ لکھوانے کی مخالفت کی اور بستی کے لوگوں کو یہ یقین دلا کر کہ وہ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گئی ہو گی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

---

(۲۲)

ناران کی چھوٹی سی بستی میں وہ چاروں طرف کے پہاڑوں میں جیسے قید ہو گئے تھے۔ نو تاریخ کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ اس کی روشنی میں پہاڑوں کے پچھلے سلسلے کی ایک تکونی برفیلی چوٹی بڑی خوبصورتی سے چمک رہی تھی جیسے برف میں جان سی پڑ گئی ہو۔ دیو کی طرح آسمان تک چلا جانے والا پچھلا پہاڑ تو جیسے ان کے سر پہ ہی کھڑا تھا۔ اس پر صنوبر کے درخت روز کی طرح تاریکی کے بھوت نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ چاندنی میں وہ بھی بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ نیلے آسمان کے تارے پہاڑ پر بکھری ہوئی روشنیوں کو آنکھ مار رہے تھے۔ دریا شائیں شائیں کر رہا تھا۔

دلوں میں گدگدی سی کر رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس صحن میں خاموشی سے ٹہلتے رہے۔ باقی سب لوگ اپنے کمروں میں دُبکے ہوئے تھے۔ امریکنوں کے کمرے سے ہاؤ وہوُ اور الالا الا پنے کی آواز آرہی تھی۔ تقریباً سارے کمروں میں آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ گل ان ساری جگہوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جنہیں یہاں آنے کے بعد وہ دیکھ چکی تھی۔ شوگران ریسٹ ہاؤس کے سامنے پھیلے گھاس کے میدان اور اس میں تنہا کھڑا وہ بڑا سا چیڑ کیسا خوبصورت لگ رہا ہوگا۔ برف سے ڈھکی ملکہ پربت اور سے کا مصلّے اور مکڑا کی چوٹیاں کیسی چمک رہی ہوں گی۔ ریسٹ ہاؤس کے بالکل پیچھے درختوں سے ڈھکی چوٹیاں اس منظر کو اور حسین بنا رہی ہوں گی اور پھر لالہ زار۔ ہائے کتنی پیاری جگہ ہے۔ اس چاندنی میں تو لالہ زار جنت کا کوئی ٹکڑا منظر آرہا ہوگا۔ ایک طرف ہیبت ناک پہاڑوں کی آسمان تک گئی فصیل جو اس وقت نور میں نہا کر ضرور خوبصورت ہو گئی ہو گی۔ گھاس کے لمبے لمبے قطعے اور صنوبر کے جنگل۔ کہیں پہاڑوں کے پیچھے سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی برف کی چوٹیاں جن سے پھسلتا ہوا برف پانی بن کر پہاڑوں کے بیچ میں اور میدان میں لہراتا بل کھاتا چلا جا رہا ہے۔ پھر نیچے

گھاٹی کے ہرے بھرے میدانوں میں دُور دُور بنے ہوئے مکان۔
ایک ہی جگہ کتنے بہت سے مختلف مناظر تھے اگر اس وقت وہ
وہاں جا کر دیکھتے ـــــــ مگر راستے کا خیال کر کے گل کا دل کانپ
اُٹھا۔ توبہ کیسی بھیانک چڑھائیاں اور اتنی پتلی سڑک۔ ہر چڑھائی
پہ دل بیٹھ جاتا تھا اور یہ کمبخت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں
پھر سڑک کے جس طرف عمودی ڈھلوان ہے ادھر نام کو بھی تو
کوئی رکاوٹ نہیں، کہیں جو جیپ ڈرائیور چوک جائے تو کیا حال
ہو۔ گل نے جھرجھری لی تو جمال نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ
دیا۔

"کیا ہوا، سردی لگ رہی ہے؟"

"نہیں، یہاں کے راستوں کا خیال آگیا تھا، اللہ کتنی خراب،
کتنی خطرناک سڑکیں ہیں۔ میں سوچتی ہوں اگر اللہ میاں ان پہاڑوں
کی چوٹیوں پہ رہ رہے ہوتے اور کہتے کہ مجھ سے ملنے یہاں آؤ
تو شاید کوئی نہ آتا۔"

"کیوں نہ آتے، یہ دیکھنے تو ضرور آتے کہ وہ ہے کیسا ـــــــ یہ تجسس
ہی تو انسان کو ہر جگہ کھینچ کر لے جاتا ہے۔ ہم بھی تو یہ دیکھنے آئے ہیں کہ
کاغان کی وادی آخر ہے کیسی؟"

"اوہ واقعی ایک ذرا دیکھنے کے لیے انسان کتنی تکلیف اٹھاتا ہے، کتنا تھکتا ہے۔"

"اس ذرا دیکھنے کی کرید انسان کو نہ ہوتی تو آج بھی وہ غاروں میں پڑا مکھیاں مار رہا ہوتا گلجی، مگر آج یہ جو تھکنے کی بات تم سوچ رہی ہو معلوم ہوتا ہے ابھی تک تمہاری ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔"

وہ ہنسا۔ جیسے پہاڑ کے کئی پتھر اپنی جگہ سے ہل گئے ہوں۔ کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہ جمال کے ساتھ تنہا کہیں جائے گی۔ نہیں وہ تو اس زندگی سے تائب ہو گئی تھی، اچانک اس کا جی ان باتوں سے کیسا اکتا گیا تھا، کسی بات میں وہ پہلا سا سرور نہیں رہا تھا، مردوں کی موجودگی میں جو ذہنی لذت اسے ملتی تھی اس میں ایک عجیب سا کرب در آیا تھا۔ اس وقت بھی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے رنگین قمقموں کے سائے میں ناچتے ہوئے لوگ اسے بتاتے تھے کہ وہ اپنی جوانی اور اپنا حسن تباہ کر رہی ہے اور وہ اپنی لیے خود کر دینے والی ہنسی کے دوران انہیں جتاتی تھی کہ وہ ستی ساوتری بیوی ہے شوہر پہ مرنا اس کا ایمان ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک، لبوں کی جنبش اور ہنسی کی کھنک میں اب بھی لوگ اس بات کی نفی ڈھونڈ لیتے تھے۔ وہ اس کی زبان سے زیادہ آنکھوں کا پیغام سننا پسند

کرتے تھے جس کا ترجمہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ کبھی نہ کبھی یہ پھل گرے گا اور ان ہی کی جھولی ہیں۔ رات کے دو بجے باتوں اور تماشوں کے ساتھ ہی بہت سے بلیغ اشاروں اور حسن طلب قسم کی نگاہوں سے رخصت ہو کر جب وہ تنہا رہ جاتی تو احساسِ فتح مندی کی جگہ ایک نامعلوم خلش اور بے کلی لے لیتی۔ ان جذبوں سے تپتے ہوئے جسم کو جس آنچ کی تلاش ہوتی وہ اسے میسر نہ تھی جیسے پکنے والی ہانڈی کو صرف اُبل سکنے بھر کا "تاؤ" ملے، یا بھڑ بھڑ کر کے جلنے والی لکڑیوں کو صرف سُلگنے کی راہ ملے۔ خوش شکل اور خوش لباس جسموں کی کھلی مانگ کو خوبصورت الفاظ اور خوبصورت اداؤں میں ٹھکرا کے اس کا اپنا تن ٹھیکرہ سا ہو چلا تھا۔ لوگ اسے ٹوٹی قبر میں سونے کا طعنہ دیتے تھے اور اپنے جسموں کے کھڑے مکان اسے دکھاتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر نور جیسے صابر بھی تھے جو اس کے میاں کے مرنے کا انتظار کرنے کو تیار تھے اور اکرم جیسے شاطر بھی جو اشارہ دیتے تھے کہ گل چاہے تو کسی نہ کسی صورت یہ جلتا چراغ بجھایا جا سکتا ہے۔ گل نے کھیل ہی کھیل میں جو رسّی گردن میں ڈالی تھی وہ اس کے گلے گردن تنگ ہوئی جا رہی تھی۔ ماجد کے گھر جا کر بھی اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ اپنے گھر سے مختلف زندگی اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں

کی بے پناہ خاطر ین جیسے اس کے منہ پر طمانچے لگاتی ہوں۔ ایسے
میں ایک دن جب بریگیڈیر شمسی نے اسے آگاہ کیا کہ انہوں نے
ریٹائرمنٹ مانگ لیا ہے اور وہ مشرقی پاکستان جاکر رہنے کا ارادہ
کر رہے تو وہ اس بات پر فوراً تیار ہو گئی۔ شمسی صاحب کو تو اس
کی مخالفت کا یقین تھا انہیں کیا معلوم تھا کہ گل شعوری طور پر
ایک عرصے سے اس زندگی سے فرار کی راہ ڈھونڈ رہی ہے۔

"پھر کل جھیل سیف الملوک تک پیدل چلو گی یا صبح جیپ
کے لیے کہہ دوں۔؟" جمال نے پوچھا۔

"پیدل چلنے میں مزہ آتا ہے ورنہ جیپ میں تو بس گزرے چلے
جاتے ہیں، ویسے بھی جیپ بس گلیشئر تک ہی تو جاتی ہے۔"

"ہاں تین میل۔"

"پھر جہاں تک چلیں گے یہ بھی سہی۔"

"اچھا تو آؤ اب سو جائیں ورنہ صبح کو اٹھا بھی نہیں جائے گا۔"

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ اندر آئے جہاں
آتشدان میں چیڑ کی لکڑیوں کی آگ جل رہی تھی۔ کمرہ باہر کے مقابلے
میں گرم اور آرام دہ تھا۔ جمال جلد ہی سو گیا مگر گل جاگتی رہی۔
نشہ جگمگ کے ساتھ ایسے جمال کی موجودگی کا شدید احساس تھا

جس وقت وہ مشرقی پاکستان جانے کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھی ہے اس وقت تو اس نے یوں سوچا تھا کہ شاید نئی جگہ اسے زندگی کا کوئی نیا اور بہتر ڈھب بخش دے۔

مشرقی پاکستان جاتے ہوئے گل پہلی دفعہ ہوائی جہاز میں بیٹھی تھی۔ وہ بچوں کی طرح خوش اور پرجوش تھی۔ بوئنگ ۷۰۷ بڑے وقار سے ائیرپورٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے سفید فام جسم پر خوبصورت سبز لائن اور دم کے سبز رنگ پر سفید تاروں کی قطاریں اور سادگی سے لکھا ہوا پی۔ آئی۔ اے سادگی و نفاست کا حسین امتزاج تھا۔ وہ کسی سرو قد حسین ملکہ کی طرح خوبصورت اور باوقار لگ رہا تھا۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گل کا دل یوں دھڑکا تھا جیسے ہمیشہ زندگی کی کسی نئی منزل میں قدم رکھتے ہوئے دھڑکا کرتا تھا۔ تنگ کپڑوں اور اونچی ایڑی پر کھنچی دو ائیر ہوسٹس اور جہاز کا دوسرا عملہ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ برابر برابر سیٹیں تھیں۔ سیٹوں کے اوپر سامان کے ریک پر چھوٹے چھوٹے دودھ کے جھاگ جیسے سفید تکیے پی۔ آئی۔ اے کے رنگ کے سبز کمبل باری باری رکھے بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ یہ ٹورسٹ کلاس تھی۔ سامنے ایک پھسلنے والے دروازے کی دوسری طرف

فرسٹ کلاس تھی۔ اس دروازے سے ہٹ کر دیوار میں بنے ہوئے
ایک خانے میں پلاسٹک کے کور میں لگے ہوئے اُردو اور انگریزی
کے رسالے رکھے تھے۔ ٹورسٹ کلاس کو پار کر کے وہ فرسٹ کلاس
میں چلے گئے۔ یہاں کی سیٹیں تو ویسی ہی تھیں مگر ایک طرف چند
گدے دار سیٹیں الگ از قسم لاؤنج بھی رکھی تھیں۔ جہاز میں بڑے
ہلکے سروں کی خوشگوار موسیقی تیر رہی تھی۔ جہاز نے بھاگ کر
ایک دم زمین چھوڑی تو گل کو یوں لگا جیسے جہاز نہیں وہ خود ہوا
میں معلق ہو گئی ہو۔ مکان چھوٹے چھوٹے نظر آنے لگے، پھر
اور چھوٹے ہو گئے۔ لاہور چھاؤنی کے نزدیک ریل گاڑی جاتی
دکھائی دی جیسے بچوں کا کھلونا۔ سڑک پر کاریں اور بسیں بھی منی منی
نظر آ رہی تھیں۔ کھیت چوکور اور مستطیل سبز ٹکڑوں کی شکل میں
پھیلے ہوئے تھے۔ جہاز اُوپر اُٹھتا رہا اور جلد ہی پچیس ہزار فٹ
کی بلندی تک پہنچ گیا۔ جہاز کے اندر کھٹی میٹھی گولیوں کے بعد اب
جوس کے چھوٹے گلاس بٹ رہے تھے۔ لوگ بظاہر اخبار اور
رسالے پڑھنے میں مصروف تھے مگر جب بھی ائیر ہوسٹس آتی تھی
اپنی بھدی بیویوں کے جسموں سے اکتائے ہوئے لوگ ان کے
کسے کسائے جسموں کا حدِ نظر تک پیچھا کرتے تھے۔ گل چپکے چپکے

یہ دیکھ کر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ جنہیں شاید ہفتوں بے
سے بات کرنے کو کوئی موضوع نہ سُوجھتا ہو وہ آتے جاتے
ہوائی میزبانوں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ وہ خوش
مگر تیزی سے جواب دے کر چلی جاتی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ
مشینی قسم کی دلربائی تھی۔ ذرا دیر بعد جو گل نے باہر دیکھا تو نیچے
منظر بادلوں میں چھپ چکا تھا۔ جہاز کے پروں کے نیچے سے
کے پرے کے پرے تیرتے ہوئے جا رہے تھے مگر بہت
دُور اُفق پہ آسمان اور زمین کی یک رنگ نیلی دُھند میں برف
چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں نیلے آسمان پر سفید
سرمئی بادل جمے کھڑے تھے۔ اس وقت جہاز پر اعلان ہوا
ہم فیروزپور کے اُوپر سے گزر رہے ہیں، دہلی اور لکھنؤ سے
اڑان ہوگی۔ ذرا دیر کو زمین پہ ٹائلوں کی طرز کے سبز، زرد اور
چھوٹے بڑے ٹکڑے نظر آئے جنہیں پگڈنڈی کی شکل کی لمبی
لائنیں دُور تک کاٹتی چلی جا رہی تھیں اور پھر سارا منظر غائب
گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بادلوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا
بادل سفید سفید پھٹکیوں کی شکل کے تھے جیسے نیلے پانی پہ
جھاگ۔ اُفق پر زمین آسمان کا امتیاز مشکل تھا، بس ہلکے

نیلے اور آسمانی رنگ آپس میں گھلتے ملتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اس سے اُوپر آسمانی رنگ کی ایک خاصی چوڑی گوٹ اُس کے بعد گہرا اودا رنگ تھا جیسے گھٹا گھر آئی ہو۔ اس وقت ان کے سر پر یہ آسمان تھا جیسے کالی سیاہ رات۔

"شاید آثم ڈھاکہ ایئر پورٹ پر موجود ہو۔" شمسی صاحب نے کہا۔

آثم ـــــــ شمسی صاحب کا بھتیجا یعنی خود اس کا بھتیجا جو ان کی شادی میں نہیں آیا تھا بس گل اس کے بارے میں اتنا جانتی تھی۔

"مجھے کچھ آثم کے بارے میں بتائیے، کتنا بڑا ہے، کیا کرتا ہے؟"

شمسی صاحب ہنسے اور اسے آثم کے بارے میں بتانے لگے۔ وہ اس سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ وہ ان کے نزدیک کچھ سنکی اور من مانی کرنے والا لڑکا تھا۔ عمر چھوٹی تھی اور اس نے اپنے دماغ کو ہر طرح کی الم غلم کتابوں سے بھر لیا تھا جس کی وجہ سے اس کا دماغی توازن ذرا بگڑ گیا تھا۔ کبھی اسے دنیا بڑی حسین اور زندگی اللہ میاں کا ایک نادر تحفہ نظر آتی تھی اور

کبھی وہ اسے جہنم سے زیادہ ہولناک اور بدتر دکھائی دیتی تھی۔ کبھی خودکشی کرنے والے بزدل تھے اور کبھی دُنیا اتنی بے معنی تھی کہ خودکشی نہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں ملتا تھا۔ کبھی وہ شکار کا رسیا ہو جاتا تھا، کبھی اہنسا کا پرچار کرنے لگتا تھا۔ کبھی وہ نوابوں کی طرح رہتا تھا کبھی صوفیوں کی طرح، کبھی سادھو بن جاتا تھا۔ جب کبھی اس پر خود روزی کمانے کا بھُوت سوار ہوتا تو وہ عجیب عجیب پیشے اختیار کرتا۔ کبھی کسی کالج میں پروفیسر ہے تو کبھی کسی کارخانے میں مزدور، کبھی ریڈیو آرٹسٹ ہے تو کبھی کسی گودام میں چوکیدار۔ زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کے شوق میں وہ پاتال تک اُتر جاتا تھا، کبھی مچھیروں کی ٹولی میں جا شامل ہوا کبھی برمیوں کی بستی میں جا بسا۔ جس طرح اس کے خیالات بدلتے تھے اسی طرح اس کے لباس میں ردوبدل ہوتا تھا۔ کبھی بنگالی کرتہ اور تہمد ہے تو کبھی خالی بنیان اور چادر ہے اور کبھی بہترین درزیوں سے سلوائے ہوئے سوٹ ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ہر خواہش آسانی سے پوری ہو جاتی تھی اور جلد ہی دم توڑ دیتی تھی۔ اس بیان کی روشنی میں گل نے جب اس بھتیجے کی تصویر ذہن میں بنانی چاہی تو بُری طرح ناکام ہوئی۔ ایک ہیولہ اُبھرا تو بہت سے

سروں والے ایسے جانور کا جس کا ہر سر مجدا شکل کا تھا۔ کسی سر پر دو سینگ تھے تو کسی ماتھے پر ایک، کسی کی چار آنکھیں تھیں تو کسی کی آٹھ۔ گل بغیر ملے ہی اس ہستی سے ڈر گئی۔

جہاز میں دہلی پر سے گزرنے کا اعلان ہو رہا تھا اور لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک کر یوں ڈھونڈ رہے تھے جیسے سوئی تلاش کی جا رہی ہو۔ دھند میں سوائے ایک بہتے ہوئے پانی کے دھارے کے کچھ نظر نہ آیا۔ اسے دریائے جمنا مان کر لوگ صبر شکر سے بیٹھ رہے۔ بادل اور گہرے ہوتے جا رہے تھے اس لیے سب نے کتابوں میں پناہ لی۔ گاہے بگاہے جہاز میں ایک نظر بھی ڈال لیتے تھے۔ گل اور شمسی صاحب اٹھ کر لاؤنج کی کھڑکیوں کے کنارے بنی ہوئی نیلے کور کی خوبصورت بنچوں پر بیٹھ گئے، اخبار، رسالے دیکھتے رہے اور تشتری میں رکھے ہوئے پھل ٹونگتے رہے۔

ڈھاکہ پہنچنے سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے جہاز آہستہ آہستہ نیچے آنا شروع ہوا اور اس کی بے داغ اڑان میں ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ حفاظتی بند باندھ لینے کا اعلان ہوا اور پھر جہاز ڈھاکہ ہوائی اڈے پر اترا۔ ڈھائی گھنٹے میں وہ ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کر آئے تھے ایک جگہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

سیڑھیوں کے پاس جہاز کا عملہ خدا حافظ کہنے کو کھڑا تھا۔ ہوائی اڈے پر خوب روشنی ہو رہی تھی۔ ذرا فاصلے پر استقبال کرنے والوں کا جمگھٹا تھا۔ ان میں آتم بھی تھا۔ شمسی صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا اور گل سے اس کا تعارف کروایا۔ گل نے دیکھا کہ اس کے سامنے آٹھ سروں والے راکھشس کے بجائے ایک لمبا چوڑا گورا چٹا مرد کھڑا ہے جس کی نیلی نیلی آنکھیں ہیں اور جس کے بال کچھ احتیاط سے سنورے ہوئے کچھ لاپروائی سے بکھرے ہوئے ہیں۔ آتم نے نہ صرف سلام کیا بلکہ مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا۔ گل نے اس کے موٹے موٹے سرخ ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ دیکھی اور جھینپے جھینپے انداز میں ہاتھ بڑھا دیا۔ آتم کے ہاتھ کی بجلی کے کوندے ایسی سفیدی گل کو بڑی عجیب لگی۔ آج تک کسی مرد کا اتنا سفید ہاتھ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی بے انتہا سفید پشت پر لمبے لمبے سیاہ بال تھے۔ اس کی آواز میں ایک خاص مردانہ قسم کا بھاری پن تھا جو گل کے کانوں کو اچھا لگا۔ اس کی اداؤں میں ایک خاص بے ساختگی تھی جو گل کو اور بھی اچھی لگی۔

"طے یہ ہوا ہے" آنم نے دونوں کے درمیان چلتے ہوئے کہا۔
"کہ شاہ باغ ہوٹل میں دو دن قیام فرمایا جائے اور ڈھاکہ، نرائن گنج اور
آس پاس کی جگہوں کی سیر کی جائے۔ اس کے بعد ہوم سویٹ ہوم"
"بھئی! ابھی سیر کا کون سا موقع ہے، اتنی دور سے آرہے ہیں اور
پھر اب تو رہنا ہی یہیں ہے۔
"اس کا مطلب ہے اب سیر دیر سے ہاتھ کھینچ لیا جائے کیونکہ انسان
جہاں رہتا ہے وہاں کی سیر کبھی نہیں کرتا۔ سنا ہے آپ نے ان صاحب
کا قصہ جنہوں نے ساری عمر آگرے میں گزار دی اور تاج محل نہیں دیکھا یہ
سوچ کر کہ بھئی کہیں بھاگا تھوڑی ہی جا رہا ہے جب چاہیں گے دیکھ
لیں گے، پھر فسادات میں خود بھاگ آئے اور تاج محل ان کے لیے
خواب ہو گیا۔"
"بھئی مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اگر گل کی مرضی ہو۔"
"آپ فرمائیے، کیا بہت تھک گئی ہیں؟"
"نہیں تھکن تو بالکل نہیں ہوئی۔"
"چلیے، پھر یہ تو طے ہوا۔ ائرپورٹ کی عمارت کے اندر آ کر شمسی
صاحب تو کرسی پہ دراز ہو گئے کہ ڈاکٹروں نے ان کو تھکنے سے منع
کر رکھا تھا۔ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ تھکانا ان کے لیے مہلک

ہو سکتا تھا۔ بھیڑ بھڑکے سے گھبرا کر آثم اور گل پھر عمارت کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ سامان آنے کا انتظار تھا۔ دور دور تک میدان تھا جس میں مختلف ملکوں کے جہاز آجا رہے تھے۔ اس وقت دائیں بائیں دیکھتی ایک صاحبہ بے حد گھبرائی ہوئی وہاں سے گزریں۔ اس وقت کے فیشن کے عین مطابق ان کے سر پہ بالوں کا پہاڑ تھا اور بھنویں بڑی تیکھی تھیں۔

"نہ جانے عورتیں اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں رہتی ہیں؟" آثم نے ان کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ ——— تم ہماری شادی میں کیوں نہیں آئے؟" گل نے صرف بات کرنے کے لیے پوچھا۔

"سچ کہوں ——" وہ مسکرایا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے نیلے ستارے ٹمٹمائے۔

"میں نے سوچا جانے کون کھوسٹ بڑی بی ہوں گی جو دلہن بننے کی ناکام کوشش فرمائیں گی اور انہیں دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوگی اس لیے نہ جانا ہی بہتر ہے۔" گل ہنس پڑی۔

"مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔" اس نے دور جہاز کی بتیوں پر نظریں گاڑ کر کہا۔

"کیا۔" گل نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ایک نازنین کہ سن جس کا سولہ کہ سترہ برس کا تھا اور ——"

"یہ کہاں کی زبان بول رہے ہو"

"فسانہ عجائب کی —— ارے یہ کیا پڑا ہے" اس نے جھک کر ایک چنا ہوا دوپٹہ اٹھایا "کمال ہے دیکھ رہی ہیں آپ افراتفری کا عالم، عورتیں اپنے دوپٹے تک چھوڑے جا رہی ہیں" ابھی وہ دوپٹہ ہاتھ میں نچا کر یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ وہی صاحبہ جن کے سر پہ بالوں کا پہاڑ کھڑا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھپاتی کچھ لجاتی، کچھ گھبراتی آئیں اور دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"معاف کیجئے یہ میرا ہے"

"ضرور آپ ہی کا ہو گا، میرا نہیں ہے" آتم نے دوپٹہ ان کی طرف بڑھایا۔ دوپٹہ اوڑھ کر بھی وہ وہیں کھڑی کسمساتی رہیں اور پریشانی سے چاروں طرف دیکھتی رہیں۔

"آپ کو کسی کی تلاش ہے؟" آتم نے پوچھا۔

"جی ہاں میرے بھائی کو میلا سے مجھے لینے آنے والے تھے وہ کہیں نظر نہیں آتے میں اکیلی لاہور سے آئی ہوں"

"اوہو —— اگر وہ نہ آئے تو آپ کو بڑی دقت ہو گی۔ آپ تھوڑی دیر اور انتظار کر لیجئے آپ کے بھائی نہ آئیں تو آپ ہمارے ساتھ چلیے

شاہ باغ ہوٹل، صبح آپ کو میلا چلی جائیں۔" یہ کہہ کر آثم نے گل کی طرف دیکھا
گل خاموش رہی۔ سامان آنے میں کچھ دیر تھی۔ آئیے چائے پئیں۔ تینوں
اندر آئے، شمسی صاحب کو لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ پردے
کھنچے ہوئے تھے اور چائے پینے والوں کی خوب گہما گہمی تھی۔ گل ایک طرف
کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ آثم نے چائے کا آرڈر دیا اور گل کے پاس
آیا۔ "آپ نے کیوں منہ بنا رکھا ہے، ان صاحبہ سے میں نمٹ لوں گا،
آپ کے میاں پر آنچ نہیں آئے گی۔" گل ہنس پڑی، "عجب مسخرہ ہے۔
پہلی دفعہ ملنے پر کیسی بے تکلفی سے باتیں بنا رہا ہے جیسے برسوں ساتھ
کے کھیلے ہوں۔ دونوں"

ابھی وہ سب چائے پی رہے تھے کہ ایک صاحب گھبرائے ہوئے
داخل ہوئے۔ بالوں کی وضع چھوڑ کر وہ قطعی ان صاحبہ کے بھائی تھے
بھائی بہن تپاک سے ملے۔ بھائی نے وقت پہ نہ پہنچ سکنے کی معذرت
کی۔ بہن نے بتایا کہ یہ خیر خواہ کنبہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار تھا۔
بھائی نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر جلدی کے خیال سے ان کی چائے کی
پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ جب وہ دونوں خدا حافظ کہہ کر چلے تو لڑکی کے قدم
رک رک کر اٹھ رہے تھے۔ یکایک بھائی کی آمد کی خوشی اس کی پہلی
پریشانی کے مقابلے میں کتنی کم تھی یہ محسوس کر کے گل مسکرائی۔ آثم کی

شخصیت میں کچھ نہ کچھ جادو ضرور تھا۔

دوسرے دن وہ نرائن گنج کی سیر کو نکلے۔ ڈھاکے کی سڑکوں پر دونوں طرف کٹھل کے درخت تھے اور خوب سبزہ تھا۔ نئی نئی کئی منزلہ عمارتیں بن رہی تھیں۔ ڈھاکہ گل کے اندازے سے کہیں بڑا اور شاندار تھا۔ رمنا۔ پارک، بلدہ گارڈن راستے میں پڑتے تھے ان کو بھی دیکھنا ضروری تھا۔ بلدھہ گارڈن کے پیڑ، پیڑوں اور بیلوں کو دیکھ کر گل حیران رہ گئی سینکڑوں نہیں ہزاروں لاکھوں قسمیں تھیں اور ان میں سے شاید ہی پہلے کوئی اس کی نظر سے گزری ہو۔ اس کے سوالوں کو آثم بنگلہ میں منتقل کر کے مالی کے گوش گزار کرتا اور پھر مالی کے جوابوں کو کچھ چٹ پٹے مصالحے کے ساتھ گل تک پہنچاتا۔ شمسی صاحب حسب عادت تھوڑا سا چلنے کے بعد سرخ اور سفید گلابوں کے جھنڈ میں بیٹھ گئے جہاں ایک قبر پر انگریزی میں ایک خوبصورت نظم درج تھی۔ گل اور آثم مالی کی معیت میں ٹہلتے پھرے۔ ہر پیڑ اور پودے میں کوئی نہ کوئی انوکھی چیز تھی۔ ایک درخت تھا کہ جس کی لمبی لمبی پھلیوں کی طرح کی شاخوں پر سبز بال تھے۔ ایک دوسرے درخت کی شاخیں پھوٹ کر اوپر جانے کے بجائے زمین میں پیوست ہو جاتی تھیں اور جڑ بن کر درخت کو سہارا دے رہی تھیں۔ ایک درخت تھا کہ جیسے عام درخت ہوتے ہیں، شاخیں

بھی اور پتے بھی مگر اس کی خصوصیت یہ تھی کہ پھولوں کی شاخیں ہر جگہ براہِ راست تنوں سے پھوٹ رہی تھیں جن میں پتے نہیں تھے۔ یہ پیلے رنگ کے کاغذی سے پھول تھے جن میں کوئی خوشبو نہیں تھی گل ایک ایک چیز کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی، عجب طلسماتی سلسلہ تھا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک درخت کی مختلف شاخوں میں سے مختلف قسم کی بیلیں پھوٹ رہی ہیں، جنگلے میں لاتعداد گملوں میں طرح طرح کے پودے اور بیلیں تھیں۔ بعض پودے پتھروں، کوئلوں اور ہڈیوں میں سے پھوٹ رہے تھے ان گملوں میں مٹی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ "یہ مشینی عہد کے پودے ہیں جو مشین کی طرح کوئلے اور انسانی ہڈیوں پر پلتے ہیں" آثم نے تمسخر سے کہا اور مالی غریب سے داد چاہی جس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملا دی، یہیں گل نے زندگی میں پہلی دفعہ پان کی بیل دیکھی جو اب تک صرف بازار میں بکتے ہوئے دیکھے تھے۔ پان بیل میں لگے ہوئے گل کو قطعی عجیب اور غیر فطری لگے جیسے ان کی اصلی جگہ ایکٹرسوں کی تصویروں سے سجی ہوئی پنواڑی کی دوکانوں کے گیلے ٹاٹ کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک پودا تھا کہ جس نے چھوٹے سے لکڑی کے گملوں کو اپنے شکنجے میں بری طرح کس رکھا تھا اس کی باریک شاخیں گملے کی لکڑیوں کو جکڑ کر نیچے لٹک رہی تھیں۔

ان شاخوں کے منہ بالکل کیڑوں کی شکل کے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لمبے لمبے ہرے رنگ کے کیڑے بیچ بیچ رینگ رہے ہوں۔" اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سارے پودوں میں زندگی کے ہزاروں رمز چھپے ہوئے ہیں یہ سارے درخت سمبولک ہیں، شاعروں کی نظموں کی طرح، اب مثلاً اسی پودے کو لیجئے۔ یہ گملا انسان ہے اور یہ پودا انسانی خواہشات ہیں جنھوں نے اس کو بری طرح جکڑ رکھا ہے، اس گملے کو یہ قدرت نہیں کہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر نیچے پھینک دے؟"

لیجئے شروع ہوئی سنک، گل نے سوچا۔ ٹھیک کہتے تھے شمسی، کوئی نہ کوئی پیچ ڈھیلا ہے یا پھر اس پر رعب ڈالنے کی بے کار کوشش ہو رہی ہے۔

باغ کے درمیان میں ہندو طرز کی ایک عمارت تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر ایک پلیٹ فارم آتا تھا اور پھر یہ سیڑھیاں نیچے تالاب میں اتر گئی تھیں۔ تالاب میں پتے تیر رہے تھے اور اس کا پانی مارے گندگی کے سبز کاہی ہو گیا تھا۔ یہاں انھوں نے مالی کو رخصت کیا اور ذرا دم لینے سیڑھیوں پر ٹک گئے۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے" آثم بولا "کہ آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کیا جائے؟"

"جناب آپ مجھے چچی یا آنٹی وانٹی تو فرمائیں نہیں، زیادہ سے زیادہ باجی کہہ سکتے ہیں۔"

"باجی، ہونہہ۔" اس نے اپنی خوبصورت ناک سکیڑی۔ "اس سے تو اچھا ہے میں آپ کو گل جی کہا کروں، اگر جی ہی لگانا ہے تو گل جی کیوں نہ کہیں نکلنا پیارا لگتا ہے۔ ہے نا۔"

گل کو یہ بے تکلفی کچھ بُری لگی کچھ اچھی بھی لگی۔ اصل میں آئم کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ اس پر یہ ساختہ بے تکلفی بھلی لگتی تھی۔ اگر ہوتا کوئی سوکھا مرجھلا سا لڑکا اور اس سے ایسی باتیں کرنے کی کوشش فرماتا تو وہ پہلے ہی جملے میں ٹوک کر اسے اس کی اوقات یاد دلا دیتی مگر یہ لمبا چوڑا سفید دلیو۔ اسے تو بھتیجا کہنے اور سوچنے میں بھی تامل ہوتا تھا۔

"ارے بھئی اب چلو دیر ہو جائے گی۔" شمسی صاحب آہستہ آہستہ چلتے وہاں آن پہنچے۔

پرانے ڈھاکے کے پہلو سے نکل کر وہ نرائن گنج کی سڑک پر ہو لیے۔ دونوں طرف حدِ نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے مگر کٹائی ہو چکی تھی۔ کہیں سرسوں اب بھی لگی ہوئی تھی جیسے سبز قالین پہ زرد گلکاری ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سبز رنگ کا پانی گڑھوں میں جمع تھا جس میں چوڑے پتوں کی بیل چھائی ہوئی تھی۔ اکثر جگہ پانی میں مرد اور بچے نہا

رہے تھے۔ انہیں پانیوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی کھڑی تھیں اور کہیں کہیں ان میں لڑکے بالے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان پانی کے گڑھوں کے درمیانی زمین پر سبز درختوں میں گھری چھوٹی چھوٹی باشائیں تھیں۔ بانس کی نازک کھپچیوں سے چٹائی کی طرح بنی ہوئی یہ باشائیں گل کے لیے بالکل انوکھی چیز تھیں۔ مختلف جگہوں میں رہنے سہنے میں کتنا فرق آجاتا ہے۔ گل سوچ کر حیران تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر یہ عقدہ کھلا کہ پنجاب کے گاؤں میں مکان مٹی کے، سرحدی پہاڑوں پر پتھروں کے اور اب یہاں بانس کے گھروندے کیوں ہیں۔ یہاں کے لوگ مچھلی کے اتنے شوقین کیوں ہیں اور بچہ بچہ تیرنا کیسے جانتا ہے۔ واقعی یہ مطالعہ بھی اپنی جگہ ایک دلچسپ چیز ہے مگر انسانی فطرتوں کا مطالعہ جو وہ اب تک کرتی رہی تھی دلچسپ تر ہے۔ باشاؤں کے باہر رسیوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ چونکہ زمین پر پانی ہی پانی تھا اس لیے لمبے لمبے بانسوں پر کبوتروں کی چھتریاں سی بنا کر ان پر کدو اور لوکی کی بیل چڑھائی گئی تھی ہر گھر کے آگے ایسے ہی چھپر ترکاریوں کے چھائے تھے۔ یہ جانور جسے انسان کہتے ہیں کیسے ہر جگہ اپنے رہنے کا ڈھب بنا لیتا ہے۔ مرغیاں اور بطخیں کیچڑ میں لت پت پھر رہی تھیں۔ عورتیں صرف ایک ساری لپیٹے جو عام طور پر گہرے ہرے، نیلے یا اودے رنگ کی تھیں تالابوں کے

"جناب آپ مجھے چچی یا آنٹی وانٹی تو فرمائیں نہیں، زیادہ سے زیادہ باجی کہہ سکتے ہیں۔"

"باجی، ہونہہ۔" اس نے اپنی خوبصورت ناک سکیڑی۔ "اس سے تو اچھا ہے میں آپ کو گل جی کہا کروں، اگر جی ہی لگانا ہے تو گل جی کیوں نہ کہیں نکلنا پیارا لگتا ہے۔ ہے نا۔"

گل کو یہ بے تکلفی کچھ بری لگی کچھ اچھی بھی لگی۔ اصل میں آئم کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ اس پر بے ساختہ بے تکلفی بھلی لگتی تھی۔ اگر ہوتا کوئی سوکھا مرجھلا سا لڑکا اور اس سے ایسی باتیں کرنے کی کوشش فرماتا تو وہ پہلے ہی جملے میں ٹوک کر اسے اس کی اوقات یاد دلا دیتی مگر یہ لمبا چوڑا سفید دیو۔ اسے تو بھتیجا کہنے اور سوچنے میں بھی تامل ہوتا تھا۔

"ارے بھئی اب چلو دیر ہو جائے گی۔" شمسی صاحب آہستہ آہستہ چلتے وہاں آن پہنچے۔

پرانے ڈھاکے کے پہلو سے نکل کر وہ نرائن گنج کی سڑک پر ہو لیے۔ دونوں طرف حد نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے مگر کٹائی ہو چکی تھی۔ کہیں سرسوں اب بھی لگی ہوئی تھی جیسے سبز قالین پر زرد گلکاری ہو رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سبز رنگ کا پانی گڑھوں میں جمع تھا جس میں چوڑے پتوں کی بیل چھائی ہوئی تھی۔ اکثر جگہ پانی میں مرد اور بچے نہا

رہے تھے۔ انہیں پانیوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی کھڑی تھیں اور کہیں
کہیں ان میں لڑکے بالے بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان پانی کے گڑھوں
کے درمیانی زمین پر سبز درختوں میں گھری چھوٹی چھوٹی باشائیں تھیں۔
بانس کی نازک کھپچیوں سے چٹائی کی طرح بنی ہوئی یہ باشائیں گل کے
لیے بالکل انوکھی چیز تھیں۔ مختلف جگہوں میں رہتے سہنے میں کتنا فرق
آجاتا ہے۔ گل سوچ کر حیران تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر یہ عقدہ
کھلا کہ پنجاب کے گاؤں میں مکان مٹی کے، سرحدی پہاڑوں پر پتھروں
کے اور اب یہاں بانس کے گھروندے کیوں ہیں۔ یہاں کے لوگ مچھلی
کے اتنے شوقین کیوں ہیں اور بچہ بچہ تیرنا کیسے جانتا ہے۔ واقعی یہ مطالعہ
بھی اپنی جگہ ایک دلچسپ چیز ہے مگر انسانی فطرتوں کا مطالعہ جو وہ اب
تک کرتی رہی تھی دلچسپ تر ہے۔ باشاؤں کے باہر رسیوں پر کپڑے
سوکھ رہے تھے۔ چونکہ زمین پر پانی ہی پانی تھا اس لیے لمبے لمبے بانسوں
پر کبوتروں کی چھتریاں سی بنا کر ان پہ کدو اور لوکی کی بیل چڑھائی گئی تھی
ہر گھر کے آگے ایسے ہی چھپر ترکاریوں کے چھائے تھے۔ یہ جانور جسے
انسان کہتے ہیں کیسے ہر جگہ اپنے رہنے کا ڈھب بنا لیتا ہے۔ مرغیاں اور
بطخیں کیچڑ میں لت پت پھر رہی تھیں۔ عورتیں صرف ایک ساری لپیٹے
جو عام طور پر گہرے ہرے، نیلے یا اودے رنگ کی تھیں تالابوں کے

کنارے بیٹھی برتن مانجھ رہی تھیں یا کسی کام سے آجارہی تھیں۔ دُبلی تپلی، کمپچی سی سانولی سلونی عورتیں۔ بعض کی دھوتیاں گھٹنوں تک تھیں مگر سر اور گردن پر اچھی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ مرد سانولے رنگ، چھوٹے قد اور سلگتی آنکھوں کے مالک تھے جو چارخانے کے یا عورتوں کی دھوتیوں کے رنگ کے تہمد باندھے تھے۔ خال خال سفید پاجامے میں نظر آرہے تھے۔ گل باہر دیکھتی جارہی تھی مگر شمسی صاحب اور آثم ان چیزوں سے بے نیاز اس بحث میں لگے ہوئے تھے کہ پرانی کار تو بیچ دی گئی ہے اب کون سی نئی گاڑی لی جائے۔ شمسی صاحب نے رات کو اسے بتایا تھا کہ اس دفعہ تو خلاف توقع آثم آدمی کی جون میں تھا۔ اس وقت وہ بالکل عام مردوں کی طرح مختلف کاروں کے نئے ماڈلوں اور ان کی قیمتوں پر بحث کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نئی امپورٹ پالیسی آنے پر کار کی قیمت کم ہو جائے گی کیونکہ اس دفعہ کاروں پر ڈیوٹی گھٹنے کا امکان تھا۔ اُف، یہ مرد جس موضوع پر بات کرتے کبھی نہیں تھکتے وہ کار کا موضوع ہے۔ گھنٹوں بلا تکان بولے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک کار کا ایک ایک نیا اور پرانا ئیرزہ انہیں ازبر ہے۔ کون سی کار کے کس ماڈل میں کیا اضافے ہوئے ہیں ایسے یاد رکھتے ہیں جیسے زیست کا سارا دارو مدار ان اضافی پرزوں پر ہی تو ہے۔ گل یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنسی۔ سیر

کے لیے نکلے ہیں باتیں ہو رہی ہیں کاروں کی۔ تاریخی مقامات پہ جائیں گے تو ان جگہوں کو بھول کر وہاں کھڑی سیاحوں کی موٹروں پہ تبادلہ خیالات شروع کر دیں گے۔ مرد بھی ایک دلچسپ چیز بنائی ہے اللہ میاں نے ان کے بغیر بھی زندگی خاصی بدمزہ ہوتی۔

نارائن گنج کے گھاٹ پر اترے۔ بوڑھی گنگا کے چوڑے سینے پر بے شمار چھوٹی بڑی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ اور بہت سے کناروں پر کھڑی تھیں۔ منشی گنج کے بے حد بڑے اور لذیذ کیلے کھانے کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آثم نے پوچھا۔

"گل جی، گوشہ میں بیٹھے گا یا نوکا میں؟"

"یہ کیا بلائیں ہیں بھئی؟"

"اتنے خوبصورت نام آپ کو بلائیں کیسے نظر آرہے ہیں جناب یہ کشتیاں ہیں۔ یہ نوکا ہے اور یہ چھوٹی کشتی گوشہ ہے۔"

"ہاں ہاں دریا کی سیر کر آؤ، یہاں کا یہ مزا بھی تو چکھو۔" شمسی صاحب نے بڑھا دیا ایک چھوٹی سی کشتی آگئی، گل بیٹھنے لگی تو دیکھا کہ کشتی میں یہاں سے وہاں تک تختے لگے ہوئے ہیں اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اندر ایک چٹائی پڑی تھی، اوپر گول چھت تھی۔ مجبوراً دونوں ٹانگیں ملا کر یوں بیٹھ گئی جیسے فرش پہ بیٹھا جاتا ہے۔ آثم بھی

اپنی قیمتی پتلون کا ستیاناس مار کر اسی انداز میں بیٹھ گیا مگر شمسی صاحب نے کشتی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

"لاؤ کیمرہ مجھے دے دو میں تصویریں لے لوں گا۔" انہوں نے کہا۔

سب سے پہلے انہوں نے ان دونوں کی تصویریں لیں اور پھر اچھے منظر کی تلاش میں ایک طرف کو بڑھ گئے۔ کشتی آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہو رہی تھی کیونکہ دریا بہت سست رفتار تھا۔

"وہ اسٹیمر کھڑے ہیں؟" گل نے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"جی نہیں وہ تو معمولی فیریاں ہیں، اسٹیمر اس سے بہت بڑا ہوتا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" گل نے میلے پیلے رنگ کی ایک بے حد بڑی اور بے ڈھنگی جہاز نما چیز کی طرف اشارہ کیا جو کائی اور دھوئیں سے سیاہ ہوئی کھڑی تھی۔

"یہ دریا کی مٹی نکالنے پر مامور ہے۔" آتم نے بتایا۔

دفعتاً سیٹی کی پے بہ پے آواز آنے لگی۔ گل نے دیکھا تو دائیں طرف ایک بڑا سا اسٹیمر چلا آ رہا ہے اور وہ عین ان کی زد میں ہیں۔ گل گھبرا گئی۔

"ارے اس سے کہو خدا کے لیے جلدی سے نکالے۔"

"آج ہی کشتی لے کر تھوڑی نکلا ہے بے چارہ ساری عمر ہو گئی یہی کام کرتے۔" آتم نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ ملاح بھی جو اُردو کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا اسی دلجمعی سے بیٹھا رہا اور گل کی جان نکلتی رہی۔ اسٹیمر سیٹیاں بجا بجا کر اور اس کے اوسان خطا کر رہا تھا اور یوں درآتا نزدیک چلا آ رہا تھا جیسے کوئی مگرمچھ کسی مچھلی کو کھانے نکلا ہو۔ اسٹیمر اور نزدیک پہنچا تو گل کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ اس کی زد سے نکل چکے ہیں مگر ابھی وہ اس کی پیدا کردہ لہروں کی زد سے نہیں نکلے تھے جو ایک کے بعد ایک غراتی چلی آ رہی تھی۔ کہاں تو کشتی اس سکون سے بہہ رہی تھی کہ چلتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی اور کہاں ان طوفانی لہروں پر وہ یوں ڈولی جیسے ابھی اُلٹ جائے گی۔ گل نے چیخ ماری اور سمٹ کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ آتم نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ لمحہ بھر کو اس کا سر آتم کے سینے سے لگا رہا پھر اس نے گھبرا کر الگ کر لیا۔ لہریں تھیں کہ دراتی چلی آ رہی تھیں اور ہر لہر پر کشتی اُبھر کر یوں نیچے جاتی جیسے اب تہہ میں اُترتی چلی جائے گی۔ اتنے میں ایک اور اسٹیمر آتا دکھائی دیا۔ گل سفید پڑ گئی۔ پاس سے ایک فیری گزر گئی۔ کشتی کی اور گل کے دل کی حالت اور تباہ ہو گئی۔ "ہائے اللہ آج ہمارا بچ نکلنا مشکل ہے یہاں

سے، دیکھو وہ اسٹیمر۔"

"جان بڑی پیاری ہے آپ کو؟" وہ طنز سے مسکرایا۔

"نہیں نہیں ہے۔" گل چڑی۔

"بالکل نہیں ہے کیسے تو ابھی کود جاؤں۔" گھٹنے سمیٹے، کھسک کر وہ آگے بڑھا تو گل نے اسے زور سے پکڑ لیا۔ آتم ہنس پڑا۔ اس دوران میں گل کو پتہ چل چکا تھا کہ لہروں پر کشتی بری طرح ڈول تو ضرور رہی تھی مگر اتنی خطرے میں نہیں تھی جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

"آپ کو تیرنا آتا ہے؟" آتم نے پوچھا۔

"ہاں ——— سوئمنگ پول والا۔"

"پھر تو کوئی بات نہیں۔ کشتی الٹی بھی تو آپ صفا بچ جائیں گی اور میں مفت میں مارا جاؤں گا ——— یا آپ بچا لیں گی مجھے؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"ارے بھئی کوئی اور بات کرو، یہ فیری اندر سے دکھاؤ نا ہمیں۔" گل نے کہا۔ آتم نے ملاح سے بنگلہ میں کچھ کہا۔ اس نے فیری کے ساتھ کشتی لگا دی۔ فیری پر درج تھا "بیتا لکھیا"۔ اس وقت فیری کے اوپر چڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ فیری کے جسم کے گول سوراخ میں پاؤں رکھ کر انہوں نے لوہے کی دیوار پھلانگی۔ اندر کے تکونے حصّہ میں چار پانچ مرد لنگی

باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اور اندر بڑھ گئے۔ جہاز کے عملے کا لمبا سا ایک کیبن تھا جس میں بستر بچھے ہوئے تھے۔ اوپر چڑھ کر اُنہوں نے جہاز کا انجن اور کیپٹن کا کیبن دیکھا۔ ڈیک پر برابر برابر بینچیں مسافروں کے لیے تھیں۔ "فیری میں سفر کرنے میں مزا تو آتا ہوگا؟" گل نے پوچھا۔

"جی ہاں، مجھے تو پانی کے ہر سفر میں مزا آتا ہے، پانی اور مٹی سے ہمارا ازلی رشتہ ہے اور یہاں دونوں وافر ہیں اسی لیے آدمی مشرقی پاکستان میں اکتاتا نہیں، اُمید ہے آپ بھی یہاں بور نہیں ہوں گی۔"

وہ واپس لوٹے۔ راستے میں اسٹیمر وغیرہ نہ ملے اس لیے راہ بے خطر کٹی۔ کنارے کے نزدیک لہروں نے پھر زور باندھا مگر اب کے گل اتنا نہ ڈری۔ اس دوران میں شمسی صاحب کئی تصویریں لے چکے تھے اور اب ملاحوں سے مصروف گفتگو تھے۔ ملاح سیدھے سادھے بے ضرر لوگ۔ آثم نے کشتی والے کو پیسے دیے اور وہ دونوں شہتیروں کے بند پر سے گزرتے خشکی پر آ گئے۔ راستے کے لیے مزید کیلے لیے گئے اور اس دفعہ وہ جوٹ ملوں کی طرف سے ہو کر آئے۔ یہاں سڑکوں کے دونوں طرف پانی نسبتاً کم تھا۔ مکان ٹیلوں پر تھے اور ناریل تاڑ، کھجور اور چھالیہ کے درختوں میں تقریباً چھپے ہوئے تھے۔ ہر گھر سے تھوڑے فاصلے پر بانسوں کے اوپر بنی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ یہ بالکل

شکستہ منڈیروں پر بیٹھ جاتے، گل اور آثم شریر و آوارہ بچوں کی طرح بھاگتے پھرتے۔ گل سوچتی کیا ہی اچھا ہو جو انسان بغیر گھر بنائے یوں ہی آزاد پنچھیوں کی طرح اُڑتا پھرے، آخر انسان اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کا شوقین کیوں ہے۔ جب گل نے یہ بات آثم سے کہی تو اس نے کہا۔" انسان ہر بات سے اکتا جاتا ہے گل جی۔ جب وہ گھر میں ہوتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے سمندر کے سینے پر تیرے اور برف پوش چوٹیوں کو سر کرنے کی مہموں پہ نکلے مگر جب وہ زیادہ دیر باہر رہتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے، اس کا ایک گھر ہو جہاں وہ سستی سے پڑا ابنڈ تا رہے اور کسی پر حکم چلا سکے، میں بہت دن پھرتا رہا ہوں اور معلوم ہے مجھے کوفت کس چیز سے ہوتی تھی چلتے وقت کے حساب کتاب سے۔ دل چاہتا تھا کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے میں جب چاہوں چل دوں، بل ادا کرنے اور ٹپ دینے کی مصیبت نہ ہو، اسی لیے شاید میں سادھو بن گیا تھا مگر ــــــ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا ــــــ" آثم کی بات کچھ گل کی سمجھ میں آتی تھی، کچھ نہیں آتی تھی مگر اسے اچھی ضرور لگتی تھی جیسے آدمی کوئی مشہور زمانہ کتاب پڑھ رہا ہو مگر ایسی ادق جو کہیں کہیں سے ہی پلے پڑتی ہو۔

تین دن محض سیر میں بتا کر چوتھے دن وہ پھر ائرپورٹ پر کھڑے

تھے گھر جانے کے لیے۔ جانے یہ نیا گھر کیسا ہو گا۔ گل سوچ رہی تھی۔ گھر
سے گل کے ذہن کی مراد صرف مکان نہیں تھا بلکہ وہ سارا ماحول، وہ
ساری زندگی جو اسے اس نئی فضاؤں میں گزارنی تھی۔ آثم کو تو اس نے
پسند کر لیا تھا جو اس کے نئے ماحول اور نئی زندگی کا ایک اہم
حصہ تھا مگر اور آگے کیا تھا مستقبل آج پھر محض ایک دیوار تھی جس کے
آگے اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ائرپورٹ پہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک
جہاز ابھی ابھی پہنچا تھا۔ لوگ اُتر کر آرہے تھے، استقبال کے لیے
آنے والوں سے مل رہے تھے، کچھ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب
کے ان کا سفر فوکر فرینڈ شپ میں تھا جو جیٹ سے ہر معاملے میں کمتر
تھا۔ ایک لمبے طرح پیٹے ہوئے صاحب آئے اور اسٹورڈ نے
انہیں آثم کے برابر کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ پیچھے کمر ٹکا کر وہ بے دم
ہو کر پڑ رہے۔ اس وقت انہیں یہ ہوش نہیں تھا کہ وہ زمین پر ہیں
یا آسمان پہ۔ اعلان ہوا کہ جہاز آٹھ ہزار فٹ بلندی پر پرواز کرے
گا اور آدھ گھنٹے میں چٹاگانگ پہنچ جائے گا۔

"شام کو جب موسم ذرا صاف ہوا تو وہ باہر نکلے اور بیرے کی ہدایت پر سیف الملوک غار
دیکھنے چلے گئے جو یہیں ناران میں بستی کے پیچھے تھوڑے سے فاصلے
پر واقع تھا۔ بارش کے بعد کچی سڑک جو بازار کے بیچ میں سے گزر کر

جاتی تھی ناقابلِ بیان حد تک غلیظ ہو گئی تھی۔ گلگت کی سردی سے گھبرا کر
نیچے اُترنے والے قافلوں کے پیروں نے روند روند کر اسے سیاہ اور نیم
گندھے ہوئے آٹے کی شکل کا کر دیا تھا، اس پر جانوروں کی غلاظت نے
اور روند مچائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سُرخ و سفید بچے اپنی اپنی مرغیاں
بغلوں میں دبائے کیچڑ سے لت پت پاؤں لیے سیر کرنے والوں کی زیارت
کے لیے سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دو کانیں تھیں،
پرچون کی دوکانوں میں نمک کی دیواریں کی دیواریں چُنی ہوئی تھیں۔
کالی سوسی پر مشین سے بنائے گئے کام کے کرتے اور کروشیا کے موتی
ٹکے بٹوے دوکانوں کی زینت بھی تھے اور سیاحت کے لیے یہاں
سے لے جانے والی سوغات بھی۔ یہ چیزیں زیادہ تر غیر ملکی خریدتے
تھے۔ ناران کا بازار ختم ہو گیا تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کس طرف
جایا جائے۔ سامنے سڑک پر لکڑی کا ایک پل تھا جس کے نیچے موتیوں ایسے
سفید پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ جھیل سیف الملوک کی طرف سے آ رہا
تھا۔ یہیں سے دائیں طرف راستہ اس جھیل کی طرف جاتا تھا مگر سیف الملوک
غار کہاں تھا۔ انہوں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ وہ لڑکا ان کو پیچھے آنے
کا اشارہ کر کے آگے آگے چلنے لگا۔ ایک کچے گھر کے ساتھ ساتھ وہ
پتلی سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ گھر سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور اس کی

چھتوں کی ان گھڑی لکڑیاں بڑے بڑے تختے بن سے باہر نکلی ہوئی تھیں اس راہ میں بے شمار روکاوٹیں بھی تھیں۔ کہیں کہیں پگڈنڈی گڑھے میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ کہیں درختوں کی کثرت نے گزرنے کا راستہ ہی نہ چھوڑا تھا، اس پر چڑھائی الگ۔ آخر ایک جگہ ایک بڑے سے درخت کی جڑ میں پگڈنڈی دفعتاً ختم ہو گئی۔ لڑکا منڈیر سے نیچے کود گیا۔ گل اور جمال درخت کی شاخیں پکڑ پکڑ کر بہ ہزار دقت نیچے اترے اس طرف تھوڑے سے فاصلے پر دریائے کنہار بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دور دریا کے گول مول پتھروں پر چلنے کے بعد آخر کار وہ غار آ گیا۔ یہ غار عام غاروں کی سی گپھاہ نہیں ہے بلکہ پہاڑ کی پوری اونچائی میں چوڑا سا شگاف ہے جیسے پہاڑ کسی زلزلے میں پھٹ کر دو ہو گیا ہو۔ اس شگاف کے اوپر ایک پتھر قدرتی طور پر یوں رکھا ہوا ہے جیسے دروازے کی چوکھٹ ہوتی ہے۔ اس غار کی چوڑائی اتنی ہے کہ دو آدمی بیک وقت اس میں جا سکتے ہیں۔ کئی گز تک یہ غار سیدھا جاتا ہے اور پھر دائیں طرف مڑ جاتا ہے۔ غار میں ہر وقت اندھیرا رہتا ہے۔ جمال نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر ایک سلائی جلائی اور اندر چلا گیا مگر جلد ہی وہ واپس آ گیا۔ "یہ غار تو بہت لمبا معلوم ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

لڑکے نے بتایا کہ غار کئی میل لمبا ہے۔ اس غار میں سے بڑی پراسرار طور پر تیز اور ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ لڑکے نے یہ بھی انکشاف کیا کہ آج تک کسی نے اس غار کا دوسرا سرا نہیں دیکھا مگر عام خیال یہ ہے کہ دوسرا دہانہ کسی برفیلے پہاڑ یا وادی میں کھلتا ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔

"یہ غار کیوں مشہور ہے۔" گل نے لڑکے سے پوچھا۔

"پڑھا نہیں؟ اس میں شہزادہ سیف الملوک نے شہزادی کو تین دن رکھا تھا۔"

"اچھا پھر؟"

"بس پھر یہ ہوا اور وہ ہوا۔" لڑکے نے بڑے بھولپن سے کہا اور ان کو چھوڑ کر اخروٹوں کا کھیل کھیلنے واپس چلا گیا جسے چھوڑ کر وہ ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔

"آؤ اب دریا کے کنارے سے واپس چلیں۔ جمال نے گل کا ہاتھ تھاما اور وہ خاموشی سے چلتے رہے دراصل گل جمال سے ناراض بھی اور اس کی ایک بہت بڑی وجہ بھی تھی مگر ایسی سہانی جگہ گل ایک دم جھگڑنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ مردوں کی مختلف قسمیں ہیں کسی کو لوہے کی طرح تپا کر ایک ہی چوٹ لگائی جاتی ہے کسی کو آہستہ آہستہ موڑنا پڑتا ہے

مگر جمال کی ایک بات کیسے اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ کیا اس میں کچھ سچائی تھی؟

"دراصل تم نے آتم کی خوبصورتی سے بچنے کے لیے میری بدصورتی میں پناہ لی ہے۔" گل کا دل چاہتا تھا دُنیا کے سارے مردوں کا گلا گھونٹ کر خود کسی پہاڑ کی اُونچی سی چوٹی سے کود پڑے۔ آتم کے دوست کم تھے اور جو تھے وہ عجیب کینڈوں کے۔ معلوم ہوتا تھا وہ چن چن کے عجوبہ روزگار لوگوں کو دوست بناتا ہے۔ انھیں دوستوں میں ایک جمال تھا جو کسی مقامی اخبار کا ایڈیٹر تھا، کچھ لکھتا لکھاتا بھی تھا اور ریڈیو سے بھی کچھ اس کا تعلق تھا۔ وہ جب بھی آتا بڑی بے تکلفی سے سارے گھر میں دندناتا پھرتا ان دنوں وہ اپنی زندگی کو نئے ڈھرے پر ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی وہ آتم سے بہت زیادہ متاثر تھی اسی لیے اس نے جمال خان کو بھی بڑی فراخدلی سے انگیز کیا۔ اس کے چہرے مہرے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا بھاری جسم، سانولا رنگ، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، آنکھوں پر موٹی سی عینک۔ بھاری آواز۔ وہ گل کو اس قدر پُراسرار لگتا تھا کہ حد نہیں۔ اسے دیکھ کر گل کو معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مصر کے ابوالہول کو دیکھ رہی ہو سگریٹ اس کی شخصیت کا اتنا ہی بڑا اور ضروری جز تھا جتنی اس کی موٹی ناک پر دھری ہوئی موٹی عینک۔ جب وہ کمرے سے اُٹھتا تو کئی ڈبیاں خالی

اور کبھی راکھ دان بھرے ہوتے۔ وہ بات کو تول تول کر آہستہ آہستہ بول
ادا کرتا جیسے اسے بات کرنے سے سخت تکلیف ہوتی ہو جوں جوں جملہ
آگے بڑھتا جاتا پیچھے کا حصہ گل کے ذہن سے خارج ہوتا جاتا۔ درمیان
میں سگریٹ کے کش ایک علیحدہ مصیبت تھے۔ اس کا ایک جملہ منٹوں
نہیں گھنٹوں چلتا۔ کم از کم گل کو کبھی پتہ نہیں چلا کہ ایک جملہ کب ختم ہوا اور
دوسرا کب شروع ہوا۔ بعض دفعہ وہ کسی بات کا جواب صرف سگریٹ کے
کشوں سے دیتا یعنی سوال کے جواب میں اتنی دیر تک ٹھہر ٹھہر کر سگریٹ
پیئے جاتا کہ دوسرے کو یقین ہو جاتا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں
کہے گا۔ اور جب سننے والے کو یہ یقین ہو جاتا تو وہ اچانک
شروع کر دیتا۔ اس کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہنستا
بھی ہوگا۔ مگر وہ ہنستا تھا ....

....

کس بات پر یہ تو وہ جانے یا آتم۔ گل نے اکثر ایسی گڑگڑاہٹ سنی تھی
جو پہاڑ پر پتھروں کے جگہ پر سے اکھڑ جانے سے پیدا ہوتی ہو گی اور پھر
ایسی صدائیں جیسے پہاڑ پر پتھر دُور تک لڑھکتا چلا جا رہا ہو۔ گل کو تجسس
ان کی باتیں سننے پر اکساتا پھر وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوتی کہ الفاظ جانے پہچانے
ہوتے ہوئے بھی وہ ان کی بات نہیں سمجھتی۔ جانے وہ کون کون سے فلسفے

چھلانگتے رہتے . . . . جہاز کا پہیہ گل کی
سیٹ کے برابر میں تھا۔ جہاز رن وے پر چلا جس کے دونوں طرف
سُرخ بتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جوں ہی جہاز ایک بتی کے پاس سے
گزرتا اس میں سے نیلی شعاعیں پھوٹنے لگتیں۔ تھوڑی دُور جا کر جہاز
رک گیا، پھر اس نے تیزی سے انجن اسٹارٹ کیا، پھر بھاگا اور یک لخت
زمین سے اُٹھ گیا۔ جس وقت زمین سے اُٹھا تو گل کو یوں محسوس ہوا جیسے
اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ہو یا محاورۃً نہیں سچ مچ پیروں
تلے کی زمین نکل گئی ہو۔ ائرپورٹ کی بتیاں دُور ہونے لگیں اور پھر تو سارے
ڈھاکہ شہر کی بتیاں اکٹھی ہو کر ایسی خوبصورتی سے جگمگائیں کہ گل کے
دل میں دیے سے روشن ہو گئے۔ سڑک کے کناروں کی روشنیاں سنہری
مائل تھیں، زرد سبز اور نیلے رنگ روشنیوں میں دیوالی کا سا سماں تھا۔
پلک جھپکنے کو دل نہ چاہتا تھا اتنی دیر بھی نظر کو اس نظارے سے محروم
رکھنا بار گزر رہا تھا۔ جہاز چلتا رہا، اس کی بلندی بھی بڑھتی رہی اور ایک
وقت ایسا آیا جب یہی روشنیاں یوں معلوم ہونے لگیں جیسے زمین پر کسی نے
رنگ برنگی موم بتیاں جلا کر رکھ دی ہوں۔ آہستہ آہستہ روشنی کا جمگھٹا دُور
ہونے لگا جیسے پریوں کا خوبصورت شہر پیچھے ہٹتا جا رہا ہو۔ پھر وہ روشنیاں
یوں نظر آنے لگیں جیسے کسی نے جلتی لکڑی مار کر زمین پر سُرخ سُرخ چنگاریاں

بکھیر دی ہوں یا چولہے پر سے اُتارنے کے بعد کوئی بڑا سا توا ہنس رہا
ہو۔ شیشے سے ناک لگائے گل باہر دیکھتی رہی۔ دُنیا بھی کیا عجیب جگہ
ہے اور حضرت انسان نے کیا قیامت کی چیزیں ایجاد کی ہیں۔ آسمان پر
اُڑتے ہوئے زمین کے روزمرہ کے منظر کیسے بدل جاتے ہیں۔ چمک اور
تعداد میں کم ہوتی ہوئی روشنیوں کے جمگھٹے سے روشنی کی ایک الگ قطار
پھوٹی اور جا کر ایک اور تازے جمگھٹے سے مل گئی۔ یہ بھی کوئی شہر ہو گا۔
گل نے سوچا۔ اس کی روشنیاں ڈھاکے کے مقابلے میں کم اور دُور دُور
تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ روشنیاں بھی دُور ہو کر اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ اب
گھپ اندھیرا تھا۔ ایسا ڈراؤنا سیاہ اندھیرا کہ گل ڈر گئی۔ جب انسان
انتہائی پریشانی کے عالم میں ہوتا ہے تو اس کو اپنے چاروں طرف ایسے ہی
سخت اندھیرے کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ رحمان کی چوکھٹ پر
گر کر بے ہوش ہوئی تھی تو اس سے پہلے اسے بالکل ایسے ہی اندھیرے
کا احساس ہوا تھا۔ گھپ اندھیرا جس میں دُور دُور روشنی کی کوئی کرن
نہیں تھی۔ جیسے ہی گل کے ذہن میں یہ خیال آیا نیچے ایک روشنی یک لخت
ٹمٹمانے لگی صرف ایک ہلکی سی روشنی مگر جیسے اس دھیمی سی روشنی نے
اندھیرے کی دبیز چادر کو پھاڑ دیا ہو۔ جب انسان کی زندگی میں ہر طرف
اندھیرا چھا جاتا ہے تو یوں ہی یک لخت روشنی کی کوئی کرن پھوٹ

نکلتی ہے۔ اس کے لیے ثریا روشنی کی یہ کرن بن گئی تھی۔ ایسے ہی جب کسی ملک پر اندھیرے کے تاریک بادل منڈلاتے ہیں تو اس گھور اندھیارے میں کوئی مردِ میدان اُمید کی مشعل لے کر اُٹھتا ہے لوگ اسے ناکافی سمجھتے ہیں اور اسے شبے سے دیکھتے ہیں مگر نزدیک ہی کوئی اپنی اندھی مشعل اس سے روشن کر لیتا ہے۔ پھر دیے سے دیا جلتا چلا جاتا ہے اور یہ اکا دکا روشنیاں بڑھ کر کسی سڑک کی دو رویہ روشنیاں بن جاتی ہیں۔ یہ سب سوچنے کے بعد گل کو احساس ہوا کہ ان تین ہی دنوں میں اس کے سوچ کا انداز کچھ بدل گیا ہے۔ وہ آثم کی طرح ایک ذرا سی بات کو گہرائی میں لیے جا رہی ہے۔ وہ کیوں آثم سے اتنی متاثر ہو گئی ہے؟

چٹاگانگ کی روشنیاں بھی اسی انداز سے نظر آئیں مگر سڑک سے پہلے سمندر کنارے کی روشنیاں جھلملائیں جس میں سمندر کا نیلا پانی بڑا جھلا جھل کر رہا تھا۔ چٹاگانگ کا ائرپورٹ گل کو چھوٹا اور غیر اہم سا لگا۔

آخر کار منزل آ پہنچی۔ گل نے سوچا۔ ائرپورٹ سے گھر تک کا راستہ لمبا تھا۔ ایک طرف سڑک سے ملا دریائے کرنافلی بہہ رہا تھا جس پر بڑے بڑے جہاز کھڑے روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ اس دریا پر

گزر کر آنے والی ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ ٹیکسی ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی جو کبھی سُرخ ہو گی مگر اب کائی کی زیادتی سے سیاہ ہو چکی تھی۔

"ویلکم ہوم" شمسی صاحب نے خوشدلی سے کہا اور گل کا ہاتھ تھام کر اسے گھر کے اندر ایسے چاؤ سے لے گئے جیسے ابھی نئی نویلی کو بیاہ کے لائے ہوں۔ اور ڈرائینگ روم میں لے جا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ گل نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم بڑی نفاست اور خوبصورتی سے آراستہ تھا۔

"یہ سب آثم کا کیا دھرا ہے" انہوں نے گل کو اطلاع دی اور پھر آثم سے کہا "انہیں اپنی اور کارگزاریاں بھی دکھاؤ۔"

"آئیے صاحب" اس نے آثار قدیمہ کے گائیڈوں کی طرح اس کی رہنمائی کی۔ "یہ دیکھیے جناب یہ ساری صفائی میں نے اپنی نگرانی میں کروائی ہے، دیواریں تک جھڑوائیں ہیں —— اور صرف آپ کی خاطر گلدانوں میں پھول لگوائے ہیں جو اب ذرا مُرجھا گئے ہیں۔ یہ یہ لیجیئے یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔" وہ منی سی جگہ اس کے لیے چھوڑ کر دیو کی طرح اس کے سر پر کھڑا اسے اندر جانے کا اشارہ کر رہا تھا "آپ دونوں کے لیے فی الحال میں نے ایک ہی کمرہ ٹھیک کروایا ہے"

اگر آپ الگ کمرہ پسند کریں تو یہ انتظام بھی ہو سکتا ہے ــــــ یہ دونوں بیڈروم ملے ہوئے ہیں ؟

گل نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا "ابھی صرف ضروری چیزیں آپ کو نظر آئیں گی، باقی چیزیں آپ کی پسند کی خاطر چھوڑ دی گئی ہیں۔ آخر یہ کام تو آپ ہی کا ہے بلکہ میرا کمرہ بھی آپ کو ٹھیک کرنا ہوگا، پتہ نہیں کتنے سال کا سڑا قالین اور لیسے پردے لٹکے ہوئے ہیں ــــــ لیجئے جناب یہ کھانے کا کمرہ ہے، ادھر باورچی خانہ وغیرہ ہے، ادھر مہمان خانہ ہے۔ باغ کی زیارت صبح کیجئے گا۔ دُنیا کا پھل آپ کو اس باغ میں ملے گا۔ وہ ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی اُنگلیاں مار کر گنوانے لگا۔ ڈاب بمعنی ناریل، اور جناب کیلے، انناس، کیا نام کہ لیچی اور صاحب ــــــ گل کو اس قدر سفید ہاتھ دیکھ کے پھریری سی آئی اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تو یہ میرا اپنا گھر ہے۔ اس نے صحن کی بتی کے پیچھے ڈوبتی اتھاہ ہریالی کو دیکھ کر سوچا۔

صبح جب گل اور جمال تیار ہو کر باہر نکلے تو سارے آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ برف کی پہاڑیاں دُھندلی

چھپی ہوئی تھیں اور دوسرے پہاڑ گھٹاؤں کی یورشں سے کاسنی ہو رہے تھے۔

"سیف الملوک پر برف پڑ رہی ہے آج ادھر جانے کا دن نہیں ہے۔" گیسٹ ہاؤس کے منیجر نے اطلاع دی۔ ذرا دیر میں یہاں بھی چھم چھم بارش ہونے لگی۔ وہ دونوں جا کر لاونج میں بیٹھ گئے جہاں کھڑکی کے بڑے شیشوں میں سے بارش میں نہاتے ہوئے پہاڑوں، دریا میں گرتی لوندوں اور بڑے بڑے گول پتھروں کا نظارہ کرتے رہے۔ پھر کمرے میں آگ جلوا کر وہ لحافوں میں گھس گئے۔

"آثم اور جمال کن کن آدمیوں، کتابوں اور جگہوں کے کیا کیا غیر معقول نام لیتے۔ کبھی کبھی ان کی بحث اس قدر طویل اور خوف ناک ہو جاتی کہ لگتا دونوں اب چاقو لہرا کر ایک دوسرے کی انتڑیاں نکال دیں گے مگر یکایک پہاڑ پر پتھر لڑھکنے لگتے، آثم کے خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ کے پھول کھل اُٹھتے۔ وہ دونوں اُٹھ کر ہاتھ ملاتے اور گلے میں بانہیں ڈال کر باہر نکل جاتے۔ کیسی عجیب مخلوق ہیں یہ لوگ۔ گل سوچتی رہ جاتی۔

شمسی صاحب اپنی جائداد اور روپیہ کو صحیح جگہ لگانے اور آمدنی کو اچھے مصرف میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے

وہ محتاجوں کے لیے ایک ورک ہاؤس کھولنے کی فکر میں تھے۔ ان کا زیادہ وقت بینکوں اور منشیوں کے چکر میں گزرتا۔ گل جس نے ابھی کسی خاص کام میں دل نہیں لگایا تھا آثم اور جمال کی مصروفیتوں سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتی۔ ایک دن اس نے سُنا کہ ڈرائنگ روم میں سے کسی مولوی صاحب کے بہت لہک لہک کر وعظ دینے کی آواز آرہی ہے۔ یہی آواز ایک دن پہلے وہ نزدیکی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے بھی سُن چکی تھی۔ وہ گھبرا کر وہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ آثم اور جمال گالوں پر ہاتھ رکھے بڑے انہماک سے بیٹھے سُن رہے ہیں اور ٹیپ ریکارڈ پر وعظ ہو رہا ہے

تو مومنو! درِ فیض جب بند تھا نہ ہے اب کچھ، فقیروں کی جھولی میں پاؤ گے سب کچھ۔

ہے لیکن تمہیں مانگنے کا بھی ڈھب کچھ۔

خداوند کریم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تمہارے اپنے اعمال کام آئیں گے اور کوئی کام آنے والا نہیں۔

مگر ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمارے پیارے رسولؐ ہم مسلمان گنہگاروں کی سفارش فرمائیں گے، آپ شفاعت کریں گے اور بخشوائیں گے حالانکہ آپ نے بھی فرما دیا کہ میں تم ہی میں سے ہوں اور تمہیں جیسا

ہوں اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے نبی کہہ دو کہ میں تمہیں میں سے ہوں مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں جیسے محمود غزنوی رات کو چوروں کا بھیس بدل کر رعیت کا حال دیکھنے نکلا کرتا تھا اور جب وہ پوچھتے تھے کہ تم کون ہو تو کہتا تھا کہ میں تم ہی میں سے ہوں حالانکہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ یہ اس کی مصلحت تھی، اس کی حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ وہ کہے کہ میں تمہیں میں سے ہوں۔ اسی طرح رسول کریم نے مصلحت سے کہا تاکہ لوگ گناہ نہ کریں، برے کام نہ کریں کہ شفاعت کرنے والا شفاعت کرے گا، اسی لیے کہہ دیا کہ میں تو تمہارا ہی جیسا ہوں۔ دیکھ لو کہ ویسے ہی کپڑے ہیں اور ویسا ہی حلیہ ہے اور میں بھی تمہاری طرح چور ہوں اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے لو۔ انھوں نے کہا کہ تم میں ایسا کیا وصف ہے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے لیں کیونکہ ہم سب میں تو بڑے بڑے وصف ہیں۔ محمود نے پوچھا کہ آپ میں ایسے کیا وصف ہیں تو پہلے چور نے کہا کہ مجھ میں یہ خوبی ہے کہ دور سے روپے پیسے کی بو سونگھ لیتا ہوں اور خزانہ گڑا ہو تو بتا سکتا ہوں کہ یہاں اتنا سونا اور اتنی اشرفیاں گڑی ہوئی ہیں۔ محمود نے کہا واقعی یہ تو بڑا وصف ہے۔ دوسرے چور نے کہا مجھ میں یہ صفت ہے کہ جانوروں کی بولیاں سمجھتا ہوں۔ محمود نے کہا واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تیسرے نے کہا

میں اُونچے سے اُونچے مکان پر بغیر سیڑھی کی مدد کے چڑھ جاتا ہوں، کتنی ہی اُونچی دیوار ہو اسے پھلانگ جاتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمود نے کہا، واہ کمال ہے۔ چوتھے چور نے کہا کہ مجھ میں یہ گن ہے کہ جس شخص کو رات کو ایک دفعہ دیکھ لوں۔ سو سال بعد کہیں ملے تو فوراً پہچان لوں۔ محمود نے کہا واقعی یہ بھی بڑا کمال ہے۔ انہوں نے کہا اب تو بتا کہ تجھ میں کیا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے لو۔ محمود نے کہا بھائیو مجھ میں یہ خاصیت ہے کہ چور ہو، ڈکیت ہو، قاتل ہو، جب اسے سزا ہو جائے اور پھانسی چڑھ رہا ہو، میں اپنی داڑھی ہلا دوں تو وہ آدمی بری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات ہے تو یہ بڑے کام کا آدمی ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں سو چور کی تو ایک شاہ کی، کسی دن پکڑے گئے تو یہ کام آئے گا۔ بولے ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ چلو، اب محمود انہیں محل کی طرف لے چلا اور پہلے چور سے کہا پوچھو کتنا کتنا مال ہے۔ اس نے سب بتا دیا کہ کتنا سونا چاندی اور جواہرات ہیں۔ اس جگہ کتے بھونک رہے تھے۔ محمود نے دوسرے سے کہا۔ کیوں بھائی یہ کتے کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا کچھ عجیب سی بات کہہ رہے ہیں۔ ایک نے کہا کہ حرامخور ہو دیکھتے نہیں چور ہیں ان پر بھونکتے کیوں نہیں تو دوسرے نے کہا کہ حرامخور وہ ہوتے ہیں

جو اپنے مالک پر بھونکتے ہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ محمود نے
سوچا کہیں بات نہ کھل جائے۔ کہنے لگا، چلو یہ تو کتے ہیں بھونکنا ان کا
کام ہے تم اپنا کام کرو۔ اب تیسرا چور جو تھا وہ محل کی دیوار پر بغیر
کسی چیز کی مدد کے چڑھ گیا اور چوری کر لایا۔ وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے
حصّہ بانٹا اور کہا کہ فلاں فلاں جگہ فلاں فلاں وقت سب اکٹھے ہوں کہ
کوئی پروگرام بنائیں۔ محمود بھی اپنا حصّہ وصول کر کے محل میں آ گیا۔ اب
صبح محل میں شور مچ گیا کہ چوری ہو گئی۔ ہر جگہ چوروں کی تلاش شروع
ہو گئی۔ اب جب وقت آیا چوروں کے دوبارہ جمع ہونے کا کہ چوری
کا کوئی اور پروگرام بنائیں تو محمود نے کہا کہ فلاں فلاں جگہ جاؤ وہاں چور
ہوں گے انہیں پکڑ لاؤ۔ لوگ اس جگہ گئے اور انہیں پکڑ لائے۔ ان پر
مقدمہ چلا۔ قاضی نے کہا کہ یہ تو بڑے بھاری چور ہیں محل میں ڈاکہ ڈالتے
ہیں ان کو پھانسی سے کم کی سزا نہیں مل سکتی۔ اب جو پھانسی ملنے لگی
تو وہ چور جس نے کہا تھا کہ ایک دفعہ رات میں کسی کو دیکھوں تو سو سال
بعد بھی پہچان لوں پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتا ہے۔ دو قدم چلتا ہے اور پھر
پیچھے دیکھتا ہے۔ محمود نے کہا لگاڑ اس گستاخ کے درے، پیچھے مڑ مڑ
کے کیا دیکھتا ہے۔ اس کے درے لگے مگر جب چلا تو پھر پیچھے مڑ مڑ
کے دیکھنے لگا۔ آخر اس نے سوچا کہ درے بھی لگ گئے پھانسی بھی

پڑھ رہا ہوں تو کیوں نہ دل کی بات کہہ دوں تو اس نے پیچھے دیکھ کے کہا۔ ہلانا ہے تو اب ہلا داڑھی نہیں تو پھانسی چڑھ جائیں گے کیا جب ہلائے گا۔" محمود ہنس پڑا اس نے داڑھی ہلا دی اور انہیں انعام دیا اور انہیں اپنے پاس رکھ لیا کہ ان میں بڑے بڑے وصف تھے تو اسی طرح جب قیامت میں حضور داڑھی ہلائیں گے تو سارے گنہگار بخشیں جائیں گے۔ تو مومنو!

در فیض جیب بند تھا نہ ہے اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں پاؤ گے سب کچھ

جمال اور آثم نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

"یار یہ ہیں آج کل کے وعظ، چٹ پٹی حکایتوں کو کھینچ تان کر مذہب سے جوڑ دو۔"

"کیا پرفیکٹ ٹکنیک ہے اللہ قسم، تم نے غور فرمایا کہ اچھے ناول کی طرح ساری کمزوریوں کا عذر پہلے ہی تراشں لیا تھا اور چاروں چوروں میں وہی خوبیاں تھیں جو بعد میں کام آنے والی تھیں۔"

"یار اگر تم ایسے وعظ باقاعدگی سے ریکارڈ کر لیا کرو تو ایک یادگار چیز بن جائے، اور تم نے غور کیا ہو گا کہ پبلک اس وعظ سے بے حد متاثر ہوئی ہو گی۔

"کچھ نہ پوچھو، کلائمکس پر نعرہ تکبیر کی آوازیں تو ریکارڈ بھی ہو گئی ہیں۔"

"خدا ہمارے مُلاؤں کی روزی میں برکت دے۔" جمال نے بڑے خشوع و خضوع سے کہا۔

"مُلا بیچارے کیا کریں، وہ تو وہی سناتے ہیں جو لوگ سننا چاہتے ہیں" گل نے کہا۔

"جیسے فلم والے وہی پکچرز بناتے ہیں جو لوگ دیکھنا چاہتے ہیں" آثم نے کہا۔

"اور کیا، جب لوگ ہیجڑوں کے ناچ اور ہیروؤں کو دس پندرہ آدمیوں سے اکیلا بھڑتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں تو وہ ایسے سین کیوں نہ دکھائیں؟" گل بولی۔

جمال نے آثم کی طرف اور آثم نے جمال کی طرف دیکھا۔

"یار گنجائش ہے۔" جمال نے کہا۔

"ہاں، میں کیا کہہ رہا تھا، گنجائش ہے۔"

یہ ٹکڑا گل کی سمجھ سے باہر رہا۔ قبل اس کے کہ وہ پوچھے آثم نے پھر بات شروع کی۔ "ایک دن میں نے سنا ایک مولوی صاحب اپنے پیر کا قصہ سُنا رہے تھے جو حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ جو ان کی

سخاوت کے چرچے تھے اور قدم قدم پر انہیں ایسے آدمی ملتے تھے جنہیں بشارت ہوئی تھی کہ تمہارے دکھ درد کا مداوا کرنے والا آن پہنچا۔ بڑے مزے کی چیز تھی، چاہو تو اسے بھی ریکارڈ کر لو۔" آثم نے بالکل انہیں کے انداز میں گا کر سنانا شروع کیا "ہمارے پیر صاحب حضور مسجد اقصیٰ میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک انگریز اندر داخل ہوا۔ جوں ہی پیر صاحب کی نظر اس پر پڑی وہ ٹھٹکا اور پھر ان کے قدموں میں گر کر زار و قطار رونے لگا۔ لوگ حیران تھے کہ ایک انگریز، کوٹ پتلون پہننے والے کافر کا یہاں کیا کام، پیر صاحب نے سر اٹھایا اور پوچھا اے شخص تو کون ہے۔ اس نے کہا کہ بس اب مجھے میرا مدعا ملا کہ خواب میں میں نے یہی شکل دیکھی۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ اے شخص تو کون ہے کچھ ہمیں بھی بتلا۔ وہ شخص زار و زار رویا اور بولا کہ میں لبنان کا رہنے والا ہوں۔"

"دیکھا تم نے وہ انگریز شخص تھا لبنان کا رہنے والا۔" دونوں نے پھر بے تحاشہ قہقہے لگائے۔

"اور پھر" وہ پھر اسی انداز میں گنگنانے لگا "ہمارے پیر صاحب قبلہ دونوں وقت گھی میں تر تراتے پراٹھے پکواتے اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرتے۔ جب کوئی کتا نظر آتا تو اس کے سامنے ادب سے

دوزانو بیٹھتے اور دونوں ہاتھوں میں پراٹھا لے کر اسے پیش کرتے ۔ کسی شخص نے پوچھا کہ اے بزرگ کتا تو نجس جانور ہے آپ اس کے سامنے اس قدر ادب سے پراٹھے کیوں پیش کرتے ہیں تو پیر صاحب نے رو کر فرمایا کہ اے شخص اس گلی کے کتے بھی ہم انسانوں سے ہزار درجے بہتر ہیں ۔ اللہ اللہ کیا بات ہے ہمارے پیر صاحب کرامات کی ۔ یہاں سے جاتے ہوئے مکہ شریف تک اور وہاں سے واپسی پر اشرفیوں سے بھری ہوئی بوریاں ساتھ تھیں ۔ دونوں ہاتھوں سے خود بھی لٹاتے تھے اور جو ساتھ تھے ——"

"بس بس خدا کے لیے، تم تو یار کمال کرتے ہو، قطعی وہی لہجہ ۔ ایک ذرا داڑھی بڑھا کر وعظ دینے لگو تو کما کھاؤ ۔"

"واقعی یار، اچھی خاصی آمدنی ہے ان لوگوں کی ۔ کراچی میں مَیں نے دیکھا کہ روز نئے مکان جو بن رہے ہیں ان میں قرآن خوانی اور ختم ہو رہے ہیں ۔ ایک مولوی کئی کئی گھروں میں جاتا ہے حلوے پراٹھے کھاتا ہے الگ، گانٹھڑیں باندھ کے لاتا ہے جدا ۔"

"مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں عزتِ نفس نہیں ہے، سیلف ریسپیکٹ جسے کہتے ہیں ۔ ان کو کسی نہ کسی بہانے مانگتے رہنے سے عار نہیں ۔"

"ارے میاں عزتِ نفس کہاں سے ہو گی، تنخواہ کم، کنبہ زیادہ، ضروریات اہم۔ سوسائٹی نے انہیں مقام ہی کیا دیا ہے خود جاہل ہیں جاہلوں کو خوش کر لیتے ہیں۔"

"واقعی یار بعض تو کمال ہی کرتے ہیں ایک روز میں نے ایک وعظ سنا جس میں مُلاّ جی نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب حضور خداوند تعالٰی سے گلے ملنے لگیں گے تو پیٹھ کے پیچھے سے اُمّت کو اشارہ فرمائیں گے اور ساری اُمّت اللہ میاں کی آنکھ بچا کر جنت میں داخل ہو جائے گی۔ اس بات پہ لوگوں نے خوش ہو کر نعرے لگائے۔ دیکھا آپ نے یہ ہے ہماری ذہنیت۔ دھوکا دہی سے اب ہم بڑی سے بڑی ہستی کو مبرّا نہیں سمجھتے۔"

"اور اس سے ہمارے ہاں کے عوام کی مذہبی سوجھ بوجھ کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی مسلمان ہونے کا مطلب ہے جا و بے جا طریقے سے جنت کا حصول۔"

"جنت پہ ہی موقوف نہیں ہر چیز کے حصول کے لیے جا و بے جا کی تخصیص ختم ہو گئی ہے۔ اور ملک کے ہر طبقے میں۔ چاہے ہر شخص رشوت نہ لیتا ہو یا غبن نہ کرتا ہو مگر کسی کے ذریعہ ترقی کروانا، غیر ممالک میں جانے کی کوشش کرنا۔ عزیزوں دوستوں کے

کام نکلوانا۔ دفتری اوقات میں دوسرے کام اور دفتری عملے کو ذاتی کاموں میں اُلجھائے رکھنا سب چلتا ہے اور یہ سب جائز سمجھا جانے لگا ہے۔ اعتراض صرف ان باتوں پر کیا جاتا ہے جنہیں بعض کر سکتے ہوں جن باتوں کی توفیق سب کو ہے اب وہ جائز ہو چکی ہیں۔"

"یاد آیا، یار تمہاری نوکری کا کیا ہوا؟" جمال نے پوچھا۔

"نوکری کیا کریں۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے ملک میں سرکاری نوکری ہو تو کم از کم سکریٹری، فوج میں ہو تو بریگیڈیر اور ملازمت میں نہ ہو تو آدمی کو بڑا انڈسٹریلسٹ ہونا چاہیئے ورنہ کوئی نہیں پوچھتا کئی دنوں سے دفتروں کی خاک چھان رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے یہاں کسی کا کوئی فرض نہیں ہے۔ ڈیوٹی کے اوقات لوگ بڑے آدمیوں سے لیس سر کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈیوٹی کے اوقات بڑے لوگوں کے گھر جا کر ان مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ جن کو دیکھنے کے وہ مجاز نہیں ہیں اور اس دوران میں دُور دُور سے معمولی حیثیت کے لوگ بہزار دقت وہاں پہنچ کر اپنا وقت اور روپیہ برباد کر کے ان سے ملے بغیر لوٹ جاتے ہیں اور پھر کبھی آنے کا خیال تک نہیں لاتے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ سرکاری نوکریوں کے پاپڑ ہم بیل چکے ہیں، تنگ آکر نوکری کو کیا سلام اور جوتیاں چٹخانے لگے۔"

"نوکری کرو یا نہ کرو جو لعنتیں ہیں سو تو ہیں۔ جس آدمی کا کوئی بڑا رشتے دار اپنے محکمے میں موجود ہے اس کے لیے راوی عیش لکھتا ہے ترقی ہے تو اس کی، باہر جانے کا چانس ہے تو اس کا، ملک میں ہے تو اپنے گھر کے آس پاس منڈلا رہا ہے اور جن کے سر پر آسمان کے سوا کوئی سہارا نہیں انہیں ایسی جگہ مارا جاتا ہے جہاں پانی نہ ملے۔"

"ہاں، سُنا ہے اسکول میں بچہ داخل کروانا ہو تو پہلے ملک کے صدر کے پاس جائیے وہ سفارش کر دے تو داخلہ مل جائے گا۔ ورنہ مہینے کے تیس دن جوتے کے تلے گھسیے کلاس میں انچ بھر جگہ نہیں ہے۔ بچّے پر بچّہ بیٹھا ہوا ہے اور ہر کلاس میں کچھ جگہ پہلے ہی اس خیال سے رکھ لی جاتی ہے کہ جانے کب کس کی سفارش پہنچ جائے۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں جا و بے جا کی تمیز اُٹھ گئی ہے۔ ان لوگوں کو جانے دیجیے جو اسمگلر ہیں، نفع کوش ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں رشوت لیتے ہیں یا غبن کرتے ہیں یا ڈاکو اور قاتل ہیں۔ ان سے تو پولیس اور جیل نمٹ لیں گے مگر ایسے غلط کار لوگوں کا کیا ہوگا۔ جو یہ کام صحیح اور جائز سمجھ کر کرتے ہیں۔ حق حق داروں سے چھین کر دوسروں کو دے دیتے ہیں اور ضمیر کے کچوکے تو رہے الگ

ایک چٹکی تک محسوس نہیں کرتے۔ آج روپے کا لالچ اور اقتدار کی ہوس اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ صرف یہی دو چیزیں قاضی الحاجات ہیں۔ آج لمبی سی کار میں جھنڈا لہرانے جائیے تو شاید جنت کا پھاٹک بھی کھل جائے ورنہ ——"

"یار بڑی ڈپریسنگ باتیں کر رہے ہو، میں تو کہتا ہوں شاید یہ باتیں ہر زمانے میں تھیں یاد کرو شیخ سعدی کا اپنے کپڑوں پر شوربہ انڈیلنے کا واقعہ۔ میں تو بعض اوقات سوچتا ہوں کہ شاید اس کے اوس میں بھی کوئی اچھا پہلو ہو۔ اسی طرح لوگوں کا معیار زندگی تو بڑھ رہا ہے لوگ خوشحال تو ہو رہے ہیں ہو سکتا ہے خوشحال ہونے پر دوسری اخلاقی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں۔"

"تمہاری شخصیت کا یہ پہلو بڑا پیارا ہے، ایک وقت آتا ہے کہ درد کو ہی دوا سمجھنے لگتے ہو۔"

جمال ہنسا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "ہاں —— واقعی، میں نے تو یوں بھی سوچا ہے کہ اگر ۱۹۴۷ء میں فسادات نہ ہوئے ہوتے، یوں قتل و غارت سے تنگ آ کر خود بخود آبادی کا تبادلہ نہ ہوتا تو آج پاکستان میں یہ سارے کارخانے، یہ کاروبار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے کیسے آتا اور پھر شاید

ہم اتنی جلدی اس مقام پر بھی نہیں پہنچ سکتے جہاں پہنچ گئے ہیں۔"
"اسے کہتے ہیں سوچ کا منفی انداز!" آثم نے گھمبیرتا سے کہا۔
"یہ بہت بڑا تاریخی موڑ تھا اور اسے بہت بڑے تاریخی پس منظر میں ہی جانچا جا سکتا ہے۔ ایسی سطحی اور یک طرفہ باتیں سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یاد رکھو تاریخی حادثوں کا اثر بہت دور تک اور بہت دیر تک ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا المیہ نہ بھولو اور یہ بھی نہ بھولو کہ ہم بحیثیت قوم بھی بڑی سی دنیا میں ایک ننھی سی اکائی ہیں۔"
"اور یہ بھی تو کہو" جمال نے تازہ سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
"اور ہماری بے چاری دنیا بے شمار دنیاؤں کے سمندر میں ایک حقیر قطرے سے بھی گئی گزری ہے۔" سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ برٹرنڈ رسل نے کیا خوب کہا ہے۔

IN THE VISIBLE WORLD THE MILKYWAY IS A TINY FRAGMENT WITHIN THIS FRAGMENT THE SOLAR SYSTEM IS AN INFINITESIMAL SPECK AND OF THIS SPECK OUR PLANET IS A MICROSCOPIC DOT-

"مگر یار ہمارے پروفیسر بیچارے کو رسل سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس ایک جملے میں انہوں نے رسل کی بے شمار لفظی اور معنوی غلطیاں نکالیں۔ فرمایا کرتے تھے رسل چاہتے ہیں کہ دنیا میں سب لوگ ان کی طرح عقل پرست ہو جائیں مگر میں کہتا ہوں۔

ONE BURTRAND RUSSELL IS PLENTY

" ہاں بھئی، اپنے آپ کو یوں حقیر سمجھنے میں انا کو زبردست ٹھیس پہنچتی ہے، خودی کے پرزے پرزے ہوتے نظر آتے ہیں، کہاں خدا کے نائب کی حیثیت اور کہاں یہ کم مائگی۔ ندیم نے برٹرنڈ رسل کے اس خیال کو یوں نظم کیا ہے۔

سنا ہے ایک ایک ذرے کے گرد
ایسا ایسا نظام گردش رواں دواں ہے
کہ ذہن اس کے رموز پر غور کرتے کرتے
خود ایک گردش میں مبتلا ہے

یہ عصر حاضر کی دانش بے پناہ ہے
جس نے میری دنیا کو
ایک کرے سے ایک ذرہ بنا دیا ہے

ایک کرے سے ایک ذرہ! ایک بڑا سا کرہ، جس کی تخلیق اس

لیے ہوئی کہ انسان اس میں رہ سکے اور ساری کائنات کی تخلیق اس لیے ہوئی کہ وہ انسان کے کام آسکے اور کمالِ دانش نے اسے کیا بتایا کہ وہ تو کائنات کی وسعتوں میں ایک حقیر کیڑا ہے اور اس کا کرہ تو محض ایک ذرہ ہے، یہیں سے فرسٹریشن شروع ہوئی۔"

بات ندیم سے کرشن، کرشن سے عصمت پر جانکلی اور گھنٹوں ادب کے موضوع پر بہتی رہی۔ گل یہ سب باتیں سنتی رہی جو اس کی سمجھ میں نہ آئیں مگر اسے بہت اچھی لگیں جیسے سمجھ میں نہ آنے والی پر اسرار، خوفناک اور خوبصورت فضائیں پہلے پہل انسان کو اچھی لگتی تھیں اور وہ انہیں خدا بنا کر پوجنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

دوسرے دن مطلع قدرے صاف تھا مگر جھیل سیف الملوک کی طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ مقامی لوگوں کی ہدایت پر سارے سیاحوں نے جھیل پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر جمال کے پاس یہ آخری دن تھا اور جھیل کی دید سے محروم رہنا اسے گوارا نہ تھا۔ اصل میں اسے ان مشکلات کا اندازہ نہیں تھا جو ایسے سفر میں ناکافی کپڑوں کے ساتھ پیش آسکتی تھیں اس لیے اس نے اور گل نے کمر ہمت کس لی۔ تھوڑے بہت جو گرم کپڑے لائے تھے پہنے، گل کے واکنگ شو جو اس نے مری میں ایک مرتبہ لیے تھے چپاتی ہو رہے تھے۔ نائلون کے موزوں پر

جوتے پہن کر تھرماس اور کھانے کا چھوٹا سا بنڈل لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے ان کی ہمت کی داد دی۔ مینیجر نے ان سے برساتی لے لینے کو کہا۔ چونکہ وہ برساتیاں لے کر نہیں آئے تھے اس لیے اس نے انہیں اپنا کالا چھاتہ عنایت کر دیا اور گل کو ایک عدد لکڑی رکھنے کی ہدایت کی کہ اس کے بغیر اس متواتر چڑھائی پر چڑھنا ذرا مشکل کام ہے۔ آج بھی بازار میں سیلن اور غلاظت کا وہی عالم تھا۔ لکڑی کا سہارا لیتے، چکنی مٹی پر پھسلنے سے بچتے وہ لکڑی کے پل تک آئے اور پھر جدھر سے نالہ بہتا ہوا آ رہا تھا اس طرف مڑ کر پگڈنڈی نما سڑک پر چلنے لگے۔ چڑھائی اب ہلکی مگر متواتر تھی۔ ان چند میلوں میں انہیں تین ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر چڑھنا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ گل باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اور جمال کو معلوم تھا کہ چڑھائی پر باتیں کرنا ذرا دیر میں خود کو تھکا دینے کے مترادف ہے، یوں بھی وہ لوگوں کو کسی بات پر مجبور کرنے یا مجبور ہونے کا قائل نہیں تھا۔ سڑک پتھریلی تھی، شفاف نالا ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ دائیں طرف کھیت تھے۔ کہیں کہیں چیڑ کے درخت تلے پڑے ہوئے پتھر انہیں آرام کر لینے کی دعوت دے رہے تھے مگر صبح کے سہانے وقت اور اپنی تازگی سے فائدہ اُٹھا کر وہ زیادہ سے زیادہ چل لینا چاہتے

تھے۔ سردی کے باوجود گل کو ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگا۔ اس نے اپنا سوئیٹر
اتار کر آستینوں کا ہار بنا کر گلے میں لٹکا لیا اور چاروں طرف دیکھتی
ہوئی چلتی رہی۔ کتنا فرق ہوتا ہے مختلف جگہوں میں ایک دن وہ سب
وجدار ہٹ گئے تھے۔ یہاں عام سمندر کے کناروں کے برخلاف
بالو کم اور مٹی زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہاں سے وہاں تک کیچڑ
ہی کیچڑ ہے اور سمندر کے بالکل نزدیک جانا ممکن نہیں۔ جگہ جگہ کیڑوں
کی بنائی ہوئی گندی ڈھیریاں اور پاس کی مچھیروں کی بستی کے بچوں
کی مچائی ہوئی غلاظت سونے پر سہاگا تھی۔ رکشاؤں کا جمگھٹ تھا
چھوٹی چھوٹی دوکانیں بھی تھیں اور سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے
بچے چینا بادام یعنی مونگ پھلی بیچ رہے تھے۔ گل کو یہ مونگ پھلیاں
قد میں بے حد چھوٹی لگیں۔ اکثر خالی یا ضرورت سے زیادہ بھنی ہوئی
نظر آئیں۔ وہ سب مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے اس فکر میں بہت
دور نکل گئے کہ کسی جگہ کیچڑ سے نجات ملے اور وہ پانی کے نزدیک
پہنچ سکیں۔ جب ایسی جگہ نہ مل سکی تو وہ مچھیروں کی بستی دیکھنے چلے گئے
بڑے بڑے سیاہ جال لکڑی کے اوپر پھیلے ہوئے تھے، ململ کی گیری
ساڑھی میں ایک سیاہ فام لڑکی اور ادھ ننگے بچے ان کے چاروں طرف
کھڑے ہو گئے۔ جمال فوراً اپنے اخبار کے لیے ایک فیچر کا مواد اکٹھا

کرنے لگا اور آتم کو حکم دیا کہ وہ لبا جھپ چند نہایت آرٹسٹک فوٹو لے ڈالے۔ سوکھی ہوئی مچھلی کی بو سے گل کا دماغ چٹخا جا رہا تھا۔ آتم ان کی باشاؤں اور کالے جال کی بیک گراؤنڈ میں بچوں کی ادھ جلے والوں کی فوٹو پر فوٹو لے رہا تھا۔ جمال ایک بڈھے سے جانے کون سی زبان میں سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔ ننگے لونڈے پس منظر میں الٹ [illegible] کھیلے جا رہے تھے۔ گل بور ہو رہی تھی مگر ممی [illegible] بڑی طمانیت سے لونڈوں کی یہ حرکت دیکھ رہے تھے۔ جمال آتم [illegible] تم دیکھنے [illegible] تھیں۔ زمین لپی پتی۔ سینتل پاٹیاں لپٹی ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔ مٹی اور المونیم کے چند برتن تھے اور بس۔

"انسان اپنی ضروریات کو کس حد تک محدود کر سکتا ہے۔ اس بات پر غور فرمایا آپ نے۔" جمال کہہ رہا تھا "اور ہم ہیں کہ خواہ مخواہ انہیں بڑھانے پر تلے رہتے ہیں، یہ بھی ہونا چاہیے اور وہ بھی ضروری ہے ویسے دیکھا جائے تو ضروری کوئی چیز بھی نہیں ہے، بس ایک باندا، ایک سینتل پاٹی اور دو چار برتن۔"

گل کو لگا جیسے وہ اس پر چوٹ کر رہا ہے۔ ابھی کل وہ اس کے سامنے ہی تو گھر کے لیے نئے پردوں، باغ کے لیے گملوں اور جانے کس الا بلا کا ذکر کر رہی تھی جو اس کے خیال میں بہت ضروری

چیزیں تھیں ایک مکان کی شرافت برقرار رکھنے کے لیے۔

"ان چیزوں کی بھی کیا ضرورت ہے، انسان چاہے تو ان کے بغیر بھی گزارہ کر سکتا ہے" وہ چڑ کر بولی "آخر پہلے درختوں اور غاروں میں لوگ رہتے ہی تھے اور بغیر برتنوں کے کچّا گوشت کھا لیتے تھے"۔

جمال نے آثم کی طرف اور آثم نے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال نے کہا" میرا مطلب ہے انسان کو اپنی ضروریات پر کنٹرول رکھنا چاہیئے اور خرچ ان ضروریات کے مطابق۔ سچّا راستہ میانہ روی ہے"۔

"آمدنی کے مطابق ضروریات کی فہرستیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ایک خاص آمدنی کے بعد کار، قالین اور پردے ضروریات بن جاتے ہیں"۔ گل نے کہا۔

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہتی ہوں مگر میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ کل رات ایک پارٹی میں ایک صاحبہ کراچی میں اپنی کسی عزیزہ کا ذکر کر رہی تھیں جن کے کل دو بچّے ہیں اور نوکروں کی تعداد تین کاروں پر دو ڈرائیور، ایک خانساماں، ایک بیرا، دو آیائیں، ایک لے پالک لڑکی جو ان کے گھر میں "ہاؤس کیپر" کے فرائض انجام دیتی ہے بتائیے اتنے نوکر اور وہ سب بکھیڑا جو یہ پھیلاتے ہوں گے اور سمیٹتے ہوں گے ضروریات زندگی ہیں؟"

"ارے بھئی چلو یا لڑتے لڑتے سویرا کر دو گے۔" آثم نے کہا۔

"ہاں یار چلو، ایک خوبصورت تصویر غروبِ آفتاب کی بھی لینی ہے۔"

بستی کے لوگ اپنا کام چھوڑ کر انہیں حیرت سے دیکھنے میں مصروف تھے۔ گل نے دیکھا کہ ان کی لڑکیاں بدن پر صرف ایک ساری لپیٹے ہوئے ہیں مگر عورتیں بلاؤز بھی پہنے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ سوکھے بھوسے کی نامعلوم سی ڈھیری پر گل نے پاؤں رکھا تو آثم چلّایا۔ "ارے — ارے، ذرا بچ کے۔"

"کیا ہوا؟" گل ڈر گئی۔

"کچھ نہیں، آپ بیچاروں کی روزی پر لات مار رہی تھیں، یہ سوکھی مچھلی ہے جو یہ بے چارے پکا کر کھائیں گے۔"

"اُف، ارے — یہ یہ مچھلی ہے۔ میں تو سمجھی جانے کیا بھوسہ سا پڑا ہے۔"

"جی، یہ ان کا کھانا ہے اور یہ زمین ان کا نعمت خانہ ہے یا اسٹور روم یا جو کچھ بھی آپ سمجھ لیں۔"

"اور یہی زمین ان کا باتھ روم ہے" آثم نے ایک جگہ غلاظت سے پاؤں بچاتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی سنو شعر ہوا ہے — یہی

زمین ہے کہ رشکِ افلاک، رشکِ امبر بنی ہوئی ہے یہی زمین ہے کہ

"زمین نہیں، دھرتی کہو، آجکل لفظ "دھرتی" ووگ میں ہے۔ میں ایک نظم بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، "دھرتی کے دکھ۔"

"ضرور بناؤ،" گل نے مجھ سے اکھڑا لینا، آجکل آ رہا ہے۔"

اب وہ اپنے اصلی رنگ میں لوٹ چکے تھے، اور دھرتی کے دکھوں کی باتیں کر رہے تھے جو گل کے ذہن پر سے یوں تیرتی ہوئی گزر رہی تھیں جیسے دور سمندر پہ بادبانی کشتیاں اوپر ہی اوپر سے اوجھل تھیں۔

سورج سرخ پڑ گیا تھا۔ غروبِ آفتاب کی تصویر اتارنے کے انتظار میں وہ سب ساحل پہ یوں بیٹھ گئے جیسے سورج کے تماشائی ہوں۔ پہلے سورج نارنجی رنگ کا طباق بنا، پھر سرخ ہونا شروع ہوا اور ایسا رنگ دھار لیا جیسے تپا ہوا تانبا۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے جا رہا تھا۔ آس پاس کے بادل نارنجی اور سرمئی ہو رہے تھے در سورج کی سرخی میں بھی سرمئی رنگ گھلتا جا رہا تھا۔ گل دونوں ٹانگیں لمبی کیے اور ہاتھ پیچھے ٹکائے بے فکری سے بیٹھی تھی۔ سرمئی اجالے میں اس کا سراپا بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ جمال کیمرے کی آنکھ میں جھانک رہا تھا۔ آثم نے اٹھ کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ پھر

شمسی صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کے بعد آ کر اطمینان سے
گل کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ گل نے بھڑک کر اس
کا سر جھٹکا اور وہ ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھینک یو"۔ جمال نے کیمرہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟" گل نے آثم کو سچ مچ ڈانٹا۔

"کیسی شاندار تصویر آئے گی، دیکھئے گا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
شمسی صاحب خوشدلی سے ہنستے رہے۔ گل ہاتھ مار مار کر اپنی شلوار
درست کر رہی تھی مگر دراصل وہ آثم کے وجود کو جھٹک رہی تھی۔
کتنا بے وقوف ہے یہ لڑکا یا جان بوجھ کر بنتا ہے کوئی بچہ تو نہیں ہے
جو ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ کیا میرے اتنا قریب لیٹنے سے، میری کمر میں ہاتھ
ڈال دینے اور میری گود میں آ لیٹنے سے اس کمبخت کو کچھ محسوس نہیں
ہوتا۔؟ ڈھٹو کا ڈھٹو، سعید دلیپ! یہ لمحہ دوسرے ہی دن ابھر کر
سامنے آ گیا۔ پانی کے سرمئی اجالے میں نارنجی رنگ کا سورج اور
تاریک پس منظر میں ایک لڑکی کا خوبصورت نقش جس کی گود میں سر
رکھے کوئی شخص دراز ہے۔ تصویر واقعی اتنی خوبصورت آئی تھی
کہ حد نہیں۔ آثم نے اسے فریم کروا کے اپنے کمرے میں رکھ دیا۔
اور جمال نے اسے ایک انگریزی رسالے کے پورے صفحے پر چھپوا

دیا۔ ایک کاپی گل کی نذر کی گئی جو اس نے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری
میں ڈال دی۔

متواتر چڑھائی نے گل کو تھکا دیا تو وہ صنوبر کے چھوٹے سے درخت کے سائے تلے بیٹھ گئی۔ جمال جو اس سے چند قدم آگے چل رہا تھا لوٹ آیا۔

"پانی پیو گی؟"

"ہاں۔"

"ابھی تو منزل بہت دُور ہے۔"

"اسی لیے تو دم لینا ضروری ہے۔"

"بس سوچ رہا ہوں، آ تم ساتھ ہوتا تو مزا رہتا۔"

"ہونہہ۔"

"تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"بہت کچھ۔ میں مشرقی پاکستان کے بارے میں سوچ رہی تھی اور یہ کہ دنیا میں کتنی مختلف جگہیں ہیں اور انسان ایک وقت میں کیا ہوتا ہے اور دوسرے وقت کیا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ برسوں بعد بھی جیسے تھے ویسے ہی ہیں ان کے خیالات میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوئی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بدل جانا اچھا ہے یا نہ بدلنا۔"

جمال نے ایک پتھر پر پاؤں اٹکا کر ماچس سے سگریٹ جلائی، گل کو غور سے دیکھا اور کہا "ایسے موسم میں یہ سوچ کوئی اچھی نشانی نہیں، جمال میرے خیال میں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو باطنی طور پر بالکل نہ بدلیں۔ عمر، ماحول، حالات، تعلیم اور ذہنی پختگی انسان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ افکار کے ساتھ انسان ضرور بدلتا ہے اگر نہ بدلے تو اس میں اور اس پتھر میں کوئی فرق نہیں۔" اس نے پاؤں سے پتھر کو ٹھوکر لگائی اور تھرماس کا کپ لے کر چشمے سے پانی لینے چلا گیا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ گل نے گھونٹ گھونٹ پی کر کپ جمال کو تھماتے ہوئے کہا "ضروری تو نہیں کہ ہر تبدیلی ترقی ہی کی جانب ہو۔"

"انسان کو اپنے فکر کے رستے پر وفادار رہنا چاہیئے، جب اس کی فکر میں تبدیلی آئے تو اس کو بدل جانا چاہیئے دوسروں کے نزدیک یہ برا ہے

ترقی ہو یا تنزل"

وہ پھر چل دیے۔ سڑک بہت ہموار تھی اور گھوم پھر کر اسی جگہ چلی آتی تھی اس لیے انہوں نے سڑک چھوڑ کر کچا راستہ پکڑا۔ گول گول پتھروں پر قدم دھرتے کبھی ان سے بچتے وہ چلتے رہے۔ وادی چوڑی ہوتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑوں کے سلسلے تھے جن کی اونچی چوٹیوں پہ برف پڑی ہوئی تھی۔ موسم ابر آلود اور سرد تھا مگر مسلسل چلنے کی وجہ سے ان دونوں کو گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک جگہ ایک قافلے نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ ایک ادھیڑ عورت بوری میں سے مکھن نکال کر مکئی کی روٹیوں پہ رکھ رکھ کر سب کو دیتی جا رہی تھی۔ اس کے بالوں کی گندھی ہوئی باریک باریک مینڈھیاں کندھوں تک لٹک رہی تھیں۔ چھپی ہوئی چادر کا پلو پیچھے پڑا تھا اور سامنے گریبان پہ ٹکی ہوئی کوڑیاں، موتی اور پانچ پیسے کے سکے توجہ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ عورت کے نقش تیکھے تھے مگر رنگت میں آ کر عمر کی سختیاں سنولاہٹ بن کر گھل گئی تھیں۔ مردوں کے رنگ بھی تیکھے دیئے تھے مگر چھوٹے لڑکے لڑکیوں کی رنگتیں ایسی تھیں کہ کابلی سیبوں کو شرمائیں۔ ہونٹوں کی رنگت اتنی خوبصورت گلابی تھی کہ دنیا کی کوئی لپ اسٹک اتنا پیارا رنگ پیدا نہیں کر سکتی۔ گل ان سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی اور وہ سب اس کو۔

جب وہ نزدیک آئے تو اس عورت نے گل سے پوچھا۔

"کدھر جا رہی ہے، جمیل؟"

گل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ادھر برف ہے برف ـــــ مت جا، مر جائے گی۔" عورت نے کہا اور یکایک سب بچے، بڑے، عورتیں، مرد ایک ساتھ چلانے لگے۔ "برف ہے برف، مر جائے گی ــــ"

"تم لوگ ادھر ہی سے آ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"پھر تم نہیں مرے تو میں کیوں مر جاؤں گی۔" گل نے غصّے سے کہا۔ ان کے ایک ساتھ چلانے سے گل سمجھی کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

"تو مر جائے گی۔" اسی عورت نے ہنستے ہوئے کہا اور گل جھنجلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عورتیں اسے اپنے سوجے ہوئے پاؤں دکھاتی رہ گئیں۔ "کمبختیں ننگے پاؤں برفوں پر چلتی ہیں اور مجھ سے کہتی ہیں کہ تو مر جائے گی"

جوں جوں وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے راستہ کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ اب اکا دکا بوندیں بھی پڑنے لگیں تھیں۔ جمال نے چھتری کھولی

اور وہ دونوں اس کے تلے سمٹ کر دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے رہے
اسی طرح ایک ہی چھتری میں ایک دن وہ آثم کے ساتھ چٹا گانگ کا
بدھ مندر دیکھنے گئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس پر بقول آثم
مذہبیت کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ سفید دوپٹے سے سر ڈھانکے جانماز
پر کھڑی بڑے خشوع و خضوع سے نیت باندھنے میں مصروف تھی کہ
اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اس کے پاس کھڑا ہے۔
نیت میں ابھی وہ بھٹک ہی رہی تھی کہ آواز آئی "یہ ڈھونگ" غالباً
آثم نے اسے پہلی دفعہ نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ مسکراہٹ بہت روکنے کے
باوجود گل کے ہونٹوں پر تیر گئی۔ ذہن بھٹک گیا۔ نیت کرتی ہوں چار
رکعت نماز فرض نہیں سنت ——نہیں ——" آخر اس نے نیت
توڑ دی " ہٹو یہاں سے، کیوں آئے تم لے کے مجھے ہنسا دیا۔"
"آپ ہنسیں کیوں، میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں کہا تھا؟" آثم اترایا۔
"مگر بولنے کی کیا ضرورت تھی آخر؟"
"میرے ایک لفظ کہنے سے آپ پر اتنا اثر ہوا کہ خدا کے حضور
سے چلی آئیں، کمال ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا ہے کہ انسان کوئی
کتاب پڑھ رہا ہو یا اپنے خیالات میں گم ہو تو آپ کچھ بھی کہتے رہیے
اس پر اثر نہیں ہوگا مگر نماز پڑھنے والے کے سامنے ایک لفظ منہ سے

نکالیے تو اسے نماز پڑھنی دو بھر ہو جائے گی، ہنسی کے مارے بُرا حال ہو جائے گا، میں کئی دفعہ آزما چکا ہوں بتلائیے یہ کیوں ؟"

"مجھے نہیں معلوم، چلو نکلو یہاں سے مجھے نماز پڑھنے دو۔"

"میں بتائے دیتا ہوں۔ نماز میں اکثر لوگوں کا دل نہیں لگتا اس لیے جیسے ہی کوئی بہانہ ــــــ"

"اچھا سُن لیا، تمہارا دل بہت لگتا ہے نماز میں کافر کہیں کے۔"

"میں نہ کافر ہوں نہ ملحد، ہاں ذرا متشکک واقع ہوا ہوں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے۔"

"وہ شخص جو تشکیک میں مبتلا ہو۔"

"تشکیک کیا ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے ایک چیز جو لغت میں پائی جاتی ہے ــــــ میں بہت سنجیدگی سے آپ کے لیے ایک لغت اور ایک ڈکشنری خریدنے پر غور کر رہا ہوں تاکہ کبھی کبھار آپ ہماری بات سمجھ سکیں۔۔۔ اگر آپ تھوڑی سی محنت کریں تو اس بات کی گنجائش ہے۔"

"تم آسان زبان میں بات کیوں نہیں کرتے۔"

"آسان ترین زبان میں بات یوں ہے کہ میں اللہ کی ہستی کے بارے میں ذرا شک کا شکار ہوں اور بس۔"

"شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے، بے شرم کہیں کے۔"

"لو یہ خوب رہی، سچی بات کہنے میں کیا برائی ہے۔ ان منافقوں سے تو اچھا ہوں جو دل میں تشکیک میں مبتلا ہیں اور زبان سے اقرار کرتے رہتے ہیں۔"

"اچھا مجھے نماز پڑھنے دو گے یا نہیں۔"

"ایک شرط پر، مجھے پہلے یہ بتا دیجئے کہ مذہبیت کی یہ لہر کہاں سے ٹپک پڑی، میں نے آپ کی ہسٹری شیٹ میں اس مرض کا ذکر کہیں نہیں پڑھا۔"

"کیا یہ کوئی مرض ہے بھئی، ہٹو —— نماز پڑھنا بھی کوئی ایسی بات ہے جس کے لیے میں صفائی پیش کرتی پھروں۔"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے مگر ہر مرض کی کوئی نہ وجہ ہوتی ہے اور مذہبیت کا دورہ اگر ایک دم پڑے تو خاصا خطرناک ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی ایسا اہم جرم ہوا ہے جس کے لیے کفارہ ادا کرنا ضروری ہو۔"

"اچھا نہیں مانو گے تم، دفع ہو ورنہ میری نماز قضا ہو رہی ہے۔" دونوں ہاتھوں سے اس کی چوڑی پیٹھ کو دھکا دیتی گئی۔ دروازے تک جا کر آثم نے مزاحمت نہیں کی، اس کے باوجود کہ آتے ہوئے دروازے سے

باہر نکالنے میں خاصی دقت پیش آئی۔ اندر سے چٹخنی لگا کر وہ دوبارہ جانماز پر آ کھڑی ہوئی۔

"ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں"

آواز کی یہ لہر جب ڈوب گئی تب اس نے نیت باندھنے کی سوچی۔ اپنی ہتھیلیوں پر آثم کے مشکوک جسم کے لمس کے ساتھ نماز پڑھنے میں اسے تامل ہوا۔ غسلخانے میں جا کر ہاتھ دھوئے اور پھر نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر اس نے چٹخنی کھولی تو وہ پھر آن موجود ہوا۔ "میں ایک زمانے میں بدھ بھکشو بھی رہا ہوں۔" اس نے اعلان کیا۔

"اچھا!" گل حیرت سے بولی۔ "سچ بتاؤ۔"

"بالکل سچ فرما رہا ہوں، بدھ مندر یہاں سے نزدیک ہی ہے دیکھنا ہو تو چلیے۔"

"اچھا، شمسی سے کہتی ہوں مگر بارش کے آثار ہیں۔"

"یہاں بارش سے ہوّے کی طرح ڈرا نہیں جاتا، بارش تو یہاں ہر وقت ہوتی ہے اس سے کہاں تک بچیں گی۔ چلیے میں چھتری لے لیتا ہوں۔"

شمسی صاحب نے جانے سے انکار کر دیا تو مجبوراً گل کو آثم کے ساتھ تنہا جانا پڑا۔ ذرا دور چلے تو بارش شروع ہو گئی اور وہ دونوں

ایک ہی چھتری میں سمٹ آئے۔ مندر کے احاطے میں تاڑ کے لمبے لمبے درخت لگے ہوئے تھے۔ مندر کی عمارت دو منزلہ تھی جو کائی سے سیاہ ہو رہی تھی۔ آنند عمارت میں اطمینان سے داخل ہوا اور گل کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ گل کبھی کسی عبادت خانے میں داخل نہ ہوئی تھی۔ وہ سہم کر یوں چل رہی تھی جیسے سیڑھیوں پر بتاشے بچھے ہوں۔ اوپر ایک بڑا سا کمرہ تھا اور بالکنی جس کی دیوار پہ ڈاب کی شاخیں جھول رہی تھیں۔ کمرے میں چاروں طرف دیواروں سے لگی شیشے کی الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ گل کو اندازہ نہیں تھا کہ مندروں میں کتابیں بھی ہوتی ہیں۔

"یہ کیسی کتابیں ہیں؟" گل نے پوچھا۔

"آکر دیکھئے، یہ کتابیں پالی، ہندی اور سنسکرت کی ہیں۔ یہ رگ وید کی جلدیں ہیں۔ یہ کتابیں انگریزی کی ہیں بدھ مذہب کے بارے میں۔ ان میں سے کچھ ترجمہ ہیں۔ بدھ مت کے پچیس سو سال، بدھ مت کی تاریخ اور بدھ مت کا فلسفہ۔ یہ الماری ہے جس میں جنرل کتابیں ہیں اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ اس میں انگریزی ناول بھی ہیں۔ بدھ بھکشو گلے میں گیروے رنگ کے بھاری لبادے ڈالے ننگے پاؤں آجا رہے تھے۔ بڑی عمر کے بھکشو نظریں نیچی کیے گزر جاتے تھے مگر

نوعمر بھکشو اپنی کالی افسردہ اور گرسنہ آنکھوں سے اس کی طرف تکتے رہ جاتے تھے۔

"آیئے اب بدھ جی سے ملیے۔" کمرے میں ایک طرف ایک لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا جس کی دوسری طرف پلیٹ فارم پر بدھ جی براجمان تھے۔ یہ مورتی سنگ مرمر کی تھی۔ بدھ جی کی خوبصورت آنکھیں نیم وا تھیں اور ان کے چہرے پر ازلی و ابدی تقدس برس رہا تھا۔ آس پاس اور بھی مورتیاں تھیں جن میں وہ اور ان کے پیرو دکھائے گئے تھے۔ بدھ جی کی بڑی مورتی کے آگے میز پر ایک بہت بڑا چینی کا سیاہ گلدان رکھا تھا جس پر بڑا سا ایک سفید پھول تھا۔ لکڑی اور شیشے کا بنا ہوا نفیس سا ایک کیبن تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار قیمتی ٹیبل لیمپ اور خوبصورت گلدان تھے۔ گلدانوں میں پلاسٹک اور کاغذ کے پھول تھے۔

"ملاحظہ کی یہ بدعت آپ نے۔ ٹیبل لیمپ موم بتیوں کے اور گلدانوں میں پلاسٹک کے پھول تازہ پھولوں کا بدل ہیں۔ مگر ان سب چیزوں میں وہ بات کہاں جو چراغوں میں پڑے ہوئے چند تازہ پھولوں میں ہوتی ہے۔ اب تو لگتا ہے جیسے بدھ جی ان چیزوں کی حفاظت پر مامور ہوں۔"

"یہ دیکھئے جنگلے میں تالا بھی پڑا ہوا ہے۔" آتم نے تاسف سے

کہا۔

"اور یہ شیشے کا کیس کس لیے ہے ؟" گل نے پوچھا۔

"محض شو ندرتا کے لیے، یعنی سجاوٹ، ڈیکوریشن، سمجھیں آپ"۔
گل کو لگا کہ وہ خواہ مخواہ تلخ ہوا جا رہا ہے جیسے یہ سب گل کا کیا دھرا ہو۔ پھر وہ نزدیک کے چھوٹے سے کمرے میں گئے جہاں بدھ مذہب کے آثارِ قدیمہ کے چند نمونے رکھے ہوئے تھے۔ سیاہ پتھروں پر نفیس کھدائی کا یہ کام گل نے ٹیکسلا اور پشاور میوزیم میں بھی دیکھا تھا۔

"تم کیا سچ مچ یہاں رہے ہو؟" گل نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"آئیے میں آپ کو وہ جگہ دکھاؤں جہاں میں رہتا تھا۔" پیچے وہ اسے ایک خالی ڈھنڈار کمرے میں لے گیا جہاں زمین پر دو بستر بچھے ہوئے تھے۔ یہ بستر صرف دو پھٹی ہوئی دریوں اور ایک طرف پڑی ہوئی سلیٹی رنگ کی بوسیدہ چادروں پر مشتمل تھے۔

"یہاں میرا بھی اسی نمونے کا ایک بستر تھا۔" آتم نے پورے اطمینان سے گل کو بتایا۔ گل ننگے فرش اور بوسیدہ بچھونوں کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ دو تین بھکشو کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں وہ اپنی بڑی بڑی ناآسودہ آنکھوں سے گل کو ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ گیروے لباس ان پر اچھے لگ رہے تھے دفعتاً گل کو

خیال آیا کہ یہ رنگ آتم پر کتنا سجتا ہوگا۔ نارنجی چادر میں سر سے پاؤں تک اپنے سفید بڑے سے جسم کو چھپائے، ہری آنکھوں والا یہ بھکشو سفید سفید ننگے پیروں سے چلتا ہوا کیسا عجیب الخلقت لگتا ہوگا۔

"تم پر تو ساری بھکشنیں عاشق ہو گئیں ہوں گی ایک دم!" گل نے اسے چھیڑا۔

"ہاں اور پتہ ہے جانے کیسے یہ بات مشہور ہو گئی کہ ایک یورپین بھکشو بن گیا ہے، لوگوں کے لیے میں تماشہ بن گیا تھا۔ غیر ملکی آکر مجھ سے سوالات پوچھتے تھے اور میری تصویریں کھینچتے تھے۔"

"پھر تم واپس آدمی کیسے بن گئے؟"

معلوم نہیں، ایک چیز ہوتی ہے روح کی پکار اس سے مجبور ہو کر میں بھکشو بن گیا مگر بھی کچھ باتیں ہوتی ہیں اب مثلاً زمین پر سونے اور ننگے پیر پھرنے سے بھی کٹھن کام تھا کشکول اٹھائے پھرنا اور گھر گھر جا کر مانگنا۔ آواز نہیں لگانی پڑتی تھی مگر کشکول اٹھا کر گھر گھر پھرنا بھکشو کا کام ہے۔۔۔ ہر مذہب میں راہب بنتے وقت انسان کو سب سے پہلے اپنی انا کا خاتمہ کرنا پڑتا ہے اور ہم جیسوں کے لیے یہی سب سے مشکل کام ہے ۔۔۔۔ پھر اور بھی کئی باتیں تھیں۔ اصل میں مذہب اپنی اصلیت سے بہت دور ہٹ چلے جاتے ہیں۔ مجھے خیال آتا تھا کہ جس شخص نے دنیا کی

ہر آسائش کو چھوڑ کر نروان حاصل کیا انہیں ان لوگوں نے پھر مایا کے جال میں جکڑ دیا جن چیزوں کو اس نے تیاگا ان میں تو واقعی کچھ موہ تھا بھی مگر اب اسے جن شیشے کے برتنوں اور قیمتی گلدانوں کے ساتھ قید کر کے تالا لگا دیا ہے اس سے تو بدھ جی کی کیا کسی معمولی آدمی کی بھی ہتک ہوتی۔ کم از کم میں تو کبھی گوارا نہ کروں کہ میری آزاد آتما کو یوں لوہے کے پنجرے میں بند کر دیا جائے۔ جب ایسے خیالات ذہن میں آنے لگیں تو بھکشو بنے رہنے کی کوئی تک نہ تھی۔ مذہب اوپری چیز نہیں ہے، یہ دل اور روح کے اخلاص کا معاملہ ہے چنانچہ یوں ہم نے بدھ جی کو تیاگ دیا۔"

"اب واپس چلا جائے" گل نے کہا۔

"ابھی تو آپ نے امیر بدھ جی ہی دیکھے ہیں بیچارے غریب بدھ جی کو بھی تو دیکھتی چلیے۔"

"غریب بدھ جی!"

"ہاں۔"

بارش وقتی طور پر تھم چکی تھی۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ مندر کے احاطے میں آئے اور پھر آتم اسے الگ کونے میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں لے گیا۔ یہاں بھی بدھ جی اسی انداز میں پلتھی مارے آنکھیں

نیم وا کیے بیٹھے تھے۔ ان کے جسم پر زرد رنگ کا روغنی پینیٹ تھا اور کندھے سے کمر تک گیروے رنگ کے کپڑے کا پٹکا بندھا ہوا تھا ان کے چرنوں میں مٹی کے حقیر کوزوں میں سفید کنیر کے چند پھول رکھے تھے۔

"یہ بڑی پرانی مورتی ہے، کھدائی میں نکلی ہے زنانہ اسپتال کے علاقے میں سے، خیال ہے کہ یہ پال عہد کی ہے۔" آتم نے گل کو بتایا۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ غریب۔۔۔۔۔"

آتم کے چہرے پر ہلکی سی طنزیہ لہر ابھری۔

"دیکھ نہیں رہیں آپ ان کے پاس کوئی مال و متاع نہیں ہے اسی لیے ان کی کوٹھری دن رات کھلی رہتی ہے اور غریب غربا ہر وقت آ کے ان کے آگے جھک سکتے ہیں جب کہ اوپر والے بدھ جی کے آگے جھکنے کے وقت مقرر ہیں۔ رات کو ان کو بند کر دیا جاتا ہے تاکہ کوئی عبادت کے بہانے آن کر انہیں لوٹ کر نہ لے جائے۔"

"بدھ لوگ گوشت وغیرہ کھاتے ہیں؟" گل نے پوچھا۔

"ہاں بشرطیکہ انہیں کسی گھر میں یا ان کے سامنے ذبح نہ کیا گیا ہو۔ وہ خود کسی جاندار کو نہیں مارتے۔" یہ سب بتاتے ہوئے وہ کسی

ضدی بچے کی طرح اینٹھا ہوا اور ناراض سا لگ رہا تھا۔ گھر کی طرف چلنے کی بجائے وہ سڑک پار کر کے سامنے کی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو بھئی؟" گل نے اُلجھ کر پوچھا۔

"چلی آئیے، آپ کو کھا نہیں جاؤں گا، آپ مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟" اس نے اتنی بدتمیزی سے کہا کہ گل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"واہ، میں اور آپ سے ڈروں گی شکل دیکھی ہے آئینے میں" یہ کہتے ہوئے گل شرم اور غصے سے سُرخ پڑ گئی تھی۔ پگڈنڈی پہ وہ دھیرے دھیرے سبز پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ یہاں بڑے بڑے درخت تھے جن کے خود کے پتے تو چھوٹے چھوٹے تھے مگر چوڑے سے تمباکو جیسے پتوں کی بیلیں درخت کے تنوں سے پھوٹ کر سارے میں چھائی ہوئی تھیں۔

"اس درخت میں سے یہ بیلیں کیسی نکل رہی ہیں؟" گل نے محض بات کرنے کی خاطر کہا۔

"بعض چیزوں کی عادت ہوتی ہے کہ جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے ان پہ ان کی مرضی کے بغیر حاوی ہو جاتی ہیں، بری طرح چھا جاتی ہیں۔ اس درخت کی ٹریجڈی یہ ہے کہ یہ اس بیل کو

جھٹک نہیں سکتا چاہے اس کی اپنی ہستی اس کی وجہ سے فنا ہو جائے
بے چارہ درخت۔" اس کی نیلی آنکھوں میں اس درخت کے لیے
ایسی خوف ناک ہمدردی تھی کہ گل سہم گئی۔ پہاڑی کے اوپر پہنچے تو
دوسری طرف ایک بہت بڑا تالاب تھا جو پانی سے لبالب چھلک
جانے والے پیالے کی طرح بھرا ہوا تھا۔ دوسرے کنارے کے
نزدیک چند بچے اس میں نہا رہے تھے۔ گل ایک درخت کی کرسی
کی طرح نکلی ہوئی جڑھ پہ بیٹھ گئی جو بارش کی وجہ سے سیلی ہوئی تھی۔
فضا میں گیلی گھاس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔
اور آسمان پر بادلوں کا ڈیرہ۔ آتم کچھ دیر کھڑا تالاب کے ہرے
پانی کو دیکھتا رہا، پھر اس کے نزدیک آکر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے اس نے
گل کا ایک ہاتھ اُٹھا کر غور سے دیکھا اور دھیرے سے بولا۔" کتنا
خوبصورت ہاتھ ہے۔" گل سر سے پیر تک کانپ گئی۔ ہاتھ کو
واپس اس کی جگہ رکھ کر وہ بولا۔

"سُنا ہے مغربی پاکستان میں آپ بڑی شوخ و چنچل، ناچنے گانے
اور ملنے ملانے کی شوقین ہوا کرتی تھیں، مگر یہاں آتے ہی آپ
ایک دم بجھ گئی ہیں، یہ کیوں؟"

"یہاں کسی سے ملنا ملانا ہے ہی نہیں۔" گل نے گول مول سا

جواب دیا۔

"ہو تو سکتا ہے، یہاں کلب بھی ہے، اچھا سا گالف کورس بھی ہے، مگر آپ سے کہیں جانے کو کہا جائے تو آپ ٹال جاتی ہیں یہ آپ کے شوہر کا بیان ہے۔"

"ہاں کچھ جی نہیں چاہتا۔"

"شمسی صاحب کہہ رہے تھے کہ سیر و تفریح کا پروگرام بنایا جائے۔ آپ کو سیر و سیاحت کا شوق تو ہے نا؟"

"ہاں تھا تو۔"

"یعنی اب نہیں ہے؟"

"نہیں، اب بھی ہے مگر وہ پہلی سی بے تابی نہیں ہے۔"

"بے تابی۔" آثم دھیرے سے مسکرایا جسے گل نہ دیکھ سکی۔

"ایک بات بتائیے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "جب شمسی صاحب نے پہلے پہل آپ کا ہاتھ تھاما تھا تو آپ کو وہ تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی تھی جو کہتے ہیں ہر لڑکی کو پہلے پہل کسی مرد کے ہاتھ تھامنے سے محسوس ہوتی ہے۔"

"کیا بیہودہ سوال ہے۔" گل بگڑ گئی۔

"بتا دیجئے مجھے معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہے،

اسے سائینٹیفک اسٹڈی کا حصّہ سمجھ کر بتا دیجئے۔"

"ارے واہ، یہ کیا بکواس ہے، بات کرنی ہے تو ڈھنگ کی کرو ورنہ چلو کیوں خواہ مخواہ دیر کر رہے ہو۔"

"جانے کو تو ابھی دل نہیں چاہ رہا البتہ ڈھنگ کا موضوع آپ کو سوچنے کی اجازت ہے۔"

"اچھا یوں کرو گا نا سناؤ، میں نے تمہیں گاتے سنا ہے اچھا خاصا گا لیتے ہو۔"

"اچھا خاصا۔" وہ ہنسا "اجی جناب اس نغمے کے دیس میں بھی چند ہی گانے والے ہماری ٹکر کے ہوں گے، برسوں ریاض کیا ہے برسوں اور حضور فرما رہی ہیں اچھا خاصا ——— یہ قدر افزائی ہے ہماری۔"

"جب تک سُنا نہ ہو کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"سن کے وہ سمجھ جائیں یہ دعوے نہیں کرتے۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا بنگلہ گانا سنیں گی آپ؟"

"پلّے تو کچھ نہیں پڑے گا۔"

"ہر چیز کا پلّے پڑنا ہی ضروری نہیں ہوتا، انسان محسوس کر سکے

یہی بڑی بات ہے۔" وہ تھوڑی دیر گنگناتا رہا پھر بڑی مدھر اور گھمبیر اور پاٹ دار آواز میں گانے لگا۔ کچھ دیر بعد رک کر اس نے کہا۔ ان الفاظ کے معنی ہیں۔

میں ایک گانے والا پرندہ تھا
کچھ دن شاخوں پر بیٹھا تھا۔
گانے ختم ہو جانے کے بعد جب میں چلا جاؤں گا۔
تو وہ گانے سدا میری یاد دلائیں گے۔
اس وقت پرندہ تو نہیں رہے گا مگر اس کا سر ضرور رہے گا
میں تو پرواز کر جاؤں گا ——— مگر تو ریت کا ٹاپو بن کر رونا رہے گا۔

وہ اپنی گھمبیر اور پرسوز آواز میں پھر گانے لگا۔

گل کو یکایک اس پر بے انتہا پیار آنے لگا۔ یہ پیارا سا خوبصورت شخص اپنا گھر بسا کر کیوں نہیں بیٹھتا۔ ہائے اس شخص کے کتنے پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ سفید روئی کے گالوں جیسے موٹے موٹے، صاف ستھرے جیسے انگریزی کی ٹیکسٹ بک میں بنے ہوئے خوبصورت رنگین کپڑوں میں ملبوس بچے۔ جانے یہ کیوں اپنی زندگی کو یوں آوارہ اور بے مقصد گزار رہا ہے۔

"کیوں پسند آیا کچھ؟" گانا ختم کر کے اس نے کہا۔

"سچ مچ تم تو بہت اچھا گاتے ہو۔"

"بندہ نوازی۔" اس نے شرارت سے گردن جھکائی۔ "اب چلیے۔"

ہلکی ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ ایک ہی چھتری میں سیڑھیاں اُترتے ہوئے گل نے اچانک کہا "سُنتے ہو، میں تمہارے لیے لڑکی کی تلاش شروع کرتی ہوں۔"

"کیا مطلب۔" آثم نے بغیر رکے پوچھا۔

"تمہارے لیے بیوی، بیگم صاحبہ، دُلہن اور کیا مطلب؟"

"اوہ اچھا ——— مگر مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی۔ بادشاہ لوگ کسی کے گانے سے خوش ہو کر انعام واکرام دیا کرتے تھے، پھانسی یا شادی کی سزا دیتے تو کسی کو نہیں سُنا۔"

"تو تم پھانسی اور شادی کو برابر سمجھتے ہو؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں مگر ——— بات یہ ہے کہ شاید زندگی میں آج تک میں نے کوئی صحیح معنوں میں خوش شادی شدہ جوڑا نہیں دیکھا۔"

"واہ ——— ہمیں ہی دیکھ لو۔" وہ ہنسی۔

پھر یکایک وہ گنگنانے لگا۔

پانی وچ ماچھی پیاسی رہے۔ مجھے سُن سُن آوت ہانسی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" گل یکایک سُرخ پڑ گئی۔

"کچھ نہیں ایک دوہا یاد آگیا تھا ——— ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آج تک میں نے جتنی شادی شدہ عورتیں دیکھی ہیں ذہنی طور پر سب بیمار ہیں ——— گو بظاہر انہیں کوئی نہ کوئی جسمانی بیماری ہے۔ زیادہ تر الرجک ہیں، کوئی عطر کی خوشبو برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی مٹی کے تیل کا بھبکا نہیں سہہ سکتی، کسی سے ٹھنڈ برداشت نہیں ہوتی کسی سے گرمی۔ یہ سب پرہیزی کھانا کھاتی ہیں، اکثر ہے چاریاں خالی دواؤں سے پیٹ بھرتی ہیں۔ یہ سب اپنے شوہروں سے بے حد محبت کرتی ہیں اور ان کے شوہر بھی ان پر سو جان سے فدا ہیں۔ ان کے عیش و آرام پر اپنے ہر سکھ کو ترجیح دیتے ہیں۔ باہر جاتے ہیں تو ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے لیے ڈھیروں چیزیں لاتے ہیں۔ ان کی خدمت کو نوکروں کی فوج موجود ہے، ار روپیہ ہے آرام ہے مگر یہ سب کی سب بیمار ہیں، مجھے بتائیے، کیوں؟"

"تمہیں بتاؤ، کیوں؟"

"اس لیے کہ ان میں سے بہت سی عورتوں نے شادی کر کے

دن سے اب تک ذہنی طور پر اپنے میاں کو قبول نہیں کیا ہے مگر
نبے چاریوں نے اپنی وفا میں کھنڈت بھی نہیں ڈالی ہے اور وہ اپنی
وفا اور میاں کو پسند نہ کر سکنے کا انتقام اپنی بیماری اور میاں کی خدمت
سے لے رہی ہیں۔"

"بکتے ہو تم۔؟" گل چڑ کر بولی۔

"یہی سہی —— مگر میں کسی ایسی عورت کی نازبرداری نہیں کر
سکتا جو مجھ سے اپنی وفاؤں کا انتقام لے۔"

"ارے تمہیں تو ہزاروں عورتیں دیوتا بنا کر پوجنے کو تیار ہو ں
گی۔"

"صرف شادی سے پہلے، شادی کے فوراً بعد وہ مجھے سنگھاسن
سے اُتار کر خود اس پر چڑھ کر بیٹھ جائیں گی اور چاہیں گی کہ میں ان کے
آگے پھول چڑھاؤں جو ذرا مشکل کام ہے میرے لیے۔"

"تم عورتوں کی توہین کر رہے ہو، تمہیں معلوم نہیں دنیا میں کیسی
کیسی عورتیں ہیں جنہوں نے مردوں کے لیے ہر طرح کی قربانیاں
دی ہیں۔"

"قربانی میں نہیں چاہتا صرف اپنی قربانی سے ڈرتا ہوں۔"

"جی نہیں بات یہ ہے کہ تم ساری عمر دیوتا بن کر رہنا چاہتے ہو،

تم اپنی خوبصورتی سے، اپنی باتوں سے لڑکیوں کو پھانسے رہو گے، وہ تم پر مرتی رہیں گی اور تنگ آ کر کہیں اور شادی کر لیں گی اور پھر جب تم بڈھے ہو جاؤ گے اور تمہیں لڑکیاں لفٹ دینی چھوڑ دیں گی تو تم کسی معمولی سی لڑکی سے شادی کر کے بیٹھ رہو گے، میں نے تمہارے جیسے بہت لوگ دیکھے ہیں۔"

آثم نے چونک کر اسے دیکھا۔ گل جسے وہ ذہنی طور پر اپنے سے بہت کمتر سمجھتا تھا اکثر ایسی باتیں کہہ کر اسے چونکا دیتی تھی، اسی لیے وہ جمال سے اکثر کہا کرتا تھا کہ گل کو اگر موقع ملے تو ذہنی طور پر اس کی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ باقی سارے راستے وہ خاموش اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ گل سوچ رہی تھی آثم نے جو کچھ کہا ہے اس میں کچھ سچائی بھی ہے، آثم سوچ رہا تھا گل کی بات بھی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہو گئی تھی اور وہ بہت حد تک بھیگ گئے تھے ـــــ اس وقت بھی بارش پہلے سے تیز ہو گئی تھی مگر اتنی نہیں کہ گل اور جمال کو روک دے۔ راستہ اور کٹھن ہو گیا تھا، گل اب پھر جمال سے تھوڑا سا پیچھے رہ گئی تھی ایک چھتری میں دو آدمیوں کا چلنا دشوار تھا، اس کی کگروں سے گرنے والا پانی ساتھ چلنے والے آدمی کو بارش کے پانی سے زیادہ بھگوتا تھا اور

چھتری خود لے کر چلنا گل کے بس سے باہر تھا۔ اس نے اپنا سوئٹر
سر پر ڈال لیا تھا اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ زیادہ چڑھائی کی
وجہ سے راستہ اور بھی کٹھن ہو گیا تھا اور وہ بہت تھک گئی تھی۔ آخر کار
وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ دُور دُور کوئی درخت یا آڑ نہ تھی۔
جمال لوٹ کر نزدیک کے دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے فلاسک سے
چائے نکال کر گل کو پلائی اور پھر کچھ دُور بیٹھے ہوئے چند آدمیوں سے
راستہ اور فاصلہ پوچھا —— انھوں نے دُور پہاڑ کی کگر پر چلتے ہوئے
صنوبر کے درخت دکھائے، جھیل ان کے پیچھے تھی۔ ہاتھ سے راستے
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ پہلے سڑک پر پڑے
ہوئے ایک گلیشئر کو پار کرنا ہوگا، پھر اگر وہ چھوٹے راستے سے
جانا چاہیں تو سڑک کو چھوڑ کر نالا پار کر کے پگڈنڈی پر آگے بڑھتے
جائیں ورنہ سڑک پر گول گول گھومتے ہوئے چلے جائیں مگر یہ راستہ
یقیناً لمبا ہوگا۔ گل کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ابھی تک انھوں نے
صرف مد میل کا فاصلہ طے کیا تھا مگر اب لوٹ جانے سے آگے جانا
بہرحال زیادہ پرکشش تھا اس لیے ہمت کر کے وہ پھر چل کھڑی ہوئی
جمال اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور لمبے ڈگ بھرنے کی وجہ سے
ذرا ہی دیر میں اس سے پھر آگے نکل گیا، بوندیں اور تیز ہوئیں تو گل

نے اک گرڑھے پتھروں کے بنے ہوئے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"کیوں نہ کچھ دیر اس میں ٹھہر جائیں۔" وہ دونوں اس کی طرف بڑھے تو دور سے آدمی چلائے۔

"ان میں لیسو ہیں لیسو، کھا جائیں گے، یہ جانوروں کی جگہ ہے۔"

"چھوڑو،" جمال نے کہا: "ویسے بھی وہاں بہت گندگی ہو گی، تم ایک منٹ نہیں ٹھہر سکو گی، اب ٹھہرنے کا سوال نہیں آگے بڑھو یا لوٹ چلو۔"

"آگے بڑھو یا لوٹ چلو، آگے بڑھو یا لوٹ چلو۔" گل ابھی تک کہیں سے لوٹی تو نہیں تھی، آگے بڑھی تھی تو بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ بغیر ایک لفظ کہے وہ آگے بڑھ گئی۔ بوندوں کو سر اور کندھوں سے جھٹکتے کبھی ایک چھتری میں اور کبھی الگ الگ وہ چلتے رہے۔ ایک میل اور گھسٹنے کے بعد انہیں گلیشئر ملا جو راستے میں سنگ میل کا کام دے رہا تھا جمال نے گھڑی دیکھی۔ پورے ڈھائی گھنٹے میں وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ پہاڑ سے اترتا ہوا یہ گلیشئر سڑک ڈھانکتا ہوا نیچے اترتا چلا گیا تھا۔ اس پر مٹی کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی مگر اندر سے برف جھانک رہی تھی۔ سڑک کی جگہ برف کے تودے کو کاٹ کر راستہ بنا دیا گیا

تھا لیکن اس پر برف بدستور جمی ہوئی تھی۔ یوں تو یہ گلیشیر ساکن نظر آتا تھا
مگر اس کے چلنے کا ثبوت یہ تھا کہ برف پر کئی ایک ایسے کٹے ہوئے
راستوں کے نشان تھے جو کسی زمانے میں بطور سڑک بنائے گئے تھے
مگر اب کھسک کر نیچے ڈھلان پر چلے گئے تھے۔ ٹھنڈے گلیشیر کے
اوپر سے گزرتے ہوئے گل کے چپاتی سے جوتے تر ہو گئے اور پانی
نے اندر پہنچ کر موزوں کو بھی گیلا کر دیا۔ تیس فٹ کی یہ ٹھنڈی پلیٹ فارم
طے کرنے کے ذرا دیر بعد نالا پار کرنے کی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔
نالا بہت تیز بہہ رہا تھا اور دوسری طرف قطعی کوئی راستہ دکھائی نہ
دیتا تھا جس پر وہ آگے بڑھ سکیں۔ جمال نے ایک جگہ نالے کی چوڑائی
اور گہرائی کو ناپ تول کے کہیں پتھروں پر اور کہیں پانی میں پاؤں ڈال کر
اسے پار کر لیا مگر گل کے لیے یہ آسان کام نہ تھا جب کہ وہ اپنے پیروں
کو مزید تر ہونے سے بچانا چاہتی تھی۔ جمال نے چھتری، کھانے کا بنڈل
اور فلاسک ایک پتھر پر رکھ کر گل کا ہاتھ تھام کر اسے نالہ پار کرایا۔
گل کے ہاتھ بالکل ٹھنڈے ہو چکے تھے اور وہ اپنے پیروں کو نالے
کے یخ پانی کی زد سے نہ بچا سکی تھی۔ جمال نے گل کے ہاتھ اپنے ہاتھوں
میں لے کر ان کو گرم کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا ہوتا اگر ہم آج نہ آتے۔" گل نے کہا۔

"اگر آج نہ آتے تو پھر کبھی نہ آتے، زندگی میں یہ کٹھور تا بھی ہے کہ جو لمحہ گزر جاتا ہے۔ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔" جمال نے گل کے ہاتھ چھوڑ کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ چھتری کی آڑ میں سگریٹ کے کش لینے کے بعد جب وہ آگے بڑھا تو راستہ کہیں نہیں تھا کہیں کسی پگڈنڈی کے آثار نہیں تھے، صرف پہاڑ اور ان کے نوکیلے پتھر ان کے سر پر دیوار بنے کھڑے تھے، ریت بھی بھربھری اور پھسلنی تھی اور نیچے نالہ شائیں شائیں بہہ رہا تھا۔ جمال خود ہی سنبھل سنبھل کے راستہ بناتا ہوا دیوار سے پہاڑ پر پتھر اور جھاڑیاں پکڑ پکڑ کر چڑھ رہا تھا اور گل زمین میں اپنی لکڑی احتیاط سے دھنسا دھنسا کر جمال کے نقشِ قدم پہ چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا پیر پھسل جاتا تو نالے میں نہاتے شفاف پتھروں کے سوا اور کہیں رکنے کا ٹھکانہ نہ تھا۔ آخر نالہ پیچھے رہ گیا اور وہ مستقل عمودی چڑھائیاں چڑھتے رہے، ایک چڑھائی کے بعد غیر محسوس طور پر دوسری چڑھائی ان کی منتظر تھی جیسے کہیں ان کا انت نہ ہو۔ گل کو محسوس ہوا جیسے اس کی کمر دہری ہو کر رہ گئی ہے۔ بارش باریک بوندوں کی شکل میں متواتر ہو رہی تھی، سر پہ بندھا ہوا سوئیٹر اسے کسی حد تک بارش سے بچا رہا تھا اور پہنے ہوئے موہیر کی جرسی پر بوندیں موتیوں کی طرح جم گئی تھیں۔ مشقت کی وجہ سے

نرالی چیز تھی۔ بہت سوچنے کے بعد جب گل فیصلہ نہ کر سکی کہ یہ کیا ہے تو اس نے آتم سے پوچھا۔ آتم ہنس پڑا، شمسی صاحب بھی ہنسے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی "یہ صرف باتھ روم ہیں!" آتم نے انکشاف کیا۔ اس علاقے میں سڑک کے کنارے بہت سے مکان بانس کے ستونوں پر بنے ہوئے تھے کیونکہ زمین پر پانی تھا یا پانی آجانے کا امکان تھا۔ سڑک سے گھروں تک تختوں کے بے انتہا کا جو جھول پل تھے جیسے ایک آدمی کے بوجھ سے جھونک کھا کر گر پڑیں گے۔ ایسے ہی ایک پل پر تصویر لینے کی ٹھانی گئی۔ ایک میں گل اور شمسی صاحب کھڑے ہوئے اور دوسری میں گل اور آتم۔ آتم نے مزے سے گل کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ گل نے پھڑک کر الگ ہونا چاہا مگر تصویر کھنچ چکی تھی۔

تین دن وہ دنیا بھر کی فکروں سے بے نیاز سیر کرتے پھرے۔ فی الحال وہ پچھلا گھر چھوڑ چکے تھے اور اگلا گھر ابھی لیا یا نہیں تھا۔ یہ بے گھر اور بے درد پھرتے رہنا گل کو بڑا اچھا لگا۔ ان کی زندگی لال باغ قلعے پیری بی کے مزار، مختلف مسجدوں، عجائب گھروں اور باغوں میں بسر ہو رہی تھی۔ آتم یہ سب جگہیں پہلے دیکھ چکا تھا۔ جب وہ نصف مزاحیہ اور نصف فلسفیانہ انداز میں ان تاریخی عمارتوں پر روشنی ڈالتا تو گل کو بڑا مزا آتا۔ شمسی صاحب تھک کر اکثر بیری دو سبایا

اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا اور چہرے پر پسینے کی بوندیں بارش کی بوندوں میں رل مل گئیں تھیں۔ جمال نے ایک دفعہ اور اسے چھتری کی پیشکش کی اور اس کے انکار کے بعد بغیر پیچھے دیکھے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ گل کس حد تک تھک گئی ہے۔ اسے مدتوں سے پیدل چلنے کی عادت نہیں رہی تھی چہ جائیکہ متواتر یہ جان لیوا چڑھائی۔

آدمیوں نے انہیں بتایا تھا کہ گلیشئر پار کر لینے کے بعد شارٹ کٹ سے جھیل صرف ایک میل رہ جاتی ہے۔ اس وقت تو اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے نالہ پار کیا اور جھیل سامنے آکھڑی ہوئی مگر اب تو وہ چل چل کر ہانپے جا رہی تھی، سوائے مزید چڑھائیوں کے اور کچھ بھی تو نہ تھا۔ چلتے چلتے اچانک گل کو خیال آیا کہ وہ ضرور راہ بھٹک گئے ہیں ورنہ اب تک ایک میل تو ضرور چل لیے ہوں گے۔ یہاں نہ کوئی مناسب پگڈنڈی تھی، نہ میلوں کے نشان نہ آبادی نہ جانور جو نزدیک ہی کہیں نہ کہیں کسی آبادی کا امکان ظاہر کرتے ہیں اور نہ ہی قافلے تھے۔ جمال کو بمشکل روک کر گل نے یہ بات کہی تو اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ "چلی آؤ۔" اس نے کہا۔ "ہم سب راہ بھٹکے ہوئے ہیں، کسی کے پیچھے چلنا اس بات کی گارنٹی نہیں کہ ہم

صحیح راہ پہ ہیں ــــــــ وہ دیکھو وہ صنوبر کے درخت نظر آ رہے ہیں، جھیل ان کے پیچھے ہے۔"

اسی وقت پانی کی وہ بوندیں جو اب تک ان کے سروں پر برس رہی تھیں یکایک برف بن کر ٹپکنے لگیں۔ ایک لمحہ رک کر گل نے آسمان سے گرتی اس برف کو دور دور کے پس منظر میں دیکھا، کس قدر خوبصورت منظر تھا۔ خواب کی طرح حسین ـــــ پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس بلند ٹھنڈے پلیٹو پر صنوبر کے درخت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حوصلے سے کھڑے تھے اور آسمان سے روئی کے باریک باریک پتوں کی طرح گرتا، ہوا سے تتلیوں کی طرح اڑتا، درختوں کی ٹہنیوں اور زمین پر ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ بیٹھتا یہ برف جیسے زمین والوں کے لیے کوئی آسمانی پیغام تھا۔ کچھ دیر کو گل اپنی ساری فکریں بھول کر اس حسین منظر میں کھو گئی مگر پھر منزل کے خیال نے اسے پکارا اور جمال کو زیادہ دور ہوتے دیکھ کر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ یہاں زمین قدرے ہموار ہونے کی وجہ سے تیز چلنا آسان تھا مگر چڑھائی اب بھی تھی گو بتدریج۔ دفعتاً گل کو ایک عجیب خیال آیا اگر اس وقت اس کے ساتھ جمال کے بجائے ماجد ہوتا تو لیکن اس کی تو ایک ٹانگ مصنوعی تھی وہ کہاں ان پہاڑوں سے سر پھوڑ سکتا تھا شاید وہ تو یہ

سوچ بھی نہ سکتا ہو کہ گل کسی تیسرے ہی شخص کے ساتھ پہاڑ کی ان بلندیوں کو سر کرے جو اس کے لیے ہمالیہ کی چوٹیوں کی طرح ناقابلِ تسخیر ہیں۔ نہ جانے ماجد اب کیسا ہوگا، مشرقی پاکستان آنے سے پہلے جب وہ آخری بار ماجد کے گھر گئی تھی تو وہ بیمار تھا۔ اس وقت تک اس کے مرض کی تشخیص نہ ہو پائی تھی خون کے ٹیسٹ وغیرہ ہو رہے تھے گھر والوں کا خیال تھا کہ عام بخار ہے ٹیسٹ وغیرہ کے دوران ہی بغیر کسی باقاعدہ علاج کے اُتر جائے گا۔

وہ بستر پر لیٹا ہوا اُداس اور کمزور لگ رہا تھا، جب اس نے بتایا کہ وہ انہیں خدا حافظ کہنے آئی ہے تو وہ اور بھی افسردہ ہو گیا۔ ماجد کی امی نے پہلے دن کی طرح اسے گلے سے لگایا اور دعائیں دیں، بہنیں بھی بڑے تپاک سے ملیں۔ ماجد نے اس دوران کئی دفعہ گل کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس سے دُور جا کر سراسر زیادتی کر رہی ہو مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولا۔ لڑکیوں نے بھی مختصر ملاقات کے پیشِ نظر ضرورت سے زیادہ افسوس کا اظہار نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اکیلے رہ گئے تو گل نے اپنے مخصوص اپنائیت بھرے لہجے میں اس کی طبیعت پوچھی۔ ماجد نے گہری افسردگی سے کہا یہ تو یونہی ذرا سا بخار ہو گیا ہے مگر گل —— کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

کوئی انگلیاں چبھو چبھو کر میرے دل میں سوراخ کیے دے رہا ہو۔ کیا
میں اس دکھ سے کبھی نجات نہ پا سکوں گا؟"

"کیوں نہیں۔" گل نے بڑے تعیقن سے کہا تھا۔ "میں تو سمجھتی
ہوں انسان اپنے ہر غم کو بڑھانے اور گھٹانے کا خود ذمّہ دار ہے۔"

"اچھا" ماجد نے حیرت سے کہا۔ "کیا تم نے کوشش سے اپنے
کسی غم پر قابو پایا ہے؟"

"ایک نہیں کئی ——— مگر خدارا مجھ سے ان کے بارے
میں کچھ نہ پوچھئے۔"

"گل، اگر تم ان غموں کو واقعی بھول گئیں ہو تیں تو ان کو دہرانے
کے خیال سے یوں کانپ نہ جاتیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" گل نے دھیرے سے کہا۔ "مگر میں بلاوجہ
ان کو یاد کر کے کڑھتے رہنے کے حق میں نہیں ہوں، یہ آپ بھی
کر سکتے ہیں۔"

"شاید ——— کوشش کر دیکھوں گا، اگر کبھی اس طرف آؤ تو
یہ دیکھنے ضرور آنا کہ میں اس میں کس حد تک کامیاب ہوا۔"

"جب بھی دوبارہ مغربی پاکستان آئی میں ضرور آؤں گی امید
ہے آپ لوگ مجھے یاد رکھیں گے۔"

"گل اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے
چاہے میں یہاں ہوں یا نہ ہوں۔"
"میں اس خلوص کو یاد رکھوں گی۔"
گل ماجد کی افسردگی کے خیال سے زیادہ دیر نہیں بیٹھی۔ چاہتے
ہوئے بھی کسی نے نہ کہا کہ وہ اپنی خیریت کا خط لکھے۔ اتنی مختصر سی
ملاقات میں جیسے یہ بات مناسب نہ ہو۔ ماجد سوچتا رہا شاید امی کہیں
ان کی موجودگی میں میرے لیے یہ بات کہنا اچھا نہیں۔ بہنیں سوچتی
رہیں شاید ماجد کہے مگر سب کے ذہن میں آنے کے باوجود یہ ذکر
کسی کی زبان پر نہ آیا اور گل ان سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے
دل میں شاید دوبارہ کبھی نہ مل سکنے کا تصور لیے واپس آگئی۔ کئی دفعہ
اس کا دل چاہا انہیں خط لکھے مگر کس کو؟ بہنوں میں سے کسی کا نام
بھی اسے ڈھنگ سے یاد نہ تھا اور ماجد کو خط لکھنے کا مقصد ہی کیا
ہو سکتا تھا۔ سچ پوچھو تو اس گھرانے سے اس کا رشتہ ہی کیا تھا اور
اور پھر اب اس پہ ایک عجب بے حسی سی طاری تھی۔ تڑپ کر کوئی
کام کرنے کی جی ہی نہیں چاہتا تھا نہ کسی سے ملنے کو نہ سیر و تفریح
کو۔ آثم اکثر اسے اس بات پر چھیڑا کرتا تھا اور اسی چھیڑ چھاڑ میں
ایک دن ان کی فیصلہ کن لڑائی ہو گئی تھی۔

وہ قرآن شریف رحل پر چھوڑ کر کسی ضروری کام سے اٹھ کر گئی تھی۔ واپس آئی تو دیکھا آتم سر پہ اس کا تہہ شدہ ایک دوپٹہ رکھے قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔

"یہ ڈھونگ،" گل نے کہا ـــــ آتم اسی انہماک سے پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے قرآن شریف بند کیا اور اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے قرآن شریف پڑھا ہے؟" گل نے پوچھا۔

"جی ہاں، کیا خوبصورت زبان ہے اللہ قسم ـــــ مگر آپ جو تشکیک کے معنی نہیں سمجھتیں اسے کیا سمجھیں گی۔"

"اور کیا تم عربی سمجھتے ہو؟" گل چڑ کر بولی۔

"میں زبان کو نہیں کہہ رہا معنوں کو کہہ رہا ہوں۔"

"رہنے دو، تم بڑے آئے دنیا بھر کے قابل۔ اللہ کو مانتے نہیں اور آئے ہیں کلام اللہ سمجھنے۔ تم جیسوں کا حشر ہوگا یہ لکھا ہے مُنَزَّلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۙ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ۔ تو اس کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی ضیافت ہے اور جہنم میں داخل کیا جاتا۔"

"جبھی تو میں کہتا ہوں آپ اسے نہیں سمجھ سکتیں۔ دنیا کے بڑے بڑے عالموں فاضلوں کا خیال ہے کہ مذہبی کتابوں میں جہنم کا ذکر صرف تمثیلی ہے۔ اقبال کی دوزخ کا حال نہیں پڑھا آپ نے جہاں صرف

برف ہی برف ہے! اور فرشتہ بتاتا ہے کہ دوزخی اپنے گناہوں کی آگ خود لے کر آئیں گے اور ملٹن کی جہنم ـــــ مگر آپ نے یہ چیزیں کہاں پڑھی ہوں گی، آپ تو پڑھتی ہیں عورتوں کے ناموں والے معاشرتی ناول" آئم نے میز پہ پڑی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اور تم نے دُنیا بھر کا علم کہاں سے حفظ کر رکھا ہے؟" گل نے قرآن شریف لپیٹ کر الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

"کتابوں سے، کتابیں پڑھا کیجئے، اچھی معقول کتابیں، یہ حور پریوں کی کہانیاں چھوڑیے ـــــ ان کے خوبصورت، بہادر نیک ہیرو آپ کا جینا حرام کر دیں گے۔"

"جینا تو تم نے حرام کر رکھا ہے میرا"

"میں بھی ایک طرح سے خوبصورت تو ہوں نا، ہاں بہادر اور نیک ویک نہیں ہوں۔"

"اللہ، تم کتنے بدتمیز ہو، سمجھ میں نہیں آتا میں تمہاری باتیں کیسے برداشت کرتی ہوں، کوئی اور ہوتا تو ـــــ"

"لگاتی ایک تھپّڑ ـــــ لیجئے پھر لگا لیجئے ـــــ سر دوستاں سلامت تو خنجر آزمائی" اس نے اپنا خوبصورت سر گل کے آگے جھکا دیا۔

"بس اب جاؤ میرے کمرے سے" گل نرم پڑ گئی

"ابھی تو اپنے کمرے سے ہر وقت نکالتی ہیں جب سچ مچ چلا جاؤں گا تو یاد کیا کریں گی ہاں۔"

"کہاں دفع ہو رہے ہو تم۔"

"میں پی آئی اے میں نوکری کر رہا ہوں، ساری دنیا کے چکر لگایا کروں گا مگر پٹنا گا نگ کبھی نہیں آؤں گا۔"

"کیوں؟" گل کا منہ دفعتاً اُتر گیا۔

"کیا کروں گا آکر، آپ کی گالیاں سُننے"

"سچ مچ جا رہے ہو؟"

"اور کیا جھوٹ موٹ ——— یہ دیکھئے۔" اس نے جیب سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر گل کے آگے کر دیا "انگریزی میں ہے۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"اتنی انگریزی تو مجھے آتی ہے۔" گل نے غصّے سے کہا۔

"تعجب ہے ——" وہ پھر شرارت سے ہنسا۔ "اچھا ایک بات بتائیں گی؟"

"نہیں۔"

"بالکل سنجیدہ ہوں سچ مچ ——— بہت دنوں سے میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کے والدین کہاں ہیں؟"

"دوسری دنیا میں۔" گل نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ ـــــ اچھا ـــــ اور بہن بھائی؟"

"کوئی بھی نہیں ہے۔"

"بھانجا بھتیجا؟"

"اونہہ ہونہہ۔"

"کوئی آل اولاد؟"

دفعتاً گل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ بالکل انجانے میں اس نے کس کے ایک تھپیڑ آثم کے گال پر لگایا اور پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"مجھے افسوس ہے میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔" آثم نے شرمندگی سے کہا۔ اور گل ہسٹیرک انداز میں چیخنے لگی۔

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے مذاق کرنے والے، تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو، تم خوبصورت ہوگے تو اپنے لیے، نکل جاؤ یہاں سے خبردار جو آئندہ مجھ سے بات کی۔ آئندہ آئندہ ـــــ" آثم خاموشی سے باہر چلا گیا۔

وہ بستر پہ گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پلیٹو گزرنے کے بعد چڑھائی پھر شروع ہو گئی تھی۔ گل جوں جوں
اس چڑھائی پر چڑھ رہی تھی توں توں اس کے دل میں یہ خیال زور پکڑتا
جا رہا تھا کہ وہ غلط راہ پر جا رہے ہیں۔ اگر اس جان لیوا بلندی کی
آخری بچھنگ پر پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ وہ جھیل سے میلوں پرے نکل
آئے ہیں تو کیا ہو گا۔ کیا اس وقت ان میں اتنا دم ہو گا کہ صحیح راستہ
تلاش کر سکیں۔ مگر جمال چپ چاپ چلا جا رہا تھا، آگے ہی آگے اس
یقین کے ساتھ کہ گل اس کے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ مڑ کر دیکھنے کی تکلیف
بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ گل ذرا ذرا دیر بعد اپنے سر پر بندھے ہوئے
سوئٹر پر اٹکی ہوئی برف کی سفید تتلیوں کو جھٹکتی اور آگے بڑھ جاتی۔
اسے پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ آتم کے جانے کے بعد بیمار

ہوئی تھی یا اس کے وہاں ہوتے ہوئے مگر اسے یہ خوب یاد تھا کہ اس لڑائی کے بعد سے آثم سے اس کی بات چیت بند تھی اور چلتے وقت بھی آثم اُس سے ملنے نہ آیا تھا۔ شرمندگی کے مارے یا غصے کے مارے گل نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی تھی کیونکہ تقریباً اسی زمانے میں اس پر ایک عجیب غریب بیماری کا حملہ ہوا تھا۔ یہ بیماری کیا تھی کہ بس اسے بے حس سا کر دیا تھا۔ جہاں بیٹھتی تھی بیٹھی رہتی تھی۔ ذہن سُن تھا، زبان سُن تھی، جسم سُن تھا۔ نہ سوچنے پر طبیعت آمادہ تھی، نہ بولنے پر، نہ چلنے پھرنے پر۔ جی چاہتا تھا کوئی ایسی چیز کھا کر سو رہے جو اسے دیکھنے اور سُننے کی قوت سے بھی محروم کر دے، بس وہ سوئی رہے اور کوئی اسے کسی بہانے نہ اُٹھائے۔

شمسی صاحب اسے ہسپتال لے گئے۔ علاج ہوتا رہا مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ بار بار دکھانے پر ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہے بس مصروف رکھیے۔ شمسی صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسے شخص کو کیسے مصروف رکھا جا سکتا ہے جس میں چلنے پھرنے کی سکت معلوم نہ ہوتی ہو، جو زرد ہوا جا رہا ہو جیسے گھل گھل کر مٹی ہو جائے گا۔ بظاہر کوئی تکلیف بھی نہیں تھی سوائے اس کے کہ سر بھاری رہتا تھا، بدن ٹوٹتا رہتا تھا اور

اور کسی بات کو جی نہیں چاہتا تھا۔ آثم جا چکا تھا، شمسی صاحب نے
جمال سے مدد چاہی۔ جمال اور وہ گھنٹوں گل کے پاس بیٹھ کر باتیں
کیا کرتے، اسے تفریح کے لیے لے جاتے، پکچرز دکھاتے اور یوں
ظاہر کرتے جیسے وہ ان کا ساتھ دے کر ان پر احسان کر رہی ہو مگر
ان باتوں سے گل کی تھکن اور بے حسی اور بڑھ جاتی۔ وہ خود حیران
تھی کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔

ایک دن جمال اس کے لیے انگریزی اور اُردو کتابوں کا ایک
بنڈل لایا، "گل جی یہ آپ کے لیے لایا ہوں، انہیں پڑھیے، ہو سکتا
ہے شروع میں یہ آپ کو بور لگیں یا ——— سمجھ میں نہ آئیں مگر
آپ انہیں پڑھیے ضرور، شروع سے اخیر تک۔ اگر آپ نے یہ
پہاڑ سر کر لیا تو آگے بیڑا پار ہے ——— بس آئندہ بھی آپ کو
پڑھنے کے لیے اچھی اچھی کتابیں دیا کروں گا۔"

گل کو آثم کی بات یاد آئی "کتابیں پڑھا کیجیے، اچھی معقول کتابیں،
یہ حور پریوں کی کہانیاں چھوڑیے، ان کے خوبصورت، بہادر
نیک ہیرو آپ کا جینا حرام کر دیں گے۔" گل نے بے دلی سے
بنڈل تھام لیا۔

"کیا تم نے ان کو بھی انٹیلکچوئیل بنانے کا ارادہ کر لیا ہے؟"

شمسی صاحب نے کہا۔

"جی ہاں، ہر شخص اپنی پارٹی بڑھانا چاہتا ہے۔" وہ ہنسا۔

"آثم نے مجھے بتایا تھا کہ انہیں پڑھنے کا شوق ہے تو میں نے سوچا کیوں نہ کچھ اپنے دفتر کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ بعد میں آپ سے ان کتابوں پر بات چیت ہو گی" وہ گل سے مخاطب ہوا "اور ہو سکتا ہے آئندہ آپ سے کتابوں پر تبصرہ کرنے کی درخواست کی جائے۔" انجانے میں گل مسکرائی۔

"بڑا لمبا پروگرام ہے تمہارا۔" شمسی صاحب ہنسے۔

"آپ کو پڑھنے کا شوق نہیں ہے؟"

"ہے۔ مگر زیادہ تر فوجی یا سیاسی چیزیں۔ فوج چھوٹ گئی مگر شوق ابھی باقی ہے، آجکل میں صدر ایوب اور بریگیڈیر گلزار کی کتاب پڑھ رہا ہوں، پاکستان ہندوستان کی لڑائی کے بارے میں تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

"جی ہاں میں ان پر تبصرہ بھی کر چکا ہوں۔"

"صدر کی کتاب پڑھ کر دل میں جو حوصلے جوان ہوتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب آثم کو پڑھنے کو دوں جسے ملک کے ہر کام، ہر شخص سے شکایت رہتی ہے۔ اسے یہ احساس ہو کہ ہم کن حالات

میں کہاں سے چلے تھے اور اس بیس سال میں کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ زندگی میں صرف منفی پہلوؤں کو دیکھتے رہنا ہی اچھا نہیں ہوتا۔"

"جی ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ایک عمر ایسی بھی ہوتی ہے جب انسان ہر چیز میں پرفیکشن ڈھونڈتا ہے، ہر چیز کو اپنی ذات سمیت مکمل دیکھنا چاہتا ہے۔"

"اور شاید یہ آپ لوگوں کی انٹیلکچوئیل ازم کا بھی تقاضہ ہے، صدر نے آپ لوگوں پر اچھی چوٹ کی ہے۔"

"جی ہاں، انٹیلکچوئیل اور ملا دونوں نشانہ بنے ہیں حالانکہ ہم لوگوں میں آپس میں بھی خاصی پرانی دشمنی ہے۔"

"دونوں کے فلسفے الگ ہیں مگر صدر نے جس چیز پر اعتراض کیا ہے وہ سوچ کا منفی انداز اور عمل کے بجائے جذبات میں کھوئے رہنا ہے۔"

انٹیلکچوئل لوگوں کا عملی زندگی میں حصہ ایک الگ بحث طلب مسئلہ ہے۔ سارتر نے الجزائر کی آزادی کے دوران کہا تھا ـــــ اُف یہ انٹیلکچوئل لوگ ـــــ ژاں پال سارتر ـــــ اور یہ اقوال۔ یعنی اب اس کے میاں شمسی صاحب تک ایسی باتیں کرنے لگے تو وہ کہاں جائے۔ کیا کبھی وہ ان باتوں کو سمجھنے کی اہل ہو سکے گی۔

کتابوں کا بنڈل بغل میں دبا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شمسی صاحب نے موضوع بدل دیا۔

"ارے بھئی، کوئی سیر تفریح کا پروگرام بناؤ، گل نے ابھی تک سوائے ڈھاکہ اور نارائن گنج کے کوئی جگہ نہیں دیکھی، کاکس بازار چلو۔"

"چلیے، مگر آتم کے بغیر مزا نہیں آئے گا، پھر گاڑی کون چلائے گا، آپ تو اتنی دور نہیں لے جائیں گے اور مجھے بھی کوئی خاص پریکٹس نہیں ہے۔"

"ارے میاں، چپے چپے پر ہوائی جہاز چل رہے ہیں، اسٹیمر ہیں ٹیکسیاں ہیں —— گاڑی کے بغیر بھی سیر ہو سکتی ہے۔"

"اچھا تو پروگرام بنائیے میں بھی کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔"

"بھئی پروگرام تمہارے ذمے، خرچ ہمارے ذمے۔" وہ ہنسے۔

سودا سستا تھا۔ جمال نے منظور تو کر لیا مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے اس پر فوری عمل نہ ہو سکا۔ جمال آنا جاتا رہا، وہ کتابیں پڑھتی رہی اور لوٹاتی رہی۔ اسے کتابوں کی بے پناہ گاہ اچھی لگنے لگی۔ اس کا دل چاہنے لگا وہ دنیا کا سارا اچھا ادب گھول کر پی جائے مگر یہ بات ناممکن تھی وہ صرف وہی کتابیں پڑھ سکتی تھی جو جمال اسے لاکر دیتا تھا کیونکہ ادب اور ادیبوں کے بارے میں اس کی معلومات محدود تھیں اور یہ

کتاب ابھی اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی مگر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ آہستہ آہستہ معلومات کے ساتھ ساتھ اس کی قابلیت اور زبانوں کی لغات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جمال اس سے کتابوں کے بارے میں سوال کرتا اور پھر خود ہی سگریٹ کے کشوں کے دوران اپنے ٹھہرے ٹھہرے سبے تکے انداز میں ان کے جوابات دیتا جو طویل ہوتے چلے جاتے اور گل کے ذہن سے سر سر نکلنے لگتے، پھر بھی اسے یہ اچھا لگتا کہ وہ بڑی کتابوں کے بارے میں اُونچی باتیں کرتی نہیں، سنتی تو ہے۔ اب جمال سے بات کرتے ہوئے اس پر وہ احساس کمتری بھی طاری نہیں ہوتا تھا جو پہلے ہو جایا کرتا تھا۔ شمسی صاحب کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں آہستہ آہستہ تبدیلی ہو رہی ہے اور یہ تبدیلی خوشگوار ہے۔ رفتہ رفتہ وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔

انہیں دنوں ایک رات یونہی ذرا ٹہلنے کو وہ باہر نکلی تو اس نے دیکھا اندھیرے میں پُر اسرار سایوں کے درمیان کوئی شخص برآمدے کے آخری کونے میں سیڑھی پر بیٹھا ہے۔ نزدیک ٹرانزسٹر رکھا تھا جس پر پنڈت روی شنکر بڑے ہی زور شور اور مہارت سے ستار بجا رہے تھے۔ گل کو خیال آیا کہ شاید آثم ہے جو چُپ چاپ یہاں آن کر بیٹھ گیا ہے۔

"آثم؟"

کوئی جواب نہیں، گُل کا خیال یقین میں بدلنے لگا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ پھر پکاری۔

"آثم۔!"

"ہوں۔"

"کیا کر رہے ہو؟"

"اوہو!" بڑے دکھ سے کہا گیا مگر یہ آثم نہیں جمال تھا تیسری اور چوتھی انگلی کے درمیان میں جلتا ہوا سگریٹ انگوٹھی کا سرخ نگینہ بنا چمک رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" گل نے اس دکھ بھری "اوہو" کی وجہ پوچھی۔

"کچھ نہیں سحر ٹوٹ گیا۔"

"کیسا سحر؟"

جمال نے ایک طویل کش لگایا۔ "لمحے کا سحر۔"

"یہ کیا مطلب ہے؟"

"کیا آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ ایک لمحہ آتا ہے جو آپ کی زندگی سے بالکل الگ کوئی چیز ہوتا ہے ——— جیسے ابھی اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود اپنے دل میں ڈوب

رہا ہوں، جیسے جیسے ایک لمحے کے لیے میں دُنیا کی ہر چیز سے بے نیاز اور بلند ہو گیا ہوں اور پھر ——— یکایک یہ سحر ٹوٹ گیا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں نے اتنا قیمتی لمحہ یوں برباد کر دیا"

گل نے کہا۔

"یہ لمحے ہمیشہ لمحے ہی رہتے ہیں، گھنٹے اور دن کبھی نہیں بنتے۔ زندگی میں چند بار ہی یہ موقع نصیب ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ لمحہ اس زندگی کا نہیں کسی اور زندگی کا حصّہ ہو، ماضی یا مستقبل کی کسی ایسی زندگی کا جس کا ہمیں ادراک نہیں یا پھر یہ ہماری موجودہ زندگی میں نروان کا ایک لمحہ ہو، کیا آپ کو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا ؟"

"کبھی نہیں ——— مگر میں نے کبھی یوں اندھیرے میں تنہا باہر بیٹھے رہنے کا تجربہ بھی نہیں کیا"

"یہ تجربے ضرور کرنے چاہئیں یہ زندگی کی بڑی قیمتی متاع ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں ایک دوست کے ساتھ سوات سے واپس آرہا تھا۔ سوات کی ہری بھری پہاڑیاں چھوڑ کر ہم میدان میں اُتر آئے تھے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے، ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ کٹے ہوئے کھیتوں میں دُور دُور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی جس میں کہیں کہیں کسی گاؤں کے چند مکان چُپ چاپ

کھڑے تھے۔ میرا دوست خاموشی سے کار چلا رہا تھا اور کار کے ریڈیو میں اس وقت بانسری کی ایک دھن بج رہی تھی۔ لمحہ بھر کو مجھے یوں لگا جیسے یہ منظر اس دُنیا کا نہیں کسی اور دنیا کا حصّہ ہو، جیسے ہماری گاڑی وقت کے دھارے میں بہتی ہوئی کہیں اور نکل گئی ہو، یکایک نغمہ ختم ہوا، اناونسر نے اعلان کیا اور ہم پھر اسی زمین اور اسی دُنیا میں تھے۔"

"بھئی یہ بات کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔" گل نے کہا۔

"ہر ایک کی بات ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتی بعض دفعہ خود اپنی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر ایک انسان کچھ سوچتا ہے، جب وہ کہتا ہے تو بات بدل جاتی ہے، دوسری طرف سُننے والا سُنتا کچھ ہے سمجھتا کچھ ہے، اس طرح بات بہت دُور چلی جاتی ہے ابلاغ کا مسئلہ شاعروں کے لیے ہی نہیں ہر ایک کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہے گل جی اگر سوچا جائے۔"

جانے کیا بک رہے ہو تم۔ گل نے دل میں سوچا اور جیسے جمال نے دل کی بات سن لی "کیا آپ میری بات بالکل نہیں سمجھتیں" اس نے یکایک پوچھا۔

"بالکل نہیں"

"ہائے افسوس۔"

"کوئی ایسی لڑکی تلاش کرنا جو تمہاری بات سمجھ سکے۔"

"بہت مشکل ہے، لڑکیاں ملتی ہیں، بڑی بڑی پڑھی لکھی علم فاضل مگر ایسی باتیں کوئی نہیں سمجھتی، نہ جانے لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔"

"لڑکیوں کو کچھ ہو گیا ہے یا تمہیں؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے، دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو ایک حالات میں ایک ہی سے تجربوں سے دوچار ہوتے ہیں مگر وہ ہر کہیں نہیں ملتے ——— بیٹھ جائیے نا۔"

گل اس کے نزدیک سیڑھی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کی لمبی لمبی اُنگلیاں زمین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جمال نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ گل نے جھٹکے سے ہاتھ اُٹھا کر اندھیرے میں اسے گھورنے کی ناکام کوشش کی اور پھر بگڑ کر کہا۔

جمال ہنسا۔ "میں نے تو اس ہاتھ کو صرف اس طرح چھوا تھا جیسے ابھی ابھی چنبیلی کے اس پھول کو توڑ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی بڑی میٹھی سی مہک آجاتی ہے جیسے ——— جیسے کوئی بھولا ہوا پیارا سا لمحہ۔"

"بڑے رومینٹک ہو رہے ہو، کیا کوئی یاد آرہا ہے۔"

"نہیں کوئی نہیں، یہ راتیں کم بخت بعض دفعہ اتنی حسین ہو جاتی ہیں کہ انسان خواہ مخواہ رومانٹک ہو جاتا ہے، خود اپنا آپ اسے پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے مگر پھر کٹھور دن نکل آتا ہے اور انسان پتھر بن جاتا ہے۔"

"تم شاعری کیوں نہیں کرتے؟"

"یہ شاعری ہی تو کر رہا ہوں۔" اس نے بھولپن سے کہا اور گل کو یہ بات بڑی پیاری لگی۔ وہ دیر تک ہنستی رہی اور جمال اسے یک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولی۔

"میرا مطلب ہے تم شعر کہتے کیوں نہیں؟"

"کیا فائدہ۔ جو کچھ انسان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ کبھی کہا جا سکتا ہے نہ لکھا جا سکتا ہے۔"

"تو یہ سب اتنے بڑے بڑے شاعر بھاڑ جھونکتے رہے ہیں؟"

"نہ جانے بے چارے کیا کہنا چاہتے تھے اور کیا کہا اور پھر دنیا نے اسے کیا سمجھا۔ انسان خاموش رہے یا بولے اپنی بات کسی کو سمجھا نہیں سکتا تھا تو بولنے سے فائدہ!"

"ایک تم ہی ہو کہ بولتے بھی ہو تو بات سمجھ میں نہیں آتی ورنہ سب ہی کہتے ہیں اور سب ہی سمجھتے ہیں۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے ــــــ شمسی صاحب کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ حساب کتاب دیکھ رہے ہیں، میرا دم اُلجھا تو میں باہر نکل آئی اور جب تمہیں بیٹھے دیکھا تو سمجھی کہ شاید آثم ہے۔"

"آثم؟" جمال نے ایک لمبا سا کش لگایا۔ "شاید آپ آثم سے ناراض تھیں؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"بدتمیزی کرتا تھا میرے ساتھ۔"

"شاید اس کی کوئی وجہ ہو۔"

"کیا؟"

"وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر آپ سے اُلجھنا چاہتا ہو۔"

"مگر کیوں؟"

"تاکہ ــــــ اسے آپ سے دُور رہنے اور جلد جلد نہ آنے کا بہانہ مل جائے۔"

"کیوں، میں کیا اسے کاٹتی تھی؟" گل چڑ کر بولی۔

"شاید۔" جمال نے سنجیدگی سے کہا اور ایک کے بعد ایک

سگریٹ کے کش یوں لینے شروع کر دیے جیسے اب کبھی نہ رکے گا۔
گل کو آتم کے کئی روپ یاد آئے جن میں سے ایک برستی بوندوں کی جھنکار
میں جوڑ کے پتوں والے درخت تلے افسردہ سا گیت سنا لے کا تھا۔
گل نے دھیرے سے کہا۔
”جمال مجھے کوئی بنگلہ گیت سناؤ۔“
جمال یوں سگریٹ کے کش لگا رہا جیسے اس نے گل کی بات
سنی ہی نہیں۔ پھر دفعتاً اس نے اپنا سگریٹ پاؤں تلے مسلا اور گانے
لگا۔

چار دانگ عالم میں اسے کس سے مثال دوں
کستوری کی طرح مہکتے ہوئے اس کے لمبے لمبے بال
جن کی سیاہی اور چمک کے آگے
بھنورا، کوئل، ناگن اور گھٹا ماند پڑ جائے
دنیا کو موہنے والی لٹیں جن کی مختلف صفتیں ہیں
مگر دنیا کو خاکستر بنانے کے لیے جن کا ایک بار ڈس لینا ہی
کافی ہے
بال میں اڑسے ہوئے پھول —— پروئے ہوئے موتی
برسات کے بادلوں میں جیسے چمکتے ہوئے تارے

سیدھی مانگ ——— جیسے تیز کٹاری جیسے کہکشاں
ابر میں جیسے خاموش چاند
گھنے جنگلوں میں جیسے پتلی پگڈنڈی
اور پھر سیاہی کے پہلو میں خون کی سُرخی
کسوٹی پر جیسے سونے کی لکیر
جمنا کے بیچ میں جیسے گنگا کی لہر
چاند سے مکھڑے پر بڑی بڑی آنکھیں
سُورج کو دیکھ کر جیسے تاریکی کا سینہ پھٹ گیا ہو
اندھیرے اُجالے کی اس فضا میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے بھی چھُپ کر بیٹھے ہوں۔ جمال کے گانے کے دوران دفعتہً گل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسی تجربے سے گزر رہی ہو جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے جمال نے کیا تھا۔ جیسے وہ خود اپنے وجود کے اندھیرے میں گھلتی جا رہی ہو اور لمحہ بھر کو زندگی کے ہر نشیب و فراز سے بلند ہو گئی ہو۔

ان کے شبستان کی کھڑکی کھٹ سے کھلی۔ اس میں سے روشنی کی ایک کرن بے تابی سے پھُوٹ کر نکلی اور اندھیرے کے سحر کو چیرتی ہوئی اس کے دل میں گڑ گئی۔

"گل!"

شمسی صاحب کی آواز آئی۔ گل اُٹھ کر اندر چلی گئی جمال وہیں بیٹھا گنگناتا رہا۔ لمبی لمبی گھاس میں ہوائی چپلوں میں پڑے ہوئے اس کے بڑے بڑے پاؤں اوس سے تر ہو گئے تھے۔

گل کو میٹرک میں پڑھی ہوئی ایک انگریزی نظم یاد آرہی تھی "بڑھے چلو" جس میں طوفان باد و باراں، بجلی کی چمک اور بادلوں کی کڑک میں آگے ہی آگے بڑھنے کی تلقین تھی۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس نظم کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس نے جمال کو یہ سب بتانا چاہا مگر تھکن اور ہانپنے کی وجہ سے آواز اس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئی اور وہ اسی طرح جمال کے نقشِ قدم پر چلتی رہی۔ پھر یکایک اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ "جمال!" وہ پکاری۔

جمال نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "کیا ہے؟"

"خدا کے لیے پہلے سڑک تلاش کرو ورنہ ہم بھٹک جائیں گے۔"

"ہاں اگر کہیں سڑک نظر آگئی تو ہم سڑک ہی سڑک چلیں گے، فی الحال یہ ہی سمجھ لو کہ ہم سڑک ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ پلٹا اور پھر آگے آگے چلنے لگا۔

چڑھائی اور جان لیوا چڑھائی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ آسمان پر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ کھانے کا تھیلا جواب گل کے پاس تھا وہ کبھی دائیں ہاتھ میں پکڑتی کبھی بائیں ہاتھ میں۔ دوسرے ہاتھ کو وہ اپنے سوئیٹر کے گریبان میں ڈال لیتی اس کے باوجود دونوں ہاتھ پاؤں یخ ہوئے جا رہے تھے اور منزل آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ کچھ اور آگے چلنے کے بعد صنوبر کے جھنڈ کچھ نزدیک آتے معلوم ہوئے اور پھر دور ایک جگہ خاصی بلندی پر سڑک کے کنارے پتھروں کی چنی ہوئی دیوار دکھائی دی۔ گل جو جبل کا تصور چھوڑ سڑک ہی کو منزل سمجھ بیٹھی تھی بڑی خوش ہوئی اور تیزی سے اس دیوار کی طرف بڑھی۔ اب تک وہ نامعلوم کہاں کہاں بھٹکتے رہے تھے اب چلنے کے لیے ایک سمت تو مل گئی تھی گو منزل اب بھی خاصی تکلیف دہ حد تک دور تھی ——— بارے پتھروں کی دیوار پھلانگ کر وہ سڑک پر آئے اور اطمینان کا سانس لیا۔ برف بدستور پڑ رہی تھی۔ گل نے ایک بار پھر گرتی ہوئی برف کے پس منظر میں

ہیں پہاڑیوں، بل کھاتی سڑک اور صنوبر کے جھنڈ کو دیکھا اور اس کے دل کو ایک عجیب سی روحانی مسرت ہوئی، کیسا عجیب سا سرور ہے قدرت کے ان حسین نظاروں ہیں۔ اگر انسان کا بس چلے تو ان ہی کا ہو رہے مگر اسے یاد آیا کہ پھول کی طرح نازک یہ پگڈنڈیاں سخت ظالم بھی ہیں۔ اگر کسی کو اپنے ٹھنڈے جنگل میں جکڑ لیں تو جان لیے بغیر نہیں چھوڑتیں۔ بھوک، پیاس اور تھکن سے نڈھال ان کی اس کیفیت میں اس خوبصورت بلا سے جلد سے جلد نجات پانا ضروری تھا۔ ہر موڑ کو دیکھ کر اُمید بندھتی تھی کہ جب وہاں پہنچ کر سامنے دیکھیں گے تو حد نظر تک جھیل پھیلی ہو گی، گرما گرم کیبن ہوں گے جہاں آگ جلتی ہو گی اور چوکیدار فوراً چائے بنا کر دینے کو تیار بیٹھا ہو گا مگر ہر موڑ کے بعد ایک اور موڑ تھا اور چڑھائی تھی اور برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں تھیں اور پھر ایک اور موڑ تھا۔ اور اس کے بعد ایک اور ـــــــ میلوں تک سوائے ان دونوں کے اور کوئی متنفس نہیں تھا۔ سناٹے میں برف پڑنے کی سرسراہٹ تھی یا پھسلتے ہوئے برف پہ ان کے قدموں کی چاپ۔ جوتوں کے بعد موزے اور موزوں کے بعد پاؤں تر ہو ہو کر یخ ہو گئے تھے۔ کچھ دیر سے گل کو اپنے سینے کے بائیں حصّے میں بھاری پن کا عجیب سا

احساس ہو رہا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ اسے تھکن اور متواتر چڑھائی کا سبب سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب منزلِ مقصود پر پہنچنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے اس لیے راہ کی دشواریوں کو بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جمال کے پیچھے چپ چاپ گھسٹ رہی تھی۔ یکایک برف اور بھی شدّت سے گرنے لگی اور ساتھ ہی ہوا بھی تیز ہو گئی۔ گل کو سردی قطعی محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ چل چل کے اس کا چہرہ اور بدن پسینے پسینے ہوا جا رہا تھا مگر پاؤں تھے کہ شل ہوئے جا رہے تھے۔ تیز قسم کی چڑھائی کے بعد جب ایک موڑ نظر آیا تو صنوبر کے درخت خاصے نزدیک آ گئے۔

"بس ایک موڑ کے بعد جھیل نظر آئے گی۔" جمال نے پر اُمید ہو کر کہا۔ اور گل نے سوچا دنیا میں کیسے ایک اتفاق سے دوسرے اتفاق کا سرا بندھا ہوتا ہے۔ اگر اس دن وہ جمال کے ساتھ کاکسس بازار نہ گئی ہوتی تو آج کا یہ روح فرسا دن بھی نہ آیا ہوتا۔

کاکسس بازار کی سیر کا پروگرام شمسی صاحب اور جمال کے اس معاہدے کے تحت بنا تھا کہ پروگرام جمال کا اور پیسے شمسی صاحب کے۔ ایک دن پہلے وہ ہوائی جہاز کی سیٹوں کے لیے پی۔ آئی۔ اے

کے دفتر گئے۔ دوسرے دن کے لیے صرف ایک سیٹ خالی تھی
اور اس کے بعد کئی دن تک کوئی سیٹ نہیں تھی۔ مغربی پاکستان سے
آنے والے مختلف وفدوں نے پہلے ہی سیٹیں بک کروائی تھیں
گل نے جمال سے کہا۔ "تم ہوائی جہاز سے چلے جاؤ ہم دونوں اومنی
بس سے آجائیں گے۔"

"پھر میں بھی بس ہی سے چلتا ہوں۔"
"کبھی ایسا نہ ہو وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے ریسٹ ہاؤس والے
ہمارے کمرے کسی اور کو دے دیں۔"
"یوں کرتے ہیں میں جہاز سے چلا جاتا ہوں تم دونوں بس
سے آجانا، مجھے خواہ مخواہ تکان ہو گی۔" شمسی صاحب نے کہا۔
"کل آپ (نینبول) آجائیے۔" بکنگ کرنے والے نے کہا۔ کئی
مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ نہیں آتے پانچ منٹ پہلے ہم وہ
سیٹیں انتظار کرنے والے لوگوں کو دے دیتے ہیں۔"
ایک ٹکٹ خرید کر وہ واپس لوٹے۔
دوسرے دن ناشتے کے بعد وہ پی آئی اے کے دفتر روانہ
ہوئے جہاں سے ان کی بس میں انہیں ائیرپورٹ جانا تھا۔ بس ابھی
تک نہیں پہنچی تھی اس لیے وہ تینوں ٹہلتے ہوئے سامنے بنے ہوئے

ہیلی پورٹ تک چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا میدان ہے جہاں سے
ہیلی کوپٹر اڑتے ہیں۔ نزدیک نیوی کے کپتان صاحب کا بنگلہ تھا
جن کے کمپاؤنڈ میں ناریل، کیلے اور انناس کے درختوں کی بھرمار تھی۔
انناس کے ڈیڑھ دو فٹ بلند پودوں کے سبز پتوں پہ گلابی رنگ کی
چھوٹ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ جمال ذرا آگے بڑھ گیا تو گل
نے آہستہ سے شمسی صاحب سے کہا "اگر جہاز میں ایک ہی سیٹ ہو
تو آپ جمال کو جانے دیں۔"

"کیوں؟" شمسی صاحب نے زور سے کہا "ارے بھئی بس
بڈھا آدمی، بیمار آدمی کہاں بسوں میں جاتا پھروں گا، تم دونوں مزے
سے آجانا دو تین گھنٹے کی تو بات ہی ہے۔ اور ابھی کیا پتہ سب ہی
کو جہاز میں جگہ مل جائے" گل یہ سوچ کر کہ جمال نے یہ جواب سن کر
ضرور اس کی بات کا اندازہ لگالیا ہوگا شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ وہ
اس کے ساتھ تنہا جانے سے گھبرا رہی تھی مگر اسے بتانا نہیں چاہتی
تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا کھاتے وہ
واپس ہوئے۔ ائرپورٹ جانے والی بس آچکی تھی۔ ایک سیٹ پہ
جمال دوسری سیٹ پر گل اور شمسی صاحب بیٹھ گئے۔ چند اور
جانے والے بھی آگئے۔ وہی سمندر کے کنارے کنارے لمبا سفر

ائرپورٹ تک کا ہوا۔ ایک بڑا سا ہیلی کوپٹر کھڑا تھا مگر فوکر فرینڈشپ جس میں انہیں جانا تھا ابھی نہیں آیا تھا۔ یہ باہر ہی کھڑے انتظار کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز آ گیا، مسافر اُترے اور پھر اسے اگلی منزل کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ اندر جا کر انہوں نے سیٹوں کے بارے میں معلومات کیں۔ کاؤنٹر پہ بیٹھے ہوئے شخص نے معذرت کی۔ تمام مسافر آ گئے تھے وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ جس وقت جہاز میں بیٹھنے کا اعلان ہوا ایک دفعہ پھر یہ بحث چھڑی کہ کون جائے اور کون نہ جائے۔ گل تنہا جہاز میں جانے کو بھی تیار تھی مگر شمسی صاحب نے فیصلہ کن انداز میں اپنا سامان اُٹھایا اور ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گئے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ دروازہ بند ہو گیا، سیڑھی ہٹا دی گئی اور تھوڑی دیر بعد جہاز ہوا میں پرواز کر گیا۔ گل جمال کے ساتھ کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ سینکڑوں مرتبہ غیر مردوں کے ساتھ وہ تنہا باتیں کرتی رہی تھی، رات برات سفر میں اور حضر میں تنہا ان کے ساتھ رہی تھی مگر آج یہ کیسی پریشانی تھی جو اسے لاحق تھی۔ وہ جمال سے نظریں چرا رہی تھی۔

"آؤ چلیں۔" آسمان سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"ایک پیالی چائے پئیں گے پہلے۔" جمال نے کہا۔ اس نے انکار کرنا چاہا مگر یہ سوچ کر کہ جمال اس کی کمزوری نہ بھانپ لے اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔ کینٹین میں ایک میز پر وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ جمال باتیں کرتا رہا اور وہ باہر دیکھتی رہی جیسے ہیلی کوپٹر کے اڑنے کے نظارے نے اسے محو کر رکھا ہو۔ چائے آئی اور گرما گرم سموسے۔ سموسہ بے خیالی میں منہ میں رکھا تو وہ اس قدر گرم تھا کہ منہ جل کر رہ گیا، گھبرا کر چائے پی تو وہ اس سے بھی زیادہ گرم تھی۔ جمال سگریٹ پیتے ہوئے اس کی بدحواسی دیکھتا رہا۔ مجبوراً چیزوں کے قدرے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔

"آپ نے اتنے دنوں میں مشرقی پاکستان کے لوگوں میں کیا بات محسوس کی؟" جمال نے پوچھا۔ گل ہڑبڑا گئی۔ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ پھر اپنے خیالات مجتمع کر کے وہ بولی "ایک عجیب سی بات بتاؤں یہاں کے جس مرد یا عورت کو دیکھتی ہوں وہ ٹیپیکل مشرقی پاکستانی معلوم ہوتا ہے حالانکہ شکلاً سب ہی جدا ہیں کہیں سانولے رنگ پر چمکتی ہوئی آنکھیں ہیں، کہیں تیز سیاہ رنگ پر پٹے اور داڑھی اور بجھتی ہوئی آنکھیں ہیں۔ یہی حال عورتوں کا ہے کوئی چھوٹے قد کی ہے کوئی لمبی، کوئی بالکل سادہ ہے کوئی فیشن ایبل

مگر ہر شخص کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دیس کا صحیح نمائندہ ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" جمال نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ "دیس یہاں ہر شخص کی آنکھوں سے اور چہرے سے جھانکتا ہے، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کو اپنی زمین سے اور اپنی زبان سے بے انتہا پیار ہے۔ زمین نے ان کی محبّت کے بدلے ہر شخص کو کچھ ایسا تحفہ دے دیا ہے جو ان کی شخصیت کا جزو بن گیا ہے جسے ان سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے معنوں میں اس کا دیس یہاں کے ہر شخص میں چھپا بیٹھا ہے ——"

واپسی میں جمال اس کے برابر ہی سیٹ پر بیٹھ گیا، گل کسماتی رہی مگر اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے گھر پر چھوڑ کر جمال دو بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ بس کو ڈھائی بجے جانا تھا۔ سوا دو بجے تک جب جمال نہیں آیا اور گل یہ سوچ کر اپنے کمرے سے باہر نکلی کہ اسے فون کرے یا نوکر بھیج کر بلوائے تو گیلری میں سے گزرتے ہوئے اسے ڈرائنگ روم میں کوئی شخص بیٹھا نظر آیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ وہاں جمال اپنے چکی کے پاٹ ایسے ہاتھوں پر اپنا چہرہ ٹکائے منے بچے کی طرح ٹکٹک ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ آج

سگریٹ بھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

"ارے چلنا نہیں ہے؟" وہ گھبرا کر بولی۔ جمال نے اسے دیکھا اس کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ گل کی نگاہیں ایک دم جھک گئیں۔

"گل جی! اگر میں آپ کے ساتھ نہ جاؤں تو؟" اس کا چہرہ نیچے تھا اور آنکھیں زمین کو تک رہی تھیں۔"

"یہ خوب رہی۔" گل کو اس کی گھبراہٹ دیکھ کر زبان مل گئی "اب میں اتنی دور اکیلی جاؤں، وہ بھی بس میں، اٹھو جلدی نخرے چھوڑو۔" گل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ جمال نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔ "تو پھر چلیے۔"

جس وقت وہ "سلور ایرو" کے بس اسٹینڈ پر پہنچے، ہرے رنگ کی خوبصورت منی سی بس جیک پر کھڑی تھی اور ٹائر بدلا جا رہا تھا۔ ایک طرف سخت دھوپ تھی، دوسری طرف سڑک کے کنارے کی نالی نے دماغ سڑا دیا۔ سیاہ رنگ کے پانی میں ہزاروں چیزیں جانے کب سے پڑی سڑ گل رہی تھیں۔ ایک طرف نالی سے نکلے گئے کوڑے کا پرانا ڈھیر تھا جو بسر کر اور بو دے اٹھا تھا۔ گل کی طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ اس نے جمال کی طرف دیکھا۔ وہ بس کے دوسری طرف تیز دھوپ میں ایسے مزے سے کھڑا تھا

جیسے کسی باغ میں کھڑا ہو۔ جب گل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تب
بس چلنے کو تیار ہوئی۔ اس وقت بڑی گرمی تھی مگر بس چلنے سے صورت
حالات غنیمت ہو گئی۔ اگلے اسٹینڈ پر بس کھڑی ہوئی تو جمال سے
درخواست کی گئی کہ وہ گل کے برابر بیٹھ جائے کیونکہ بس میں جگہ کم
تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسی سڑک میں سے ایک اور سڑک
پھوٹی جو دوسری طرف جا رہی تھی۔ جمال نے بتایا کہ یہ راستہ
کپتائی کو جاتا ہے جہاں سیر کے لیے وہ لوگ بھی ضرور جائیں گے۔
راستے میں جگہ جگہ "ہاٹ" لگے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف
لوگ ٹوکروں میں پھل، ترکاری، مرغیاں اور برتن لیے بیٹھے تھے،
نیچے ڈھلوان پر بکاؤ جانوروں کی بھیڑ تھی اور ہر طرف خرید و فروخت
زوروں پر ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں تو اتنی بھیڑ تھی کہ بس کو سڑک پر
سے گزرنے میں خاصی دقت پیش آتی تھی یہ پینٹھ قسم کے بازار یہاں
ہاٹ کہلاتے ہیں، جمال نے گل کو بتایا۔ گل نے بڑی حیرت سے دیکھا
کہ بتائی کے طرز کے بنے ہوئے قدِ آدم ٹوکرے خراماں خراماں سڑک
پہ چلے آ رہے ہیں۔

"یہ کیا بلا ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"غور سے دیکھئے ذرا۔" جمال نے ہنس کر کہا۔ گل نے بغور

دیکھا تو ٹوکروں کے نیچے دو ٹانگیں جھانک رہی تھیں۔ ذرا نزدیک آئے تو گل یہ دیکھ کر ہنس پڑی کہ اپنے قد کے برابر ٹوکروں کو آدمی اوڑھے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

"یہ اتنے لمبے اور پتلے ٹوکرے کس کام آتے ہیں؟" گل نے حیران ہو کر پوچھا۔ گل کے لیے یہ بالکل ہی نئی چیز تھی۔

"اناج رکھنے کے۔ چیزیں رکھنے سے پہلے انہیں اندر سے مٹی سے لیپ لیتے ہیں۔"

جوں جوں آگے بڑھتے گئے منظر حسین سے حسین تر ہوتا گیا، یہاں سبزہ چٹاگانگ سے بھی زیادہ تھا۔ کھیتوں میں مکانوں کے گرد بڑے بڑے جھنڈ تھے اور بعض جگہ ایسے گنجان کہ مکان سرے سے چھپ ہی گئے تھے۔ کھیتوں میں پودے لگے ہوئے تھے اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی سبزہ ہی سبزہ تھا۔ کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف ٹیلے شروع ہو گئے جو مختلف قسم کے درختوں اور بیلوں سے سرتاپا ڈھکے ہوئے تھے۔

"دل چاہتا ہے بس سے اتر کر ان جنگلوں میں کہیں کھو جائیں۔"

جمال نے سگریٹ کا ایک کش لگا کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا: "کھونے کے لیے جنگلوں کی شرط ضروری نہیں۔"

سڑک کے کنارے میلوں تک چوڑے پتوں اور گچھے کی شکل کے کاسنی پھولوں والے پودے چلے جا رہے تھے، کھیتوں میں ربڑ کے پودے ہوا سے جھوم رہے تھے، ٹیلوں پر زردی مائل سبز بانس کے تازہ پتے اور نازک ٹہنیاں دُہری ہوئی جاتی تھیں۔ ڈرائیور نے اچانک بس کا ریڈیو آن کر دیا اور اس میں سے بنگلہ نغموں کا جادو پھوٹ بہا۔ بنگلہ نغمے ہوا کی طرح اُڑتے اور پانی کی طرح بہتے ہوئے۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے سبزے میں زیادہ لطافت تھی اور گانے میں زیادہ رس تھا۔ کیا سُریلی آواز ہے کمبخت ان گانے والوں کی اور کیا رواں دواں الفاظ ہیں جیسے بہتے پانی پر کشتی ڈول رہی ہو۔ گل کو یکایک یوں محسوس ہوا جیسے سرمئی بادلوں اور سرمئی سڑک پر سبز درختوں میں گھری ہوئی اس سبز بس میں جیسے وہ دونوں اکیلے بیٹھے ہیں، صرف بہتے تیرتے نغمے ان کے ساتھ ہیں جن میں ان کے دلوں کے زیر و بم کی طرح کا اتار چڑھاؤ ہے۔ جمال کو بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس سرسبز سرزمین، کیلے اور ناریل کے جھنڈوں، بانس کی باشاؤں اور جگہ جگہ بھرے ہوئے پانی کے ساتھ ان نغموں کا کوئی خاص میل ہے۔ جتنی دیر ان گیتوں کا زیر و بم ہوا میں تیرتا منظر زیادہ حسین اور دلآویز نظر آتا اور اس خوبصورت

پس منظر میں یہ نغمے زیادہ سریلے اور میٹھے معلوم ہوتے۔ جمال کو بنگلہ گیت کبھی اتنے میٹھے اور بھلے نہ لگے تھے جتنے اس وقت لگ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس منظر نے اور ان گالوں نے سب پر سحر کر دیا ہے۔ باتوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں تھیں اور پیچھے کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے مولوی صاحب کی کھنکار اور تھوکنے کی آواز بھی تھوڑی دیر کے لیے رک گئی تھی۔

بس مڑتی تو جمال کا جسم اس سے بالکل لگ جاتا، اور کبھی کبھی سیٹ کے پیچھے رکھا ہوا اس کا ہاتھ اس کی گردن سے مس ہو جاتا۔ جمال سنبھل کر ہاتھ کھینچ لیتا، گل سیٹ پر ذرا آگے ہو جاتی —— مگر اتنی ہی دیر میں دونوں کو محسوس ہوتا جیسے دوسرے کے جسم کا وہ لمس ان سے چمٹا رہ گیا ہے۔ اس کو بھولنے کے لیے دونوں تندہی سے باہر دیکھنے لگتے۔ پانی کے گڑھوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے جال ڈالے کھڑے تھے۔ ایک جگہ دریا نے راستہ بدل لیا تھا۔ ساری سڑک بہہ گئی تھی صرف نارنجی رنگ کا پل کھڑا رہ گیا تھا جو چاروں طرف کے سبزے میں بڑا خوبصورتی سے دمک رہا تھا۔ سڑک دوسری طرف بنا دی گئی تھی۔ دریا کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے دفعتاً گاڑی روک دی۔ گل سمجھی شاید ڈرائیور

چاہتا ہے کہ وہ لوگ اُتر کر اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں مگر اُترنے پر معلوم
ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا بائیں طرف کے پچھلے دونوں پہیے پنکچر
تھے۔ بس کے کارکن پہیوں کی ادھیڑ بن میں لگ گئے اور سارے
مسافر اُتر کر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ بس جہاں خراب ہوئی تھی عین
اسی جگہ اینٹوں کا ایک بند بنا ہوا تھا جس پر لوہے کے تاروں
کا جال پڑا ہوا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے ہوئے نیچے پانی
تک چلے گئے۔ جمال ایک پتھر پر بیٹھ کر سگریٹ پینے میں مشغول
ہو گیا، گل آس پاس ٹہلتی رہی۔ پانی میں ایک مرد کھڑا مچھلیاں پکڑ
رہا تھا۔ گل اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ وہ ایک خاص انداز سے
جال کو پھیلا کر پانی پر پھینکتا اور ذرا دیر میں اسے سمیٹ کر مچھلیاں
نکال کر کندھے پر پڑے ہوئے تھیلے میں ڈال لیتا جہاں وہ تھوڑی
دیر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو جاتیں۔ اس نے پلٹ کر جمال کو دیکھا
اور مچھلیوں کی افراط کے بارے میں کچھ کہنا چاہا۔ مگر جمال کی نظروں
میں جانے کیا تھا کہ اس نے فوراً منہ پھیر لیا۔ وہ دوبارہ مچھلی پکڑنے
کے منظر کو بڑی توجہ سے دیکھنے لگی کہ کسی نے اس کے کان میں کہا۔ پانی
وچ ماچھی پیاسی رہے موہے سن سن آوت ہانسی ——— جمال
اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا اور مسافر دوبارہ بس میں سوار ہونے کے لیے

جا رہے تھے بس کے دونوں خراب پرزے نکال کر اس کی جگہ ایک فالتو پہیہ فٹ کر دیا گیا تھا اور بس چلنے کے قابل ہو گئی تھی۔

بس چل رہی تھی، بادلوں کی وجہ سے شام اور بھی تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ ریڈیو پر بنگلہ گیت اب بھی ہو رہے تھے اور فضا کا سحر کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ گل کا دل چاہا جھنڈوں میں چھپے ہوئے ان گھروں کو جا کر دیکھے ان میں کون لوگ ہیں، کیسے رہتے ہیں۔ ان کی ضروریات محدود ہوں گی تو ان پر پابندیاں بھی ضرور کم ہوں گی۔ معاشرہ ان سے بہت زیادہ توقعات بھی تو نہ رکھتا ہو گا۔ کھلی فضاؤں کے رہنے والے ان لوگوں کے دلوں میں وہ گھٹن تو ہرگز نہ ہو گی جو شہروں کے بجتے گھروں میں ہزاروں آسائشوں کے درمیان رہنے سے ہوتی ہے۔ تب ہی تو جو شخص جتنی آسائش میں رہتا ہے وہ گھر سے اتنی ہی دور رہنا چاہتا ہے۔ امریکہ کے لکھ پتی کروڑ پتی ساری دنیا کی خاک چھانتے پھرتے ہیں مگر ان چھوٹے چھوٹے گاؤں کے رہنے والے شاید کبھی کاکس بازار تک نہیں گئے ہوں گے جو یہاں سے صرف چالیس میل ہے۔ شاید انہیں کبھی وہاں جانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی ہو گی۔ ان کی مصروف زندگیوں

میں نہ ان فضول باتوں کے لیے وقت ہے نہ پیسہ۔" دھچ" کی آواز
کے ساتھ بس پھر رک گئی۔ گل کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مسافروں
نے بے چینی سے سوال کیے۔ معلوم ہوا ایک ٹائر اور پھٹ گیا ہے
اب نہ بس میں فالتو پہیے تھے نہ ٹائر ٹھیک ہونے کا امکان تھا۔
بس کا عملہ جوڑ توڑ کرنے میں لگ گیا، ممکن ہے کوئی صورت نکل
آئے۔ مسافر اُتر کر ادھر ادھر پھیل گئے۔ جمال بھی اتر گیا مگر
گل اندر ہی بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ اب کیا ہوگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا۔ ایک آدمی
کو پیسے دے کر شہر بھیج دیا گیا تھا مگر صبح سے پہلے اس کے واپس
آنے کی اُمید نہیں تھی۔ رات کو اس طرف کسی اور بس کے آنے کا
امکان بھی نہیں تھا۔ خدا کی طرف سے کوئی اچانک امداد آجائے
تو اور بات ہے ورنہ مسافروں کو رات یہیں گزارنی پڑے گی۔
یہ اطلاع دے کر ڈرائیور نزدیک کے گاؤں میں چلا گیا۔ تھوڑی
دیر بعد وہ واپس آیا اور جمال سے کہا۔

"آپ کے لیے ایک الگ باشا کا انتظام ہوگیا ہے باقی
سب لوگ ایک ہی جگہ پڑے رہیں گے۔"

پانی کے جوہڑ کے پاس کی پگڈنڈی پر چلتے، بانسوں اور ناریل کے

جھنڈوں سے نکلتے جمال اور گل اس گاؤں میں پہنچے جس کے وہ
مہمان تھے۔ ان کے پیچھے ننگے اور ادھ ڈھکے بچوں کا ایک قافلہ تھا
جو انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ گاؤں کی سانولی سلونی لڑکیاں
اور عورتیں بھی انہیں تجسّس سے دیکھ رہی تھیں صرف مرد تھے
جو دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنے کا بہانہ کر رہے تھے۔ ان ہی بستیوں کو
تو گل دیکھنے کو بے چین تھی مگر اب اچانک شب بسری کے لیے
ایک اجنبی جگہ آتے ہوئے اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے
تھے۔ ایک ہی ساری میں لپٹی ہوئی کامنی سی چھوٹی موٹی عورتیں
گھروں میں شام کا کھانا پکا رہی تھیں اور بچے گلیوں میں ننگے
پاؤں پھر رہے تھے۔ گائیں اور منی منی بکریاں جن کے پیٹ میں
بچے تھے اور جو خود بچیاں معلوم ہوتی تھیں گردنیں اٹھا اٹھا کر
نئے آنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ بہت کچھ مغربی پاکستان کے
گاؤں کا سا ماحول تھا۔ کیا غربت سب جگہ ایک ہی سی ہوتی ہے؟
گل نے سوچا۔ بانس کی کھپچیوں کی ایک باشا میں انہیں لے جایا گیا
جس کے مکیں گل کے اعزاز میں اپنے کسی عزیز کی باشا میں اٹھ
گئے تھے۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی اور شریف مہمانوں کو آرام
سے رکھنا ان کا فرض تھا۔ فرش پہ بڑی سی ایک میتل پاٹی بچھی ہوئی

تھی۔ ایک تخت تھا۔ کونے میں دو چار برتن رکھے تھے۔ بانس کی چوڑی
کھپچیوں کے درمیان کہیں آئینہ، کہیں کنگھی کہیں سوئی دھاگہ اٹکا ہوا
تھا۔ ایک کھڑکی بھی تھی جس میں سے درختوں کے جھنڈ اور سبز جوہڑ
نظر آ رہا تھا۔ اندھیرا ہر چیز پر مسلط ہو چکا تھا، بجلی چمک رہی تھی
اور آثار کہہ رہے تھے کہ بہت جلد بارش ہو گی۔

ناریل کے تیل میں تلی ہوئی مچھلی اور بھات انہیں کھانے کو
دیا گیا۔ میٹھے کے طور پر چینی ملا ہوا گلابی رنگ کا دہی تھا جو گل کو
بہت مزے دار لگا۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ جب
سے وہ بس سے اترے تھے ان دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک
عجیب غیر مرئی سا رشتہ قائم ہو گیا تھا جو برسوں ساتھ رہنے والے
میاں بیویوں میں ان لمبی شاموں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے جب وہ
تنہا ہوں مگر ان حالات میں جمال اور گل کے درمیان یہ خاموشی
نامناسب بھی تھی اور غیر فطری بھی۔ دونوں یہ بات محسوس کرنے
کے باوجود خود کو بات کرنے پر آمادہ کرنے سے مجبور پاتے تھے۔
اسی لیے کھانا ختم کرتے ہی جمال نے سگریٹ سلگایا اور کچھ کہے
سنے بغیر باہر چلا گیا۔ کھانے کے برتن جانے کے بعد گل نے
سونے کے بارے میں سوچا۔ کیا اب وہ یہ تکلف کرے کہ وہ

سیتل پاٹی پر سو جائے گی! مگر سیتل پاٹی کھردری تھی اور اس پر بچھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھر والوں نے صرف ایک کمبل لاکر تخت پر بچھا دیا تھا اور ایک چادر پائنتی رکھ دی تھی۔ گل نے کپڑے بدلے اپنا ایک جوڑا بطور تکیہ سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گئی۔

نامعلوم وہ کتنی دیر سوئی ہوگی جب بارش کی تڑاتڑ سے اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکیں اور چاروں طرف دیکھا۔ کوئی شخص کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔

"جمال ؟"

سایہ مڑا، آگے بڑھا اور خاموشی سے آن کر اس سے لپٹ گیا

گل نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی، ہٹنا چاہا، ہٹ نہ سکی، اسے ہٹانا چاہا مگر ہٹا نہ سکی۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور مینڈک عیاں آوازیں ٹرا رہے تھے، اور بانس کی کھپچی پر بیٹھا ایک جگنو ننھی سی چنگاری بنا سلگ رہا تھا۔

گل کے جوتے ہی نہیں شلوار کے پائنچے بھی اوپر تک گیلے ہو گئے تھے۔ جمال نے اسے پھر اپنی چھتری کے سائے میں لے لیا تھا اور وہ دو تھکے ہوئے جانوروں کی طرح اوپر چڑھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ موڑ آیا جس کے پیچھے جھیل پہلی ہونے کا مژدہ جمال نے سنایا تھا مگر یہ دیکھ کر گل کا دل ڈوب گیا کہ آگے جھیل نہیں وہی لامتناہی سڑک تھی۔ یہی نہیں بلکہ پہاڑ کی چوٹی پر جو ابھی ان سے بہت دور تھی، ان ہی جان لیوا صنوبروں کی قطار تھی جن کے درمیان سڑک کا شبہ ہو رہا تھا۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ ہر چڑھائی کے اختتام پہ جہاں موڑ تھا اور نئی چڑھائی شروع ہوتی تھی وہ رک کر چند منٹ دم لینے اور پھر ہمت کر کے آگے قدم

بڑھانے۔ حال کی دشوار گزاریوں سے بچنے کے لیے ذہن پھر ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔

کاکس بازار میں گل بس سے آتے ہی کئی دن کی بیمار لگ رہی تھی۔ شمسی صاحب کا سہارا لے کر وہ اندر گئی کمبل اوڑھ کر بستر پر لیٹی تو شام تک نہ اٹھی۔ شمسی صاحب کو بس کے خراب ہونے کی داستان جمال نے سنائی۔ کچھ دیر وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پھر ہوٹل والوں کے ساتھ سیر کرنے نکل گیا۔ شمسی صاحب چمکیلی ریت پر کرسی ڈالے پڑھتے رہے اور سامنے سمندر کا تماشہ دیکھتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ گل پریشانی کی وجہ سے رات کو سو نہیں سکی ہے اس لیے اس وقت سو رہی ہے۔ صبح سمندر دور تھا اور سفید تھا وہ اب سیاہی مائل ہوتا جا رہا تھا اور صبح کی پرسکون لہریں اس وقت تند و تیز موجیں بنی پھر کر آگے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ سویرے وہ ساحل پر جس علاقے میں اپنے نقش قدم چھوڑ کر آئے تھے وہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ کشتیاں جو رات کو مچھلیاں پکڑ کر صبح دم ساحل کی طرف لوٹی تھیں لہروں کے آگے ہی آگے بڑھنے کی وجہ سے ساحل تک پہنچ نہیں پا رہی تھیں۔ بصد دشواری وہ ایک ساحل سے آ کر لگی تھیں ورنہ سارے سمندر پر سیاہ رنگ کی چھوٹی بڑی کشتیوں

کے بیڑے پھیلے ہوئے تھے۔ صبح کا سکون غائب تھا۔ ساحل پر سیاحوں اور مچھیروں کا ہجوم تھا۔ سیاحوں کو سیر کرانے کے لیے رکشا والے اپنی چمکیلی رکشائیں لیے ان کو بہترین قسم کی برمی لنگیاں اور سگار خرید دا کر دینے کا لالچ دے رہے تھے۔

گل کی نیند لمبی ہوتے دیکھ کر شمسی صاحب نے جاکر اسے اُٹھایا۔ زبردستی کھانا کھلایا اور پھر ایک چمکتی دمکتی رکشا میں بٹھا کر اسے سیر کرانے لے گئے۔ گل ہر چیز کو عجب بے حسی سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی چیز اس کے لیے نئی نہ ہو یا اسے کسی سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔ سب سے پہلے رکشا والا انہیں چھوٹے سے بازار کی ایک چھوٹی سی دوکان میں لے گیا جس پر آرٹ اینڈ کرافٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہاں سیپ کی کاری گری سے بنائی ہوئی گڑیاں، چڑیاں، ہار اور بگوڈا وغیرہ تھے۔ چند ایک پینٹنگز بھی تھیں۔ ان میں گل کی دلچسپی نہ دیکھ کر رکشا والے نے فوراً دوسرا نسخہ آزمایا۔ وہ انہیں ایک برمی باشا میں لے گیا جہاں کئی برمی مرد اور عورتیں تھیں۔ میزوں پر رنگ برنگی لنگیاں رکھی تھیں۔ چند ایک رسی پر لٹکی ہوئی تھیں۔ سوا گز عرض اور اور سوا دو گز لمبائی کے ہاتھ سے بنائے ہوئے نیم سوتی اور نیم ریشمی بیڑے عورتیں قمیصوں کے لیے بڑے شوق سے خریدتی

تھیں۔ جب انہیں بھی گل نے ایک نظر دیکھ کر چھوڑ دیا اور شمسی صاحب
کے اصرار کے باوجود ایک ٹکڑا بھی نہ خریدا تو رکشا والے کو یقین
ہو گیا کہ ڈیزائن بیگم صاحبہ کو پسند نہیں آئے ورنہ یہ کیسے ممکن ہو
کہ عورت میاں کے اصرار کے باوجود کپڑے جیسی چیز کو نظر انداز
کر دے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بیگم صاحبہ "پنک پرل" کو زیادہ
اہمیت دیتی ہوں، چھوٹی موٹی چیزیں ان کی نظر میں جچتی ہی نہ ہو۔
اب کے وہ انہیں چھالیہ، ناریل اور کیلوں سے گھری ہوئی برمی
بستی میں لے گیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی کئی باشائیں بانسوں پر کھڑی
تھیں۔ زمین اور باشاؤں کے فرش کے درمیان جو جگہ تھی وہاں کرگھے
لگے ہوئے تھے اور برمی نقش کی دبلی پتلی زرد رنگ کی عورتیں اپنا
لنگیاں بنانے میں مصروف تھیں۔ چھوٹی سی ناک، کھنچی کھنچی آنکھیں،
بالوں کے چھوٹے چھوٹے بندھے ہوئے جوڑے۔ سفید نائلون
کے خوبصورت بلاؤز اور ساری کی جگہ اپنی بنائی ہوئی لنگیاں باندھ
تھیں۔ ان کے گھر اندھیرے تھے۔ سیڑھیاں کہیں تو اصلی تھیں
اور کہیں لکڑی کے تختوں کو اس طور کاٹا گیا تھا کہ سیڑھیاں سی
بن گئی تھیں۔ لمبی لمبی قمیصیں پہنے ہوئے موٹے موٹے زرد رنگ کے
بچے آنے والوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگوں نے

گھروں کے باہر میزوں پر کپڑے سجا رکھے تھے۔ رکشا والے نے برمی زبان میں ایک عورت سے موتی لاکر دکھانے کو کہا۔ خود اس عورت کے سفید بلاؤز پر سُرخ رنگ کے موتیوں کے بند سے ایسے لٹکے ہوئے تھے۔ عورت اندر گئی اور ڈبیوں میں روئی کے اندر رکھے ہوئے سفید اور گلابی موتی لاکر گل کو دکھائے۔ شمسی صاحب کا خیال تھا کہ موتی دیکھ کر وہ ضرور پگھلے گی مگر اس نے ان کو بھی قطعی نظر انداز کر دیا۔ شمسی صاحب کے اصرار پر کہ ضرور کچھ نہ کچھ لیے ورنہ عورتیں اور رکشا والا سخت نااُمید ہوگا اس نے صرف کندھوں پر ڈالنے والا لمبا سا برمی تھیلا خرید لیا۔

"خرید و فروخت" ختم کر کے یہ لوگ گھوڑا دیکھنے گئے کہ ان کی دید بھی کاکس بازار کی سیر کا لازمی جزو ہے۔ دُور دور تک چھوٹے بڑے گھوڑے ہریالی میں چھپے جھانک رہے تھے۔ چند لکڑی کے اور اندھیرے تھے۔ بعض پختہ اور روشن تھے۔ ایک بڑے اور مشہور گھوڑے کا راستہ بھی پکا اور صاف ستھرا تھا جس پر انہیں جُوتے اُتار کر چلنا پڑا۔ اس میں نیچی سی چھت کے ایک بڑے سے کمرے میں لوہے کے جنگلے کے اندر بدھ جی کی بے شمار مورتیاں بھری ہوئی تھیں۔ چند ایک سنگِ مرمر کی تھیں۔ باقی پیتل اور

مختلف دھاتوں کی مورتیوں کے آگے پھول رکھے ہوئے تھے۔
ایک جگہ پتھر کی بنی ہوئی ایک کنڈلی تھی جس کے کناروں پہ
پتھر کے دو سانپ بنے ہوئے تھے۔ پگوڈا کے صدر دروازے
کے باہر دو بانسوں پر چھت نما ایک چھوٹی سی چادر لگی ہوئی تھی۔
نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ڈوروں میں چھوٹی بڑی بے شمار
لکڑیاں پھنسی ہوئی ہیں۔ دور سے یہ چینی دیواری چلمنیں سی نظر
آرہی تھیں۔ جس طرح زیارتوں اور مزاروں پر لوگ رنگین دھجیاں
اور دھاگے باندھ جاتے ہیں یہاں منت ماننے والے یہ لکڑیاں
پھنسا جاتے ہیں اور مراد پوری ہونے پر اپنی لکڑی نکال لیتے اور
حسب حیثیت بدھ جی کی مورتی بنوا کر پگوڈے میں رکھوا دیتے
ہیں۔ مختلف مذاہب کی رسموں میں کتنی یکسانیت ہے۔ گل یہ
سوچ کر حیران ہو رہی تھی۔ پگوڈا کے ہرے بھرے خوبصورت
تصویری درختوں کے سائے میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ
واپس لوٹے۔ رکشا والا ان کا منتظر تھا۔ کاکس بازار کا بازار دکھانے
اور ٹاؤن گھمانے کے بعد وہ انہیں واپس سمندر کے کنارے چھوڑ
گیا۔ شمسی صاحب جمال کو جا کر دیکھنا چاہتے تھے مگر گل کا اصرار تھا
کہ وہ دونوں تنہا ساحل سمندر پہ چہل قدمی کریں۔ سمندر کے کنارے

سینکڑوں کی تعداد میں سُرخ رنگ کے کیکڑے پھیلے ہوئے تھے۔
ان سے بچ کر چلتے وہ خاصی دُور نکل گئے۔ شام ہو چلی تھی کپتائی
پروجیکٹ میں کام کرنے والے غیر ملکی انجینئروں کی تین لڑکیاں
سمندر سے تیر کر لوٹ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک موٹی گٹھی
ہوئی لڑکی کا انڈر ویر اتنا تنگ اور مختصر تھا کہ اس کے پہننے
کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ دوسری صاحبہ کا گریبان بطن تک
حد تک نیچا تھا۔ اس پر ان کے پھدک پھدک کر چلنے نے قیامت
ڈھا رکھی تھی۔ تیسری دُبلی پتلی خاتون صرف ایک مختصر سی تولیہ
میں لپٹی ہوئی تھیں۔ تینوں ننگے پاؤں تھیں اور گیلے بالوں کو
جھٹکتی، ہنستی باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ شمسی صاحب نے
دو ایک فقرے ان لڑکیوں پر کسے کہ شاید اسی بہانے گل کا موڈ
ٹھیک ہو جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اندھیرا بڑھ رہا
تھا۔ رات کو مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں اپنے سفر پر روانہ ہو
چکی تھیں اور آہستہ آہستہ دُور ہوتی جا رہی تھیں۔ شمسی صاحب
تھک کر ریت پر بیٹھ گئے۔ گل بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ بادلوں
نے آسمان کو یوں ڈھانپ رکھا تھا کہ سورج ذرا بھی نظر نہیں
آ رہا تھا۔ صرف پانی میں ایک جگہ روشنی کی جھلک سے اندازہ

ہو رہا تھا کہ یہ بادلوں میں چھپے ہوئے سورج کا عکس ہے۔ آسمان کے سفید اور سرمئی ٹکڑوں میں کہیں کہیں نارنجی جھلک تھی۔

"کاکس بازار کا غروب آفتاب مشہور ہے مگر آج تو بادلوں نے گڑبڑ کر دی، خیر کل دیکھیں گے۔" شمسی صاحب نے کہا۔

گل چپ رہی جیسے اسے کاکس بازار یا اس کے غروب آفتاب سے کوئی غرض نہ ہو۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ اوپر دیکھنے پر چاروں طرف سے نیچے اترتا آسمان صاف نظر آتا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہیں، اوپر ڈھکن ہے جو ان پہ بند ہونے والا ہے۔ گل کو تو یوں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی جیسے اس پہ سچ مچ آسمان کی وسعتیں تنگ ہو رہی ہوں۔ عمارتوں کی طرف سمندر کا پانی جانے سے روکنے کے لیے گڑے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے انگریز دل کے قبرستان میں لگے ہوئے کتبے اور صلیب کے نشان معلوم ہو رہے تھے۔

جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا یہ لکڑیاں ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھیں اور قبرستان کا تاثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سمندر کا پانی سیاہ پڑ گیا تھا، افق پر سمندر کی سطح ساحل سے بہت اونچی

معلوم ہونے لگی تھی اور کشتیاں دُور اُفق پر بہنے والے روشنی کے نقطوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں سمندری چٹانوں کی طرح گم سم بیٹھے تھے۔ ذرا دیر میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ سمندر کا پانی رات کی طرح سیاہ ہو چکا تھا اور آسمان پر بادلوں کی وجہ سے تاریکی بھرپور تھی۔ دفعتاً اندھیرے میں شمسی صاحب گل کے نزدیک سرک آئے اور اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔

"گل! کیا بات ہے تم بہت خاموش اور پریشان ہو؟"

ہلکی سی سسکی کی آواز سنائی دی۔ شمسی صاحب نے گل کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ گل کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اتنی کمزور دل نہ تھی، وقت پڑنے پر پہاڑوں سے ٹکرا بھی سکتی تھی مگر اس شخص کے بھرپور اعتماد کے آگے وہ بے بس اور مجبور تھی سسکنے لگی روتے روتے وہ بولی "شمسی مجھے چھوڑ دو ——— میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔"

"گل!" شمسی صاحب نے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آج نہیں، بہت دن پہلے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی کر کے غلطی کی ہے، میں تمہیں خوشی سے آزاد کر دوں گا اگر تمہیں یقین ہو کہ تم کسی اور کے

ساتھ زیادہ خوش رہ سکتی ہو۔"

اُنھوں نے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچا۔ گل کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک ڈبیہ کا ڈھکن بند کر دیا ہو۔

صبح تڑکے گل کی آنکھ کھُل گئی۔ رات بھر وہ سونے اور جاگنے کی عجیب سی درمیانی کیفیت میں گرفتار تھی۔ اس وقت اس کا ذہن تھکا ہوا اور بوجھل تھا جیسے سونے میں بھی اُلجھی گتھیاں سلجھاتا رہا ہو۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ برابر کے پلنگ پر شمسی صاحب چادر اور کمبل میں لپٹے اطمینان سے سو رہے تھے۔

گل نے کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکا۔ صبح کی ہلکی روشنی اور دُھند میں سمندر اور آسمان دونوں سفید نظر آ رہے تھے۔ رات کے ڈراؤنے ماحول کے برعکس اس وقت کیسا سناٹا اور سکون تھا۔ دُور سمندر پر روشنیاں تیر رہی تھیں جیسے کسی نے بہت سے چراغ جلا کر پانی پر چھوڑ دیے ہوں، یہ وہی رات والی کشتیاں

تھیں جو اب دھیرے دھیرے ساحل کی طرف لوٹ رہی تھیں۔
نظر کے ایک خاص فاصلے پر آکر ان روشنیوں کے دونوں طرف
سیاہ ہیولہ سا اُبھرتا اور ذرا دیر بعد کشتی کی شکل بن جاتی۔ گل نے
رات کے کپڑوں پر گاؤن پہنا اور باہر نکل گئی۔ اس وقت تک
کوئی نہ اُٹھا تھا۔ صرف چھت پر یونیورسٹی کے سیر کے لیے آئے
ہوئے طلبا میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کھڑے باتیں کر
رہے تھے نامعلوم کب سے۔ شاید وہ رات بھر باتیں کرتے
رہے ہوں اور انھیں یہ احساس ہی نہ ہوا ہو کہ اب صبح ہو گئی ہے۔
گل نے سوچا۔ جب آدمی خود کو محبت میں گرفتار سمجھتا ہے تو کیسی
انہونی باتیں خود بخود ہوتی چلی جاتی ہیں۔ خاموش سرد ساحل اور
خوشگوار ٹھنڈی ہوا نے گل کو بڑا سکون پہنچایا۔ وہ آگے چلتی چلی
گئی۔ ایک جگہ دو بڑی بڑی کشتیاں خشکی پہ کھڑی تھیں۔ پانی ان سے
بہت دور تھا مگر دوپہر کو جب لہریں دراتی ہوئی آگے بڑھیں
گی تو یہ کشتیاں خود بخود پانی میں چلی جائیں گی یہ احساس لیے اس
کشتی کے باسی چھوٹے سے کمرے میں بڑے مزے سے سو رہے
تھے۔ سامنے پھٹی ہوئی لنگی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور بانس پر چلتی
ہوئی لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ دوسری کشتی میں یہ کمرہ بھی نہیں تھا،

چھپرے تختے پر اپنی ناکافی لنگیاں اوڑھے سو رہے تھے جو اوس سے تر بتر تھیں۔ یہ کشتیاں مچھیروں کا گھر بھی تھیں۔ انسان کی اصل ضروریات کیا واقعی اتنی محدود ہیں۔ کیا وہ ان حالات میں بھی خوش رہ سکتا ہے سکون سے سو سکتا ہے۔ دولت اور خوشی واقعی لازم و ملزوم نہیں ہیں؟ وہ آگے بڑھتی رہی۔ ساحل کی طرف آنے والی ساری کشتیاں اب صاف دکھائی دینے لگی تھیں جو سمندر کے نظر آنے والے سارے کینوس پر تصویر کی طرح خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ گل ٹھنڈی ریت پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ چھوٹی چھوٹی سیپیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ خنک ہوا اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی اور اس کے بوجھل دل کو ایک سکون سا بخش رہی تھی۔ کچھ دیر بعد نگاہیں اٹھا کر اس نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ کوئی سایہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جمال تھا۔ جمال اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور بولا۔

"میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے تمہیں اس طرف آتے دیکھا تھا۔" گل خاموش رہی۔

"گل! اب جب کہ ہم اتنے نزدیک آ گئے ہیں تم مجھ سے اتنی دور کیوں بھاگ رہی ہو؟"

گل نے جمال سے نظریں نہیں ملائیں۔ وہ نیچے دیکھتی رہی اور پیر کے انگوٹھوں سے ریت پر گول گول نشان بناتی رہی۔ ذرا دیر بعد ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر ریت میں جذب ہونے لگے۔ جمال اور نزدیک کھسک آیا۔

"گل رو کیوں رہی ہو، تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ اپنی محبت پر نادم ہو؟"

"نہیں ——— میں ———" گل سسک کر بولی۔ "میں شمسی کے ساتھ نہیں رہ سکتی ——— مگر میں ان سے الگ بھی نہیں رہ سکتی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

"گل، آج کوئی کسی کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔"

"مجھے افسوس تو یہی ہے کہ میں ایسے شخص کے ساتھ وفا نہیں کر سکی جو فرشتہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے کل انہوں نے کیا کہا کہ اگر تم کسی اور کے ساتھ زیادہ خوش رہ سکو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔" جمال خاموشی سے سفید پر سکون سمندر کو تکتا رہا۔ گل کو اس کی خاموشی سے اُلجھن ہونے لگی۔

"تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگی؟"

"نہیں۔"

"کبھی سنا ہے کوئی میاں اپنی بیوی سے کہے میں تمہیں آزاد کر دوں گا تم جس سے چاہو شادی کر لو؟"

"جب آدمی بہت تنگ آ جاتا ہے تو یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے۔"

"کیا مطلب! وہ مجھ سے بہت تنگ آ گئے ہیں؟" گل حیران ہو کر بولی۔

"ہاں۔"

"تم نہیں جانتے وہ مجھ پر کتنا مرتے ہیں، وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ صرف میری خوشی کی خاطر انہوں نے یہ بات کہی ہے ورنہ!"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ تم سے کبھی یہ بات نہ کہتے۔ انسان بڑا خود غرض ہے گل، اور مرد بڑا ہی خود غرض۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں وہ تمہارے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"تمہاری باتیں نرالی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں میں ان کے چنگل میں ہوں اور تم کہتے ہو وہ میرے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"پہلے وہ تمہارے حسن کے چنگل میں پھنسے، بعد میں انہوں نے سوچا ساری عمر ایک نرس کرائے پر رکھنے سے بہتر ہے کہ نرس

کو بیوی بنا لیا جائے مگر اب انہیں پتہ چلا کہ اس طرح وہ نرس انہیں اور بھی مہنگی پڑی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ جتنا دے سکتی تھی اس سے زیادہ مانگتی تھی۔"

"جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب انہیں اپنی غلطی کا اندازہ ہوا۔ تمہارے سامنے قدم قدم پر وہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ جب سے تم نے ملنا ملانا، ناچنا اور کھیلنا چھوڑا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ تم ان باتوں سے اس لیے کنارہ کش ہوئی ہو کہ ان کے ساتھ باہر جانے تمہیں شرم آتی ہے اور یہ کہ وہ کسی بات میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ زیادہ پیدل چلتے ہوئے ڈرتے ہیں، وہ بس کے سفر سے گھبراتے ہیں اور پھر تمہارے ساتھ چلتے ہوئے لوگ ان کو تمہارا چچا سمجھ لیتے ہیں۔ جنہیں معلوم ہے وہ تم پر ترس کھاتے ہیں انہیں ہوس کا شکار اور جانے کیا کیا سمجھتے ہیں جب وہ ان جوان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن سے باتیں کرتے ہوئے تمہاری آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے تو ان کے دل میں رشک کی چنگاریاں سلگتی ہیں جو ان کی صحت کے لیے اچھی نہیں ہیں اور پھر وہ یہ دیکھتے

ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ بہت سوچ سمجھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تم سے ایسی بات کہیں۔ تم اسے ان کی قربانی سمجھو گی مگر تمہیں نہیں معلوم کہ اس بندھن سے نکل کر خود انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ وہ احساس کمتری جو انہیں ہمیں رہا ہے جس نے ان کی بوڑھی ہڈیوں کو گلا ڈالا ہے اس سے انہیں امن ملے گا اور وہ تھوڑے دن زیادہ سکون سے جی لیں گے۔"

"لوگ انہیں طعنے دیں گے کہ بیوی چھوڑ کر چلی گئی کیا اس کا انہیں غم نہیں ہوگا؟"

"ایک غم ظاہری ہوتا ہے، ایک باطنی ہوتا ہے۔ زندگی میں ہر لمحے چیزوں کو تولنا پڑتا ہے اور انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ہے انہوں نے نرس اور بیوی کو تولا۔ اب وہ ان طعنوں اور اپنے سکون کو پلڑے میں رکھیں گے۔ شاید طعنوں کے ظاہری غم سے باطنی سکون کا پلڑا بھاری ہو۔"

"نہیں، شمسی ان باتوں سے بلند ہیں، میں جانتی ہوں وہ ——— وہ"

"تم خواہ مخواہ ان کی قربانی کے خیال سے اپنے آپ کو گھلا رہی ہو۔ وہ بچہ نہیں ہیں۔ وہ اب تک اس سے بہت زیادہ

سمجھ چکے ہوں گے جتنا تم نے انہیں بتایا ہے اور تم دیکھ رہی ہو کہ انہوں نے سب کچھ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے قبول کر لیا ہے اور اسی لیے انہوں نے تم سے کہا ہے ——"

"مگر میں کیا کروں جمال —— مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میرا دل چاہتا ہے سمندر میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں، مجھے اور جینے کا ذرا بھی ارمان نہیں ہے۔"

"بڑی بزدل ہو، کس چیز سے ڈرتی ہو۔ سکھ اور دکھ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے، جب شمسی صاحب خود تمہیں چھوڑنے کو تیار ہیں تو ہماری مسرت میں کیا چیز حائل ہو سکتی ہے۔"

"مگر —— مگر ہم کیا کریں —— کہاں جائیں۔ ایک شہر میں تو ہم نہیں رہ سکتے کسی صورت بھی نہیں۔"

"جہاں تم کہو۔ میں خود ایک عرصے سے کسی پُرسکون جگہ جا کر رہنا چاہتا ہوں جہاں کچھ دن میں صرف لکھنے پڑھنے کا کام کروں۔ زندگی بڑی بوجھل سی ہو گئی ہے۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے —— کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جمال۔" گل پھر ہسٹیریک ہو گئی۔

"تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ دو ایک دن میں تمہاری طبیعت

سکون نہ آ جائے گی۔"

"تب تک کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں سکون سے سوچنا چاہتی ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی، کچھ دن بعد میں ایک پریس کانفرنس میں مغربی پاکستان جا رہا ہوں، اس عرصے میں تم تنہائی میں سکون سے سوچ سکتی ہو۔"

طالب علموں اور طالبات کا بڑا منڈ گشت کرتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا۔ وہ دونوں اُٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے واپس آ گئے۔

کاکس بازار سے واپسی پر یہ تجویز بھی کہ گل چند روز کے لیے شہناز کے پاس لاہور چلی جائے شمسی صاحب ہی کی تھی۔ جمال کا جانا فی الحال ملتوی ہو گیا تھا اس لیے گل نے بھی مناسب جانا کہ کچھ دن وہ ان دونوں سے الگ رہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان میں سے جس کے نزدیک رہی وہ ہی اسے اپنی طرف کھینچ لے گا اور اگر دونوں اس کے پاس رہے تو وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائے گی اور ہمیشہ ادھر لٹکی رہے گی۔

جہاز میں سوار ہوئی تو آج وہ پھر اکیلی تھی، مستقبل کی سپاٹ دیوار پھر اس کے سامنے تھی۔ نامعلوم مستقبل!! اس کا مستقبل جتنا دھندلا تھا اس دفعہ مطلع اتنا ہی صاف تھا۔ بتیس ہزار فٹ کی بلندی سے

نیچے کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہلکے، گہرے اور اس سے گہرے تین قسم کے بھورے رنگ کے چھوٹے بڑے ٹکڑے حد نگاہ تک بکھرے ہوئے تھے۔ شمال میں برف پوش پہاڑوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے نیچے دریائے گنگا کا میلوں چوڑا پاٹ نظر آ رہا تھا جو کہیں کہیں خشک تھا اس طرح اس میں پانی کے کئی دھارے بہہ رہے تھے۔ دریا کا پاٹ اتنی بلندی سے بھی حیرت انگیز حد تک چوڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اس میں پانی کی پتلی پتلی لہریں سی آن کر مل رہی تھیں۔ کبھی سڑک بھی دکھائی دے جاتی تھی جس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تو نہیں البتہ سبز دھبے ضرور نظر آ رہے تھے۔ گل کے دل میں عجیب و غریب خیالات کا ایک طوفان تھا۔ ہزاروں میل کی وسعت نگاہوں کے سامنے پھیلی پڑی تھی جس میں ساری زمین اور کھیتوں کے قطعات، ربن کی طرح بل کھاتی کالی سڑکیں، لہراتے دریا، افق کے برف پوش پہاڑ اس کے آگے آسمان اور پھر گہرے نیلے رنگ کا خلا۔ ولی اللہ آنکھیں بند کر کے پوری دنیا کی سیر شاید اسی طرح کر لیتے ہوں گے۔ ظاہری ہی نہیں وہ باطنی دنیا کی سیر بھی یوں ہی کر لیتے ہیں، مستقبل میں بھی جھانک لیتے ہیں یہاں آنکھیں

کھولے کھولے نظریں میلوں کا فاصلہ لمحہ بھر میں تو ضرور طے کر لیتی ہیں مگر اپنے وجود کے اندر ایک انچ بھی نہیں دیکھ پاتیں، نہ مستقبل کے چند لمحوں میں جھانک لینے کی طاقت ہے۔ انسان اپنی ساری ترقی کے باوجود ابھی تک کتنا مجبور ہے۔ گل سوچتی رہی۔

مکانوں کا ایک سفید جمگھٹا سا نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ جہاز گیا پر سے گزر رہا ہے اور دائیں طرف ایورسٹ کی چوٹی دکھائی دے رہی ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے لمبے سلسلے ہیں سب سے اونچی چوٹی صاف اور الگ دکھائی دے رہی تھی بالکل ویسی ہی جیسی تصویر میں نظر آتی ہے۔ پر وقار اور خوبصورت۔ چند سال پہلے تک وہ ناقابلِ تسخیر تھی مگر اب انسانی قدموں نے اسے بھی فتح کر لیا تھا۔ اتنی بلند و بالا چوٹی کو بھی۔ کاش انسان اپنے دل میں چھپے ہوئے کونوں کھدروں کا بھی سراغ لگا سکتا۔ گیا کا شہر بہت جلد چھپ گیا مگر برفانی سلسلے اور ایورسٹ کی نکوتی چوٹی بہت دیر تک ان کے ساتھ چلتی رہی۔

اتنی بلندی سے ایورسٹ کو دیکھتے ہوئے جہاں انسانی عظمت کا احساس جاگتا تھا وہاں اس کی گھمبیر چوٹیاں انسان کے فانی ہونے کا بھی برابر احساس دلاتی رہتی تھیں۔ اس جادو کے

قالین پر بیٹھے ہوئے لوگ اچھی ہیں اور اچھی نہیں ہیں مگر یہ چوٹیاں ہمیشہ سے ہیں، اور جانے کب تک رہیں گی۔

اب بھورے رنگوں کے بجائے زمین پر تین سبز رنگوں کا قبضہ تھا۔ ہلکا ہرا، ہرا اور سبز کاہی۔ پانی اور سڑکوں کی پتلی پتلی لکیریں الگ الگ نظر آرہی تھیں۔ کہیں کہیں پل بھی دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی نیلی نالی پر کسی بچے نے تنکا رکھ دیا ہو۔ گل اس منظر میں کھوئی ہوئی تھی کہ لکھنؤ پر سے گزرنے کا اعلان ہوا۔ گل کو سلام مچھلی شہری کا شعر یاد آیا۔ ع "اے نگاران چمن زار اودھ۔ لکھنو یاد تو آتا ہوگا"۔ اس سے پہلے ایسے موقعے پر اسے کبھی کوئی شعر یاد نہ آیا تھا۔ کیا وہ بدل گئی ہے۔ کیا جمال کی کتابوں نے اس پر واقعی کوئی اثر کیا ہے؟ کیا اس کے خیالوں میں کوئی بنیادی تبدیلی آگئی ہے۔ نہیں، کوئی نہیں۔ وہ اب بھی مقدر کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے! گل نے آنکھیں بند کر کے تکیے سے سر لگا دیا شہناز سے وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ کیا اسے یہی بتائے کہ وہ صرف چند دن گزارنے اس کے پاس آئی ہے یا اسے بتادے کہ وہ پھر ایک مشکل دور سے گزر رہی ہے جس میں وزن اس کے جسم پر نہیں ذہن پر ہے ——— مگر شہناز کے سامنے ہر بات

کہہ دینا اتنا آسان نہیں تھا۔ اپنے بچے کو ایک نظر بھی نہ دیکھ سکنے کا دُکھ وہ کیسے بھول سکتی ہے؟ اور یہ غم سراسر شہناز کا عطا کردہ تھا

ہلکی سی جھپکی کے بعد آنکھ کھلی تو وہ دہلی پر سے گزر رہے تھے۔ اتنی بلندی سے اس شہر کی وسعتیں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ـــــ ذرا دیر میں گزر گیا۔ نیچے بھورے اور سبز مستطیل و مربع رہ گئے۔ اب تھوڑی تھوڑی دیر بعد مکانوں کا ایک جمگھٹا سا آتا جس میں سے تین چار راستے پھوٹتے اور ذرا دُور کے دُوسرے جمگھٹے میں گم ہو جاتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے شہر تھے جو وسعت میں ایک محلے سے زیادہ نظر نہیں آتے تھے۔ لاہور پہنچنے سے پہلے جہاز نے آہستہ آہستہ نیچے اُترنا شروع کیا۔ اب زمین پر گہرے سبز اور کاسنی قطعات دکھائی دے رہے تھے۔ جہاز کے نیچے آنے پر سبز کاہی قطعے یوں معلوم ہونے لگے جیسے زمین پر سبز چقیں پھیلی ہوں۔ یہ پودوں کی قطاریں تھیں مگر یہ کاسنی رنگ گل کی سمجھ سے باہر تھا۔ شاید یہ پکے ہوئے کھیت ہوں گے اس نے سوچا۔ وہ نیچے دیکھتی رہی۔ جہاز برابر بلندی چھوڑ رہا تھا۔ سبز کاہی اور

کاسنی رنگ ہلکے ہوتے جا رہے تھے۔ اب سیم اور تھور سے ناکارہ ہوئی زمین بھی نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے اس پہ چونا بکھیر دیا ہو۔ بعض جگہ اس سفید سفوف کے درمیان بھی چھدرا چھدرا سبزہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے جہاز اتنا نیچے آ گیا کہ گاؤں صاف نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں کوئی چلتا ہوا آدمی کیڑا سا معلوم ہو رہا تھا۔ بھینسیں آنگنوں میں بسے ڈول کالے دھبے بنی بیٹھی تھیں۔ پھر منظر اور صاف ہوا۔ گل نے دیکھا کہ سبز کاہی قطعات تو واقعی ہرے بھرے کھیت تھے مگر کاسنی ٹکڑے! یہ وہ خالی کھیت تھے جنہیں ہل چلا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جن میں ابھی کچھ بویا نہیں گیا تھا۔ نظر کے اس دھوکے پر گل حیران رہ گئی۔ اچھی خاصی بھوری مٹی نے اوپر سے کیا رنگ دھار لیا تھا۔ زندگی میں دوسرے لوگ ہی نہیں خود اپنی نگاہیں، اپنا دل اپنے احساسات بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ اب اس کا کوئی کیا کرے۔!

ذرا دیر میں جہاز بالکل نیچے آ گیا ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ زمین پر ٹکا پھر کھڑا ہوا۔ اس کے بعد لمبا چکر کاٹتا ہوا اپنی جگہ آن کھڑا ہوا۔ گل لاہور کی سرزمین پہ اُتری تو اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پشاور سے یہاں آئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر تنہا کھڑے ہوئے اس کا دل کیسا دھڑک رہا تھا۔ آج وہ ایک بردبار، باوقار خاتون تھی جو بڑے اطمینان

سے چل کر استقبالیہ میں آئی۔ سامان آنے پر اسے اٹھوا کر باہر نکلی، ٹیکسی لی اور شہناز کے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

ابھی اس کی ٹیکسی بمشکل ائرپورٹ کے گیٹ سے نکلی تھی کہ دوسری طرف سے ایک کار اندر گھسی۔ دونوں کاریں اتنی آہستہ تھیں کہ گل اور آثم کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔

گل نے ٹیکسی رکوائی۔ آثم نے کار ایک طرف کھڑی کی اور اترا۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی گل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ گل کو ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر وہ بھی نیچے اتر آئی۔

"آپ یہاں؟" آثم نے حیران ہو کر گل سے پوچھا۔

"چند دن کے لیے آئی ہوں شہناز کے پاس ——— اور تم تو گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہو؟"

"نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔" آثم نے اسی پرانی ادا سے کہا۔

لڑکی نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ ایک دفعہ تو گل ڈر گئی۔

"ان کو پہچانیں آپ؟" آثم نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ گل نے اسے غور سے دیکھا مگر پہچاننے میں ناکام رہی۔

"جس دن آپ ڈھاکہ ائرپورٹ پر اتری ہیں ہم دو تیروں کا نشانہ

بنے تھے۔ ایک تو پہلے ہی کمان سے نکل چکا تھا دوسرے کو ہم نے خالی نہ جانے دیا" لڑکی نے اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

"تم تو پہچانتی ہوا نہیں؟" اب وہ لڑکی سے مخاطب ہوا" یہ ہی تو وہ پہلا تیر ہیں۔" لڑکی آثم کی باتوں کو کتنا سمجھ رہی تھی گل کو پتہ نہیں چلا، اس کے بے تحاشہ ہنسنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں بڑے اعلیٰ پائے کے لطیفے گردان رہی ہے یا شاید وہ آثم کی ہر بات اپنی سمجھ سے بالاتر جان کر ہنسنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کی اس قدر بے تحاشہ ہنسی پر آنے جانے والے چونک کر ادھر دیکھنے لگے تھے۔

"دوبارہ تمہاری ملاقات کب ہوئی؟" گل اب اس بہار سے بالوں والی لڑکی کو پہچان چکی تھی۔

"اسی جہاز میں جس میں مغربی پاکستان کے لیے روانہ ہوا تھا۔ یہ اپنے بھائی کے پاس سے واپس آ رہی تھیں۔ اتفاق سے جہاز میں ہماری سیٹیں دور تھیں ——— اور آپ کو معلوم ہے کہ ان دنوں میں ذرا پریشان سا تھا" لڑکی کچھ نہ سمجھ کر پھر ہنسنے لگی۔ گل آثم کی اپنی صفائی میں کہی ہوئی بات کو سمجھتے ہوئے بھی ٹال گئی۔

"مبارک ہو" گل نے دھیرے سے کہا۔ "شادی ہو گئی ہے یا

ہونے والی ہے؟ اور ہمیں اطلاع دینے میں کیا بُرائی تھی؟"

"شادی کو میں قطعی ایک پرائیویٹ معاملہ سمجھتا ہوں۔ شادی تو نہیں البتہ سول میرج ہو گئی ہے۔ ارادہ تھا کہ جب آپ کے پاس جاؤں گا تو اسے سرپرائز کے طور پر لے جاؤں گا۔"

"اس وقت کہاں جا رہے تھے؟"

"ذرا پنڈی تک، ایک ہفتے میں لوٹیں گے تب ظاہر ہے آپ کو ہمارے گھر آنا ہو گا۔"

"اچھا تو اب میں چلتی ہوں۔"

"اجی ہم سے بچ کر کہاں جاتی ہیں آپ" اس نے گھڑی دیکھی۔ "ابھی بہت وقت ہے، چلیے ہم خود آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔" انعم نے گل کا سامان ٹیکسی سے اتروا کر اپنی گاڑی میں رکھا بیوی کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ پھر گل کا ہاتھ تھام کر اپنی سیٹ کے برابر والی سیٹ پر بٹھایا اور کہا۔ "گل جی یہ کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" گل نے پوچھا۔

"گالوں کے گلاب زرد ہو گئے ہیں۔"

"ہشت! تمہاری بے وقوفی کی باتیں گئیں نہیں۔ تمیز سے بولنا کب سیکھو گے؟"

لڑکی نے پھر ایک ہسٹیرک قہقہہ لگایا۔

"جمال کے کیا حال چال ہیں؟" آثم نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ جمال کے ذکر پر یکایک گل سن ہو گئی۔ چند لمحے اور گزر جانے کے بعد اس نے یہی ظاہر کیا جیسے آثم کا سوال سنا ہی نہیں۔

"جمال خطرناک آدمی ہے۔" آثم نے تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے اچانک کہا۔

"کیسے؟" گل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس کی شخصیت میں ایک عجیب پُراسرار سی قوت ہے، تعمیری یا تخریبی یہ میں نہیں کہہ سکتا اس کے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے احساس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ پر چھا جائے گا۔" وہ بے چینی سے ہنسا۔ "گل جی کبھی ——— کبھی آپ کو بھی یہ احساس ہوا ہے؟"

"نہیں ———" گل نے آہستہ سے کہا۔ "دائیں طرف بھئی۔"

"اوہ سوری۔"

شمسی صاحب کی خیریت کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے موسم کا موازنہ کرتے وہ ہسپتال پہنچے۔ چوکیدار نے سامان اتارا اور وہ دونوں ہاتھ ہلاتے چلے گئے۔ چلتی گاڑی میں سے آثم نے کچھ

کہا جسے گل نہ سمجھ سکی۔ اس کے پیچھے اس کی بیوی کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوگی جو اس کی بیوی سمجھ نہ پائی ہوگی۔ اتنے سال بعد کیا آخر نے اپنی منزل پالی تھی ــــــ یا یہ بھی سراب تھا! زندگی کو بے حد سنجیدگی سے لینے والے اور اس پر لمبی لمبی فلسفیانہ بحثیں کرنے والے اپنی زندگی کے بعض اہم فیصلے اتنے ہلکے پن سے کیسے کر لیتے ہیں؟ مگر سوال یہ ہے سراب کو منزل سمجھ بیٹھنا زیادہ برا ہے یا ہر منزل کا سراب میں بدل جانے کا احساس ہوتے رہنا!

شہناز کے ہسپتال میں ہمیشہ کی سی گہما گہمی تھی۔ وہ اسی طرح مشغول و مصروف تھی۔ گھر میں اب تک وہی بڑھیا مائی تھی۔ ہاں ایک چیز کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک منی سی پیاری سی بچی کا۔ یہ بچی چودہ پندرہ سالہ کسی کنواری لڑکی کی تھی جو ماں بن کر، اپنا بوجھ ڈاکٹر شہناز کے حوالے کر کے واپس چلی گئی تھی اور شہناز نے اسے گود لے لیا تھا۔ اب عمر آ رہی تھی کہ انہیں بھی کسی سہارے کی تلاش ہو یا یہ وہ فطری ہوک تھی کہ انہیں بھی کوئی امی کہہ کر پکارے۔ جب انہیں کام میں دیر ہو تو یہ احساس ہو کہ گھر میں کوئی ان کا منتظر ہے اور جب گھر میں قدم رکھیں تو کوئی میٹھی، پیاری آواز ان کا استقبال کرے۔ بچی کو دیکھ کر گل کے دل میں ایک عجیب سی چبھن ہوئی۔ اگر شہناز اس

بچی کے بجائے اس کے لڑکے کو گود لے لیتیں تو آج وہ اسے دیکھ سکتی چھو سکتی، پیار کر سکتی۔ شہناز کے بیٹے کی حیثیت سے ہی اس کے لیے کھلونے لاتی، اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتی اور اسے کلیجے سے چمٹا لیتی۔ اے کاش ——— مگر شہناز موم ہوتے ہوئے بھی اس معاملے میں پتھر بن گئی تھیں اور اس کا بیٹا اس کے لیے ایک بھولے لبریے خواب کے سوا کچھ نہ تھا۔

شہناز نے اس کی اور شمسی صاحب کی خیریت پوچھی۔ وہ اس کے بڑے پن سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوئیں۔ اسی پرانے کمرے میں اس کے لیے پلنگ ڈلوا دیا اور وہ یوں شہناز کے گھر میں رہنے لگی۔ جیسے کوئی لڑکی اپنی بڑی بہن کے گھر آن کر رہے ——— جب تک وہ ہسپتال میں رہتیں گل کتابیں پڑھتی رہتی، سوچتی رہتی یا وارڈن کے چکر کاٹتی رہتی۔ شہناز واپس آتیں تو وہ باتیں کرتیں، چائے پیتیں۔ کبھی کبھی اکٹھی بازار یا پکچر دیکھنے چلی جاتیں۔ شہناز نے گل کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھا تھا جیسے اس طرف سے وہ مطمئن ہوں اور پوچھنے کو کچھ بھی نہ ہو۔

ایک دن اچانک جمال وہاں آ پہنچا۔ گل کا پتہ شمسی صاحب نے دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ گل تیار ہو تو وہ اسے ساتھ لیتا آئے۔ اس

کی کانفرنس ختم ہو گئی تھی اور دوسرے دن وہ واپس جانے والا تھا۔ آتم سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی وہ پنڈی سے ابھی واپس نہ آیا تھا۔ شہناز کسی کام سے اُٹھ کر گئیں تو اس نے کہا۔

"گل میں نے فیصلہ کر لیا ہے، اب واپس نہیں جاؤں گا اور تم بھی واپس نہیں جاؤ گی۔ ہم یہیں کہیں کسی خاموش گمنام جگہ رہ پڑیں گے۔ میں کتابیں لکھا کروں گا اور تم ——— تم میرے لیے ایک انسپریشن ———" شہناز کے آنے پر وہ چُپ ہو گیا۔

"گل میں پھر آؤں گا" چلتے ہوئے اس نے کہا۔ گل نے نظریں جھکا لیں۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کے لیے فیصلے کا لمحہ آ گیا تھا۔ مستقبل کی دیوار پر اپنی قسمت خود لکھنے کا لمحہ! رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تو چپکے سے شہناز اس کے کمرے میں آئیں اور بولیں۔

"گل! میں کئی دن سے تم سے ایک بات کہنے کا ارادہ کر رہی تھی۔"

"کہیئے۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بات یہ ہے کہ تمہارا بیٹا جو تھا نا ———"

"تھا۔" گل کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیا ہوا اسے؟"

"اسے پولیو ہو گیا تھا۔ وہ اچھی طرح چل نہیں سکتا۔ جس کنبے نے

اسے گود لیا ہے وہ اس کی پوری دیکھ بھال کر رہے ہیں مگر ظاہر ہے

گل وہ اتنی دیکھ بھال تو نہیں کر سکتے جتنی ماں کر سکتی ہے اور پھر"

ان کے لہجے میں دکھ کا عنصر تھا۔ لوگ اپنے بچوں میں ہر طرح کے

عیب برداشت کر لیتے ہیں مگر جب وہ گود لیتے ہیں تو چاہتے ہیں

کہ وہ بچہ ہر لحاظ سے بے مثال ہو۔" گل سُن بیٹھی تھی۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے گل کہ تم چاہو تو بچہ تمہیں مل سکتا

ہے۔ وہ لوگ اب اسے رکھنے پر اتنے مصر نہیں ہیں۔ تم اپنے میاں

سے کہہ سکتی ہو کہ محتاج دیکھ کر تم نے اسے پال لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ جیسے وہ کبھی

ہوئی ہی نہیں۔ اپنی آئندہ زندگی کی خاطر میں نے اپنے دل پر پتھر

رکھ لیا تھا۔ اب اس بچے کو اس حالت میں دیکھنا اور اپنے پاس

رکھنا کیا میرے لیے مناسب ہے؟"

"مجھے افسوس ہے گل کہ میں نے تم سے اس بچے کا ذکر کیا۔

مگر حالات بدل گئے تھے اس لیے مجھے کہنا پڑا۔ میرا خیال تھا تم اور

تمہارے میاں اور کوئی بچہ نہ ہونے کی وجہ سے شاید اسے لینا

پسند کریں ——— ویسے وہاں بھی اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

وہ رات گل نے کانٹوں پر بسر کی۔ صبح تک وہ دل میں تھوڑی

سی کمی آگئی۔ شمسی نہ سہی، جمال ضرور اس کی بات مان لے گا۔ یوں
نہیں تو وہ اسے اصل بات بتا دے گی۔ وہ تو بڑے دل کا، بڑے
جگرے کا آزاد منش آدمی ہے۔ وہ اس کی مجبوری سمجھ لے گا اور پھر
وہ اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرے گی جس میں وہ خود ہو گی
جمال ہو گا اور اس کا بیٹا۔ مگر ابھی وہ یہ بات جمال کو نہیں بتائے
گی۔ کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر جب وہ اس کی ہر بات مان لینے کے
موڈ میں ہو گا یہ ذکر چھیڑے گی۔ اگر اس نے حیل و حجت کی تو وہ اپنا
حق استعمال کرے گی، اپنی محبت کا واسطہ دے گی اور آخر میں اس سے
شادی نہ کرنے کی دھمکی بھی۔

دوسرے دن جب جمال ہسپتال پہنچا تو گل تر و تازہ اور شگفتہ
گہرے سبز کپڑوں میں کھڑی یوں مسکرا رہی تھی جیسے بہار کی بارش
میں نکھر انکھرا سا سرو کا پودا۔ اس نے زندگی کا ایک اور اہم فیصلہ
کر لیا تھا۔ شہناز سے اجازت لے کر جب بظاہر وہ مشرقی پاکستان
جانے کے لیے ہسپتال سے نکلے تو ان کا رخ کاغان کی طرف تھا۔
اور اب سیف الملوک جھیل کا یہ تفریحی سفر بھی ایک آزمائش بن
گیا تھا۔ جمال کے ساتھ زندگی کی کٹھنائیوں کا مقابلہ بہرحال کرنا پڑے
گا وہ دل کو سمجھا رہی تھی۔ اس کی چھاتی پر بے نام دباؤ اور سانس

کی دشواری بڑھ رہی تھی۔ جسم برداشت کی آخری حد کو پہنچ گیا تھا اب ایک قدم اُٹھانا بھی دشوار تھا۔ اس نے ہمت ہار دی۔

ہر موڑ پر سڑک سے آگے نکلا ہوا زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا تھا جہاں دو ایک درخت ہوتے تھے۔ گل انہیں میں سے ایک بڑے سے صنوبر کے سائے میں جاکر لیٹ گئی اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ جمال نے چھتری اپنے ہاتھ سے رکھی اور اس کی طرف بڑھا۔ ہوا کی یلغار سے چھتری برف پر پھسلی، جمال اسے پکڑنے لپکا۔ اس کا پاؤں پھسلا قریب تھا کہ وہ بھی گزدں گہرے کھڈوں میں گر کر لڑھکتا چلا جائے کہ اس نے ایک پتھر کو تھام لیا۔ چھتری برف پر پھسلتی، کھڈوں میں گرتی اُڑتی لمحہ بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جمال سر پکڑ کر گل کے پاس آبیٹھا۔ اب یکایک اسے احساس ہوا کہ اس نے چھتری کو پکڑنے کی کوشش میں کیسی زبردست حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ بال بھر آگے بڑھتا تو وہ کب کا گہرائیوں میں جا پڑا ہوتا، وہ یہ سوچ سوچ کر کانپ رہا تھا۔ ایسی حالت میں تنہا گل کیا کرتی۔ اپنی موت کے تصوّر پر جلد ہی قابو پا کر وہ گل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا رنگ زرد تھا جیسے وہ کسی نامعلوم بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہو۔ اس کا ہاتھ اپنے

دل پر تھا۔ جمال نے اسے خود سے لپٹا لیا اور اس کے ہونٹوں پر پیار کیا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے مل مل کے اس کے یخ ہاتھ گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اپنے بیٹے کی بات کب تک اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپائے رکھے۔ کیا جمال کے دل کو پگھلانے کا لمحہ آگیا تھا۔؟

"جمال" گل کی نحیف سی آواز آئی جیسے گرتی برف کی کرچوں نے اسے پکارا ہو" مجھ —— مجھ سے شادی کرو گے؟"

"پگلی! یہ وقت ان باتوں کا ہے"۔ جمال نے اس کے برف ایسے ہونٹوں پر ایک بار پھر ٹھنڈا یخ پیار کیا۔ یہ شخص بہت گہرا ہے۔ وہ کبھی اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی۔ گل کا دل چاہا اخروٹ کی طرح جمال کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالے اور دیکھے اس خول کے اندر کیا ہے۔ اس شخص کو جس کے ساتھ وہ چلی آئی تھی وہ ذرا سا بھی تو نہیں جانتی تھی۔ کل رات ہی تو ناران ریسٹ ہاؤس میں چاندنی کے چھاؤں تلے اس نے جلد ہی شادی کر لینے کی بات چھیڑی تھی تو سگریٹ کا لمبا کش لگاتے ہوئے جمال نے کس سکون سے کہا تھا۔

"یہاں بات غور طلب ہو جاتی ہے کیونکہ میں —— میں جو

ہوں شادی کے ڈھکوسلوں پر یقین نہیں رکھتا اور میرا خیال تھا کہ تم بھی ان باتوں سے بلند ہو چکی ہو۔"

"کیا مطلب تمہارا شادی پر یقین نہیں رکھتے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"بس! میرا خیال ہے معاشرتی نظام بنانے میں ایک ایسا وقت آیا کہ جب بات کسی طرح نہ بنی تو لوگوں نے شادی کا بندھن بنا ڈالا مگر میرا دل ان ظاہری بندھنوں کو گوارا نہیں کرتا، یہ ایسا ہی ہے کہ گرتی دیواروں کو تھوتھمبو کر کے کسی طرح روک دیا جائے۔"

"جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"بھئی میں یہ بتا رہا ہوں کہ یہ زبردستی کے بندھن ہیں۔ شروع میں بہت سے مرد تھے، بہت سی عورتیں تھیں۔ بچے پیدا ہوتے تھے۔ آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ زمین پر، کھانے پر، عورتوں پر۔ ان کو روکنے کے لیے قبیلے بنے، رسم و رواج بنے، قانون بنے، اسی میں شادی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جہاں اور بہت سے رسم و رواج کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے، وہاں یہ رواج بھی چل رہا ہے مگر میرے نزدیک یہ بالکل بے کار ہے۔ تمہیں بتاؤں

دُنیا میں کتنے شادی شدہ جوڑے ہیں جو صحیح معنوں میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایسے شادی شدہ لوگ بھی ہیں جن کے جذبات ایک دوسرے کے لیے قطعی طور پہ سرد ہیں بلکہ ایسے بھی ہیں جن کو ایک دوسرے سے پوری طرح نفرت ہے۔ میں ان کی زندگی کو دوغلے پن کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتا لوگ اسے شرافت کہتے ہیں۔ ایک رشتہ جس میں صرف الفاظ کے بندھن ہوں اور کچھ نہ ہو لوگ اس پہ فخر کرتے ہیں اور دوسرے رشتوں کو بے حیائی ٹھہراتے ہیں جب کہ میرے خیال میں اگر یہ بے غیرتی ہے تو وہ بھی کوئی ایسی قابلِ فخر چیز نہیں ہے۔"

"مگر محبت ہو تو شادی میں کیا برائی ہے؟"

"جسے ازدواجی رشتہ کہا جاتا ہے نا میرے نزدیک وہ ایک ربڑ ہے جس کو ایک طرف سے شوہر اور دوسری طرف سے بیوی تانے ہوئے ہے۔ دونوں کو ڈر ہے کہ اگر چھوڑا تو دوسرے کے ایسا طمانچہ پڑے گا کہ بلبلا اُٹھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ توازن قائم نہ رہ سکے اور بری طرح گر پڑے۔ اس ڈر سے دونوں بے چارے اس ربڑ کو آخیر دم تک تھامے رہتے ہیں۔ اس کو تھامے رکھنے کی ہی جسمانی اور ذہنی کوفت اتنی ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شکل سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ جی تو مچلتا ہے کہ ربڑ کو چھوڑا جائے اور تان کر چھوڑ

دیں اور تماشہ دیکھیں مگر شرافت پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ آخر ان میں سے ایک کوفت اور تھکن سے ہمیشہ کے لیے گر پڑتا ہے۔ دوسرے کو چوٹ تو اس وقت بھی پڑتی ہے، لڑکھڑاتا بھی ہے گرتا بھی ہے مگر ایسی صورت میں چھوڑنے والے کو الزام نہیں دیا جا سکتا کہ بیچارے نے جہاں تک ہو سکا نبھایا تو "

"جمال میں مذاق نہیں کر رہی سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا برسوں کی فکر اور مشاہدے کا نچوڑ ہے۔"

"مگر ...... مگر شادی کے بغیر مرد اور عورت کا رشتہ ہر مذہب میں گناہ ہے۔"

"ہاں مگر میں نے کسی مذہب کو ماننے کا دعوے بھی تو نہیں کیا۔ تم ان باتوں کو بیچ میں کیوں لاتی ہو۔ شمسی صاحب کے ساتھ تم کسی وجہ سے نہیں رہ سکتی تھیں۔ آثم سے تمہارے رشتے نے تمہیں ہولا دیا تھا۔ اس کی خوبصورتی کے ڈنک سے بچنے کے لیے تم نے میری بدصورتی میں پناہ لی اور میں آج بھی تمہیں اپنی پناہ میں رکھنے کو تیار ہوں۔"

گل نے سوچا تھا ایک دفعہ دھوکا کھا لینے کے بعد وہ اب

کبھی مرد کے قریب ہی نہیں آنے دے گی۔ اب وہ مردوں کو دھوکا دے گی، ان سے خوشامدیں کروائے گی اور ان پر اس طرح حکومت کرے گی جس طرح ہیلن اور قلو پیطرہ نے کی تھی۔ پرانی تاریخوں اور پرانی کہانیوں میں کتنی ہی ایسی عورتوں کا ذکر تھا جنہوں نے مردوں کو انگلیوں پر نچایا تھا، خون خرابے کروائے تھے، سلطنتیں بنوائی اور اجڑوائی تھیں۔ بڈھے مردوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر سواری کی تھی اور ان کے در سے لگائے تھے۔ اگر دوسری عورتیں ایسا کر سکتی ہیں تو وہ کیوں نہیں کر سکتی۔ وہ بھی ان کو جبین نیاز پر جھکائے گی، سجدے کروا کے ناک رگڑوائے گی اور خود غرور سے گردن تانے بیٹھی ان کا تماشہ دیکھے گی۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب ہو گئی تھی کہ جمال آگیا۔ ایک مرتبہ وہ پھر دھوکا کھا گئی۔ اس کی جبین پھر جھک گئی۔ وہ خود سجدہ ریز ہونے کو تیار ہو گئی۔ ہر ایسی عورت نے کسی نہ کسی آستان پر ضرور جبہ سائی کی ہو گی اور مات کھائی ہو گی۔ یہ عورت کی فطرت ہے یا اس کی تقدیر ہے! اس وقت گل خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا جمال کے دل کی سخت چٹان پگھلانے کے لیے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ اسے جمال کو شادی پر آمادہ کرنا ہی ہو گا اپنی خاطر نہیں تو اپنے بچے کی خاطر

——— مگر اس طوفان باد و برف میں جب کہ اس کی جان لبوں پر تھی اور سخت سے سخت دل انسان بھی رحم پر آمادہ ہو سکتا تھا اس شخص نے شادی کا وعدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ انٹیلیکچول ہے، وہ ان ڈھکوسلوں پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ کسی کا دل رکھنے کے لیے بھی اتنا نیچے نہیں گر سکتا۔

جمال نے گل کے جوتے اتار دیے، موزے اتار کر نچوڑے زور زور سے گل کے پاؤں ملنے لگا جو بالکل سفید پڑ چکے تھے جیسے خون کا دوران ان میں بند ہو چکا ہو۔ برف بدستور پڑ رہی تھی۔ ہوا کی وجہ سے درخت کا سایہ انہیں برف سے زیادہ محفوظ نہیں کر رہا تھا۔ جمال کا خیال تھا کہ پیروں کو گرم کر کے وہ اسے جلدی سے کچھ کھلانے کو دے تاکہ طاقت بحال ہو سکے مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ابھی وہ اس کے پاؤں سینے سے لگائے مل رہا تھا کہ گل نے آنکھیں موند لیں اور بے ہوش ہو گئی۔

اب جمال نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جھیل یہاں سے کتنی دور ہے اور وہاں کوئی آدمی بھی ہو گا یا نہیں۔ آگ ہو گی یا نہیں اور بہر صورت رات سے پہلے انہیں واپس ناران پہنچنا تھا کیونکہ شب بسری کے لیے ان کے پاس

کچھ بھی نہ تھا۔ اگر یہ برف یوں ہی پڑتی رہی اور راستہ ناقابلِ عبور ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اب وہ کیا کرے۔ گل کو کس طرح سنبھالے۔ دُور دُور تک کوئی آدمی نہیں آگے کیبن تک جا کے کسی کو بلائے یا واپس نیچے اُترے۔ آگے شاید راستہ کم ہو مگر چڑھائی اور برف کی زیادتی ہو گی اور پھر کسی کا مل جانا یقینی نہیں۔ نیچے جائے تو آدمی مل جائیں گے مگر کہاں جا کر، شاید ناران ہی جانا پڑے۔ جب تک گل کا کیا ہوگا۔ فیصلہ بہرحال کرنا تھا اور جلد۔ جمال نے گل کو موزے پہنائے۔ اپنا کوٹ اتار کر اوڑھایا اور اس کے پیروں پر لپیٹ دیا۔ پھر سڑک پر کھڑے ہو کر منہ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے چاروں طرف صدائیں دیں "کوئی ہے" "کوئی ہے" ہر آواز کے بعد پہاڑوں میں اس کی اپنی آواز گونجتی اور اس کے بعد برف کے گرنے کی سرسراہٹ کے سوا کوئی صدا نہ آتی۔

آخر گل کو یونہی چھوڑ کر اس نے تیزی سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ برفباری کے بعد چھوٹا راستہ اختیار کرنا ناممکن تھا اس لیے وہ سڑک سڑک روانہ ہوا۔ اپنا کوٹ اور مفلر وہ گل کے پاس چھوڑے جا رہا تھا اور چھتری اُڑ گئی تھی۔ ایک سوئٹر بس، ٹھنڈے یخ پیروں کے ساتھ گرتی برف میں سر جھکائے وہ تیزی سے نیچے اُتر رہا تھا۔

برف اس کے قدموں تلے آکر گھلتی اور مٹی میں مل کر اس کے جوتے کا نقش چھوڑتی چلی جاتی۔ وہ جتنا تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا گو یہ جانتا تھا کہ یہ تیزی اسے جلد تھکا دے گی۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سائبریا کے برفستانوں میں بھٹک رہا ہو۔ اس کے تھکے ہوئے ماؤف ذہن سے گرمی اور خوراک کا تصور ختم ہو چکا تھا جیسے دُنیا میں ان کا وجود ہی نہ ہو۔ صرف ٹھنڈی اور یخ موت کا تصور تھا۔ شاید بہت جلد وہ بھی تھکن اور ناطاقتی سے نڈھال ہو کر کسی درخت کے نیچے گر جائے گا۔ پھر برف کی یہ باریک ٹکڑیاں یکجا ہو کر اپنا سفید کفن دونوں پر پھیلا دیں گی اور وہ ہمیشہ کے لیے سوتے رہ جائیں گے۔ جب تک دُنیا والوں کو ان کے واپس نہ آنے کی فکر ہو گی اور وہ کوئی تدبیر کریں گے انہیں برف کا سفید بھوت نگل چکا ہو گا۔ جمال کو محسوس ہوا جیسے دُنیا میں برف سے زیادہ خوف ناک اور کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ جنگلی جانور، نہ حادثے، نہ زلزلے نہ طوفان۔ ان میں سے ہر ایک سے بچ نکلنے کا امکان ہے مگر اس برف کے چنگل سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کوئی بھی نہیں۔ اس وقت یہ بات کتنی عجیب تھی کہ صرف چند میل کے فاصلے پر

آبادی بھی تھی، خوراک بھی اور آگ بھی۔ مگر اس حالت میں
یہ راستہ اس کے لیے کسی طرح بیس میل سے کم نہ تھا۔

جس وقت پہاڑ پہ گل کی تلاش ہو رہی تھی وہ ناران میں صنوبی کے گھر کی اندھیری کوٹھری میں بدبودار بستر پہ پڑی تھی۔ صنوبی کی ماں اس کے منہ میں چمچہ چمچہ چائے ڈال کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صنوبی کا بھائی ریشم انگیٹھی جلا کر کمرے کو گرم کر رہا تھا اور باپ کے اس خیال پہ کہ برف میں پڑی ہوئی یہ لڑکی ان کی گمشدہ صنوبی نہ ہو دل ہی دل میں غور کر رہا تھا۔ اس کا باپ سیف الملوک جھیل کی کیبن کا چوکیدار تھا۔ موسم خراب دیکھ کر اس نے سوچا کہ اب سیاحوں کا اس طرف آنا مشکل ہے اور سردی بڑھ رہی ہے اس لیے اسے بھی نیچے چلا جانا چاہیے۔ بستی کو لوٹتے ہوئے اس نے ایک موڑ پہ گل کو پڑے دیکھا۔

سیدھے سادے ان پڑھ شخص نے سمجھا کہ اس کی دعائیں اور بیوی کی آہ وزاریاں کام آئیں اور شاید کسی معجزے کے ذریعہ ان کی بیٹی انہیں مل گئی۔ خوش قسمتی سے ان کا گھر نالان کا بازار ختم ہونے کے بعد اس راستے کے عین سامنے تھا جو جھیل کو جاتا ہے۔ یہ گھر بالکل الگ تھلگ تھا۔ گھر اور بازار کے درمیان ان کے اپنے مکئی کے کھیت کھڑے تھے اس لیے کسی نے گل کو لاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ لڑکی صنوبی ہے یا نہیں جب تک یہ بھید نہ کھل جائے انہوں نے کسی کو اس کی موجودگی سے آگاہ نہ کیا اور جب گل ہوش میں آئی تو اس نے خود اس بات پر اصرار کیا کہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ وہ صنوبی نہیں تھی مگر اس بہانے چند دن کے لیے اسے اس گھر میں ٹھکانہ مل گیا اور اسکے بے حد اصرار پر انہوں نے اس کا یہ مطالبہ بھی مان لیا کہ اسے گلگت سے جانے والے کسی قافلے کے ساتھ کر دیا جائے۔ ریشم کے باپ نے کچھ پیسے دے کر یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ صنوبی کی ماں نے اس کے سارے بالوں کی باریک مینڈھیاں گوندھیں۔ اسے لمبی چوڑی شیشے کے ٹکڑے جڑی پشواز پہننے کو دی، کانوں میں چاندی کے جھمکے پہنائے اور موٹے جوتے جو شکل میں تو سلیم شاہی سے ملتے جلتے تھے مگر اس قدر

سخت کہ ذرا ہی دیر میں گل کے پاؤں میں زخم ڈال دیے۔ گل صنوبی کے گھر والوں سے رخصت ہو کر ریشم کے ساتھ نکلی۔ جو اسے شام کے دھند لکے میں ناران سے چند میل پہلے ٹھہرے ہوئے قافلے والوں کے پاس لے جا رہا تھا۔ بابو سر جانے والی سڑک پر لکڑی کا چھوٹا سا پل چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس کے نیچے ایک تیز پرشور نالہ بہہ رہا تھا۔ ریشم نے بتایا کہ بچپن میں یہ نالہ ان کی زندگی کا ایک اہم حصّہ تھا۔ نالے کے کنارے کے یہ پتھر ان کا گھر گھاٹ اسکول اور کھیل کا میدان سب کچھ تھے۔ یہیں انھوں نے تیرنا اور مچھلیاں پکڑنا سیکھا۔ یہیں کے یخ پانی میں غوطے کھا کھا کر وہ اس قابل ہوئے کہ کنہار کو تیر کر پار کر سکیں۔ وہ اُردو صاف بول لیتا تھا مگر ٹھہر ٹھہر کر ذرا تکلف سے۔ گل کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ میٹرک پاس ہے۔ اس کا ابا چاہتا تھا کہ وہ جیپ ڈرائیور بن جائے۔ ان کی بستی کے نوجوانوں کا جیپ ڈرائیور بن جانا بڑی شان کی بات ہے۔ چار پہیوں پر پیٹرول سے لدی ہوئی جیپ لے کر بے تک کے بادشاہوں کی طرح سڑک پر گلگت تک دندناتے پھرنا، کبھی کبھی گھر والوں کو جیپ میں سیر کرانا اور بھر بھر مٹھی روپے لانا خوش قسمت لوگوں ہی کو نصیب ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود

اس نے ڈرائیور بننا پسند نہ کیا۔ گل نے وجہ پوچھی تو وہ دفعتہً افسردہ ہو گیا اور کہا کہ اسے اپاہجوں کی طرح پہیوں پر چلنا پسند نہیں نہ اسے اپنی بستی سے باہر نکل کر دُنیا دیکھنے کا شوق ہے۔ اس نے اپنے لیے بڑھئی کا پیشہ پسند کیا ہے اور وہ اس کام سے بہت خوش ہے۔ آزاد فضاؤں کے ایک خوش شکل نوجوان کی حیثیت سے وہ گل کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بلکہ افسردہ نظر آیا۔ اس کے لہجے میں متانت اور سوچ کی سی کیفیت تھی۔ تھوڑی دیر وہ خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ وہ جمال کا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اسی کا مفلر لپیٹے ہوئے تھا۔ یہ دونوں کپڑے گل کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے اس کے ساتھ آ گئے تھے اور اس نے دونوں چیزیں ریشم کو دے دی تھیں۔ دریا کے کنارے بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اس کے پار سبز فلک بوس چوٹیاں اور دُور برف پوش پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ دریا کا پانی اتنا شفاف تھا کہ تہہ میں پڑے ہوئے پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں صنوبروں کا پورا جھنڈ پہاڑ کی چوٹی پر سے یوں دریا تک چلا گیا تھا جیسے گاؤں کی لڑکیوں کا قافلہ دریا سے پانی لینے جا رہا ہو۔ گل کے نئے جوتے بے تماشا کاٹ رہے تھے۔ آخر اس نے قافلے والیوں کی طرح انہیں اُتار کر ہاتھ میں لے لیا اور

ننگے پاؤں چلنے لگی۔ اس کے سر سے باریک باریک لٹکتی چوٹیاں چلنے میں مضحکہ خیز طور پر ہل رہی تھیں۔ ریشم نے اسے دیکھا اور گل کو محسوس ہوا جیسے یکایک وہ پہلے سے بھی افسردہ ہو گیا ہو۔

"کیا تمہاری بہن صنوبی واقعی مجھ سے ملتی تھی؟" گل نے پوچھا۔

"ہاں کچھ کچھ۔" ریشم نے دریا کے پار پہاڑوں پر نظریں جمائے رکھیں۔

"پھر وہ کہاں چلی گئی؟" گل کئی دن سے یہ داستان سننے کی فکر میں تھی۔

"مر گئی۔"

"مر گئی؟" گل نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو تمہارے ماں باپ کو یہ خیال کیوں ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور انہیں مل جائے گی؟"

"انہیں نہیں معلوم کہ وہ مر گئی ہے۔ کسی کو بھی نہیں معلوم صرف مجھے معلوم ہے۔"

"اور تم نے انہیں بتایا بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" گل نے پوچھا۔

ریشم کے سُرخ سفید چہرے پر ایک سایہ سا دوڑا۔ اس کی آنکھیں دُھندلا گئیں۔ کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولا "کس کو بتاؤں، کوئی سمجھتا ہی نہیں، اتنے بڑے بڑے تجربے کار لوگ یہاں ہیں۔ باہر سے لوگ ان کا علاقہ دیکھنے آتے ہیں وہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ تین چار تلی ہوئی مچھلیوں کے بیس روپے دے دیتے ہیں، معمولی سوسی کے کرتوں کے دس روپیہ، آٹھ آنے کے کروشیا کے بٹوے اور تمہاری جیسی خانہ بدوشی ٹوپیوں کے پانچ پانچ روپے خوشی سے بخش دیتے ہیں اور یہاں کے لوگ پھولے نہیں سماتے۔ ان کو لوٹ لوٹ کر یہ امیر ہوتے جا رہے ہیں پکّے کوٹھے بنوا رہے ہیں۔ ان لوگوں سے زیادہ کما رہے ہیں جن کے پاس زمینیں ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ باہر سے آنے والے سیاح بے وقوف ہیں حالانکہ وہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ جتنا روپیہ لگاتے ہیں اس سے زیادہ وصول کرتے ہیں۔ وہ ان چھوٹی چیزوں کا نہیں کسی اور چیز کا سودا کرتے ہیں۔"

"کس کا؟" گل بغیر سوچے سمجھے بولی۔

"عزّت کا۔" ریشم نے کہا۔ "آپ نے تاریخ پڑھی ہو گی جب بھی باہر سے کوئی آتا ہے اس ملک کی عزّت ہی کا سودا کرتا ہے۔"

گل اس دُور دراز علاقے کے انٹیلکچویل کو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔
کیا اس بیماری کے جراثیم ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی۔
ریشم کہہ رہا تھا۔

"ان لوگوں کے لیے ریسٹ ہاؤس کے پاس کوآپریٹو اسٹور بنایا گیا ہے۔ جس میں جام، جیلی اور بسکٹوں کے ڈبے بھرے ہوئے ہیں۔ دو دو سو روپے کی مچھلی پکڑنے کی ڈور ہے۔ شرابیں وہ اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ یہاں یہ چیزیں دیکھ کر اچھا موسم اور برف دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ کر مزدوروں، چوکیداروں اور دوکانداروں سب کی عید ہو جاتی ہے۔ بچپن میں انہیں دیکھ کر میں اور صنوبی بھی بہت خوش ہوتے تھے۔" اس نے آخری جملہ بڑے دُکھ سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

"بس تم دو ہی بہن بھائی تھے۔" گل نے پوچھا۔

"ایک بھائی اور تھا، وہ مر گیا۔ ہمارے گھر کے پاس جو قبرستان ہے وہیں دفن ہے۔ ماں کے دل پر اس کے مرنے کا بھی بڑا اثر ہے اب بھی وہ چاہتی ہے کہ گھر سے کوئی نہ کوئی جا کر اس کے مُنّے کی خبر لیتا رہے۔ جس دن گھر سے کوئی نہ جائے ماں تڑپتی رہتی ہے جیسے بیچارے مُنّے کو دودھ نہ ملا ہو یا کہیں سے گر کر اس کے

مرجانے کا خطرہ ہو۔ رات کو لالٹین لے کر خود گھر سے نکل پڑتی ہے۔ سردیوں میں جب سارا قبرستان برف سے بھر جاتا ہے تب بھی ماں بڑی پریشان رہتی ہے۔ برف کے ڈھیر کو یوں دیکھتی ہے جیسے اس میں اس کا منا جیتا جاگتا کھو گیا ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا ہمارے قبروں پر لکڑی کے منقش چوکھٹے رکھے ہوتے ہیں۔ ہمارے منے کی قبر پر اتنا بڑا چوکھٹا ہے جیسے بیٹھنے کی پیڑھی۔ جب برف پگھل جاتی ہے اور یہ چوکھٹا نظر آنے لگتا ہے تو ماں ایسی خوش ہوتی ہے جیسے برف میں سے منا ہی نکل آیا ہو۔"

"بے چاری" گل نے دکھ سے کہا "ابھی کتنی دور اور جانا ہے؟"

"ابھی تو کافی چلنا ہے۔" ریشم نے کہا۔

"تو مجھے صنوبی کے بارے میں کچھ بتاؤ نا" گل نے کہا۔

ریشم کچھ دیر خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا پھر بولا "اصل میں اس کا نام گل صنوبر تھا ہم پیار میں اسے صنوبی کہتے تھے۔ ماں کبھی کبھی لاڈ میں اسے شہزادی کہا کرتی تھی کیونکہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ یہ بات طے تھی کہ نارا ان کی پوری بستی میں وہ سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ بچپن میں جب ہم اپنی اپنی مرغیاں دبائے، کیچڑ میں لت پت پاؤں لیے سیر کرنے آنے والوں کو دیکھنے سڑک کے کنارے آکھڑے

ہوتے تو وہ لوگ ہمیں دیکھ کر کہتے ارے ان کے رنگ تو دیکھو جیسے
انگریز، ان کے ہونٹ کتنے گلابی ہیں۔ پھر وہ دریا کے کنارے موٹے
موٹے پتھروں پہ کھڑا کر کے ہماری تصویریں لیتے اور دو آنے ہمارے
ہاتھ پر رکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ غیر ملکی لوگ ہمارے رنگ پر تعجب
نہ کرتے وہ ہمارے پھٹے کپڑوں اور ننگے پیروں کو حیرت سے دیکھتے۔
وہ ہماری تصویریں کھینچتے تو روپیہ دو روپیہ سے کم نہ دیتے اسی لیے وہ
ہمیں زیادہ اچھے لگتے۔ ہمیں وہ اس لیے بھی اچھے لگتے کہ ان کے
رنگ گورے ہوتے، وہ شوخ رنگوں کے کپڑے پہنتے۔ مرد بھی لال
ہرے اور پیلے کپڑوں میں ہوتے۔ عورتیں مردوں کی طرح پتلونیں
گرم سویٹر اور مفلر لپیٹے ہوتیں۔ یہ سب ہی کو خوب ہائے ہیلو کرتے۔ ہم بچوں
سے ہنس ہنس کر اشاروں میں باتیں کرتے۔ ان کا سامان بھی ان کے
کپڑوں کی طرح لال پیلا ہوتا۔ وہ ہمیں بڑا اچھا لگتا۔ خوبصورت رنگین
گول اور چوکور ڈبے۔ بڑے بڑے کریٹوں میں رنگ برنگی بوتلیں اور
بڑے بڑے لال ڈبوں میں بھرا ہوا برف۔ ہم چھپ چھپ کر گھنٹوں
ان کو دیکھا کرتے۔ کوئی مرد چوٹی کی سی پھندنے والی سرخ رنگ کی ٹوپی
اوڑھے ہوئے ہے کوئی چمڑے کی جیکٹ اور پتلون جس پہ چمڑے
کے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ کوئی اتنی سردی میں خالی سفید بنیان پہنے

پھر رہا ہے۔ کسی کی سنہری داڑھی ہے جیسے بھٹے کے بال۔ یہ سب
چیخ چیخ کر بولتے، کبھی گاتے کبھی ناچتے۔ آتے ہی سامان کمروں میں
پھینک پھانک باورچی خانے کے پاس والے کھانے کے کمرے میں
جاتے۔ کھاپی کر کوئی کیمرہ سنبھال پہاڑوں کے اوپر چڑھ جاتا کوئی کانٹا
لے دریا کی طرف چلا جاتا۔ کوئی چھڑی گھماتا بازار میں نکل جاتا۔ ٹوٹی پھوٹی
زبان میں لوگوں سے بات کرتا، دوکانوں میں رکھی ہوئی ٹنک کی دیوارو
کو حیرت سے دیکھنا اور ڈھیروں فضول چیزیں خرید لیتا۔ خانہ بدوشوں
کی موتی لگی ٹوپیاں اوڑھ کر لوگوں کو ہنساتا۔ انہیں باتوں کی وجہ سے ہم
بچے ان پہ دم دیتے تھے۔

کبھی کبھی ہم ان کے ساتھ جھیل پر بھی چلے جاتے سیاحوں کی ٹولی کے
ساتھ ہر دیکھی ہوئی جگہ کو دیکھنے میں بھی نیا مزہ آتا۔ وہ جس چیز کی
تعریف کرتے لگتا جیسے ہماری ہی تعریف ہو رہی ہو۔ اپنا سوئیٹر
یا تھرماس اٹھانے کے بدلے وہ ہمیں پیسے دیتے جن سے ہم کوآپریٹو
اسٹور کی چیزیں لے کر کھاتے اور ان کا مزہ سردیوں کے ٹھنڈے
اور سنسان دنوں کے لیے ذہن میں بچا کر رکھتے۔

تھوڑے سے دن بعد ہماری بستی میں قبرستان کے پیچھے ایک اسکول
کھل گیا۔ ہم سب لڑکے بہت بگڑے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ اسکول جیسی

لعنتیں پہاڑوں کے پار ہی ہوتی ہیں مگر نہ جانے کون سی جیب میں بیٹھ کر یہ آفت یہاں بھی آگئی۔ ہم سب اس سے بچنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے کہ ایک دن ابا نے مجھے پکڑا اور اسکول میں داخل کر دیا۔ میں نے صنوبی کو بھی داخل کرانے کی ضد کی مگر ابا نے کہا پاگل ہوا ہے لڑکیاں بھی کہیں اسکولوں میں پڑھتی ہیں۔ ان دنوں کتنا میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میں بھی لڑکی ہوتا۔ ہمارا ماسٹر دبلا پتلا سا ایک لڑکا تھا جو پتلون پہنتا تھا اور زبان سے زیادہ اخروٹ کی ننگی شاخ سے بات کرتا تھا۔ ہم لڑکوں کو وہ بہت برا لگتا تھا۔ ابھی مجھے اسکول جاتے تھوڑے سے ہی دن ہوئے تھے کہ میں نے سنا صنوبی پر بھی گھر سے نکلنے کی پابندی لگ رہی ہے۔ ماں ہر وقت اسے ٹوکتی، اب تو بڑی ہو گئی ہے یوں ماری ماری نہ پھرا کر، خبردار جو مجھ سے پوچھے بنا کہیں گئی۔ ماں ڈانٹ ڈپٹ کر اسے کروشیا کے بٹوے بننا سکھاتی۔ وہ روتی جاتی اور لہریے دھاگے انگلی پر لپیٹے کروشیا سے بنتی جاتی تو مجھے بڑی تسلی ہوتی۔ بس ہی کتابوں میں نہ پھنسا تھا شہزادی گل صنوبر کو بھی قید کر دیا گیا تھا۔ مجھے تو پھر بھی باہر نکلنے کی آزادی تھی۔ ذرا ماسٹر کی آنکھ بچی تو درخت پر چڑھ گئے یا جیب سے اخروٹ نکال کر نشانہ بازی کرنے لگے اور کچھ نہیں تو پانی پینے کے بہانے پہاڑی کے پیچھے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ پھر

جس دن ماسٹر کو کچھ کام ہوتا اور وہ کاغان یا بالاکوٹ چلا جاتا تو ہماری چھٹی ہو جاتی۔ اس دن ہم خوب اودھم مچاتے تھے۔" گل نے محسوس کیا کہ اپنے اسکول کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے، ریشم کے چہرے پر شگفتگی سی آگئی ہے جیسے وہ بھول گیا ہو کہ وہ گل کو صنوبی کی کہانی سنا رہا تھا۔ پھر شاید اسے یاد آگیا کہ اس کے افسانے کا مرکزی کردار وہ خود نہیں صنوبی ہے۔ اس نے کہا۔

"صنوبی کو صرف اتنی اجازت تھی کہ شام کو وہ میرے ساتھ جاکر ایندھن اکٹھا کر لائے اس لیے وہ اب ماں سے طرح طرح کے بہانے کر کے گھر سے باہر نکلتی۔ میں اسکول میں ہوتا تو بازار سے کوئی ضروری چیز لانے ماں خود ہی اسے بھیج دیتی ورنہ اسے کسی سہیلی کی یاد ستانے لگتی اور کچھ نہ ہوتا تو منے کی قبر پر جانے کو تیار ہو جاتی۔ اسے معلوم تھا کہ منے کی قبر ماں کی کمزوری ہے۔ ایک دن میں اسکول سے پانی پینے کی اجازت لے کر پیچھے کی پہاڑی سے نیچے اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صنوبی ایک امریکن کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کی طرف سے چلی آرہی ہے، امریکن خوب لمبا گورا چٹا تھا۔ سرمئی پتلون اور سرخ جرسی اور لمبے لمبے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ صنوبی ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہنستی باتیں کرتی چلی آرہی تھی۔ "ارے کہاں جا رہی ہے صنوبی؟"

میں نے پوچھا۔" باؤ کہہ رہا ہے مجھے سیف الملوک غار دکھا دے۔"

"تو میں دکھا دوں گا تو گھر جا" میں نے ڈانٹ کر کہا مجھے یقین تھا کہ اس آدمی کا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔"

" تو اسکول جا، نہیں تو پٹائی ہو گی۔" صنوبی بولی۔

" میں ماں سے تیری شکایت کر دوں گا" میں نے کہا۔

" واہ، میں گھر ہی تو جا رہی ہوں۔ اسے غار دکھا کر میں ادھر ہی سے گھر چلی جاؤں گی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہمارے گھر کا راستہ اُدھر سے بھی تھا۔

" اچھا جا مگر آدھے پیسے میرے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

" ماں سے نہیں کہے گا تو۔" صنوبی منہ چڑا کر آگے بڑھ گئی۔ مرد نے اس سے کچھ پوچھا پھر مجھے بلا کر ایک روپیہ دیا اور اسکول کی طرف اشارہ کیا۔ میں خوش خوش واپس آگیا۔ دیر ہو گئی تھی، ماسٹر کی ایک قمچی یقینی تھی مگر ایک روپے میں بری نہیں تھی آپ نے غار سیف الملوک تو دیکھا ہو گا؟" دفعتہً اس نے گل سے پوچھا۔

" ہاں دیکھا ہے " گل نے کہا۔

" ہم نے اپنے بڑوں سے سنا تھا کہ شہزادہ سیف الملوک نے کسی شہزادی کو لا کر تین دن اس غار میں رکھا تھا۔ مگر ہم نے کئی دفعہ کوشش

کی کہ اس کی لمبائی کا کھوج لگائیں مگر تھوڑی دور جا کر ہی گھپ اندھیرے سے ڈر کر چیخیں مارتے ہوئے بھاگ آتے تھے۔ بڑے بوڑھے ہمیں ڈراتے تھے کہ یہ جادو کا غار ہے اس کے اندر ہرگز نہ جانا۔ سیاحوں میں سے بھی کم ہی لوگ اس کو دیکھنے آتے ہیں۔ ہاں تو صنوبی اور امریکن کے پاس سے جب میں واپس آیا تو اخروٹ کی شاخ میرا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں ہتھیلیوں پر سپاٹے کھا کر میں اطمینان سے ٹاٹ پر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں پڑھنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا مار پیٹ نے اور پڑھائی سے نفرت دلا دی تھی۔ جب موقع ملتا کنکر اٹھا اٹھا کر ہم ایک دوسرے کے مارا کرتے۔

اسکول سے جب میں گھر پہنچا تو ماں پریشان تھی۔ صنوبی ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ ماں نے پوچھا کہ تو نے صنوبی کو کہیں نہیں دیکھا۔ باپ پاس بیٹھا تھا سوچا سچی بات بتائی تو خیر نہیں۔ میں بھی پٹوں گا اور صنوبی بھی۔ چاندی کے ایک روپے نے بھی جیب پر کچھ بوجھ ڈالا۔ میں نے کہا "مجھے کیا خبر میں تو اسکول گیا تھا۔" پھر خود کو مجرم محسوس کرتے ہوئے میں نے بات بنائی "شاید داودی کی طرف گئی ہو میں نے دو تین لڑکیاں ادھر جاتی دیکھی تھیں" ماں کچھ مطمئن ہوگئی۔ داودی صنوبی کی پکی سہیلی تھی اور وہ اکثر اس کے ہاں جایا کرتی تھی۔ پھر بھی دکھانے کو ناراض ہو کر

بولی" مجھ سے تو کہہ کر گئی ننھی منے کے پاس جارہی ہوں، جا جا کے اسے بُلا لا۔"

دادو دی کے گھر جانے کے بجائے میں پہلے غار کی طرف گیا۔ وہ سنسان تھا۔ وہاں سے بازار گیا اور احتیاطاً دادو دی کے گھر کا چکر بھی لگا لیا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ ضرور اس آدمی کے ساتھ جھیل کی سیر کو چلی گئی ہے تو جھیل جا کر واپس آنا ایک دو گھنٹے کی بات نہیں سارا دن کا کھیل ہے واپس آئے گی تو ابا بھس بھر دے گا۔ گھر جا کر میں نے ماں کو بتا دیا کہ صنو بی دادو دی کے گھر نہیں تھی مگر غار والی بات پھر بھی نہ بتائی۔ اس وقت ابا کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ماں نے مجھ سے کہا کہ میں ریسٹ ہاؤس اور ہوٹل کا چکر لگاؤں اور اسے ڈھونڈ کر لاؤں مگر خواہ مخواہ اس کے کھونے کا ڈھنڈورہ نہ پیٹتا پھروں۔ میں نے ہر جگہ تلاش کیا مگر نہ صنو بی ملی نہ وہ آدمی کہیں نظر آیا جس کے ساتھ وہ دکھائی دی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ جھیل پر چلی گئی ہے اور شام سے پہلے کسی صورت نہیں لوٹ سکتی۔

شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی مگر صنو بی نہ آئی۔ ابا بپھرے ہوئے شیر کی طرح ماں پر برستا رہا اور ماں روتی رہی۔ اتنی سی بستی میں یہ کوئی چھپنے والی بات نہ تھی۔ دوسرے دن خبر سارے میں پھیل

گئی۔ سب نے اپنے اپنے طور پر ڈھونڈا۔ پولیس نے بھی تلاش کیا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ کاغان کی وادی میں سے چپ چپاتے نکل جانا آسان نہیں ہے۔ یہ تو سرنگ کی طرح ہے جس کا ایک دہانہ بالاکوٹ ہے دوسرا بابو سر۔ بستی کے ایک ایک آدمی کو پتہ ہوتا ہے کہ کون آدمی کب آیا اور کب گیا۔ جب کئی دن تک اس کا پتہ نہ چلا تو فیصلہ کر لیا گیا کہ وہ دریا میں ڈوب گئی ہے اور بہتی بہتی کہیں دور چلی گئی ہے چند دن میں کہیں نہ کہیں سے اس کی نعش ملنے کی خبر آ جائے گی مگر ماں کا کہنا تھا کہ اس کی خوبصورت شہزادی سی بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔ کوئی شخص اسے ملازم لڑکے کا بھیس بدلوا کر نکال لے گیا ہے۔ ایک کے سوا کسی نے ماں کے اس خیال کو نہیں مانا مگر مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور وہی شخص جسے جنوبی غار دکھانے لے گئی تھی اسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ سنا ہے کہ وادی کے پار گھروں میں نوکر رکھے جاتے ہیں اور وہ زیادہ تر ہم جیسے پہاڑی ہوتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی مجھے جنوبی یاد آتی میں اسی غار کا رخ کرتا۔ ایک دن میں دیا سلائی کی پوری ڈبیہ لے کر گیا۔ غار میں سیدھا جانے کے بعد دائیں طرف مڑنے سے پہلے میں نے دیا سلائی جلائی مگر غار میں سے آنے والی تیز ہوا نے اسے فوراً بجھا دیا۔

اس طرح پوری ڈبیہ جلا کر کچھ دور اندر جھانکنے کے بعد میں واپس آگیا تھی بھی لیے وقوفی کی بات بھلا صنوبی اتنی بھولی تھی کہ اندر ہی جا کر بیٹھ رہتی۔

چند دن اور گزر گئے۔ ماں صنوبی کو روتی رہی۔ ابا ماں کو تو سنا رہا اور میں اس بات پہ دل ہی دل میں افسوس کرتا رہا کہ کیوں صنوبی کو اس اجنبی کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر آ گیا۔ اس آدمی کا دبا ہوا روپیہ میں نے اسی دن دریا میں پھینک دیا تھا" گل نے محسوس کیا کہ ریشم کی آواز بھرا گئی ہے اور اس کی آنکھوں میں نمی آگئی ہے۔ بغیر کچھ کہے گل خود اس کے داستان کا سرا پھر سے جوڑنے کا انتظار کرتی رہی۔ سڑک اسی طرح بل کھاتی دریا کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ گل کے ننگے پاؤں ٹھنڈے سے ہو گئے تھے مگر وہ بڑی ہمت سے ریشم کے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر ریشم نے واقعی بات کا ٹوٹا سرا جوڑ دیا۔

"ایک دن ٹہلتے ٹہلتے میں پھر اس غار کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ ہوا میں کچھ عجیب سی بو تھی۔ میں اس اندھیرے غار کے آگے کھڑا یونہی صنوبی کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا کہ ہوا کے ساتھ پھڑپھڑاتی ہوئی کوئی چیز غار سے نکلی اور آ کر میری چادر سے چمٹ گئی۔ میں نے دیکھا وہ دس روپیہ کا نوٹ تھا ـــــ دس روپیہ کا نوٹ اور

اس غار میں سے ۔ میں پریشان ہو گیا ۔ بچپن سے سُن رکھا تھا کہ یہ جادو کا غار ہے اس وقت مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ۔ شام کے اندھیرے نے اور ڈرایا اور میں نوٹ کو دریا کی طرف ہوا میں اچھال وہاں سے بھاگا ۔ غار کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ہوا میں بسی ہوئی بُو اور تیز ہو گئی مگر میں نے اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا نہ ہی یہ بات کسی کو بتائی نہ جانے کیوں اب غار کا لفظ ہی میرے منہ سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا جیسے غار کی بات کرتے ہی سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں نے صنوبی کو اس آدمی کے ساتھ دیکھا تھا اور کچھ نہ کہا تھا ۔ کسی کو کچھ پتہ نہ چلا کیونکہ بستی والے اس غار کی طرف بہت ہی کم جاتے تھے ۔ " ریشم پھر خاموش ہو گیا ۔ اس کی آواز ایک بار پھر رندھ گئی ۔ پھر ہمّت کر کے اس نے کہا ۔ " اس بات کو کئی سال گزر گئے ہیں ، ماں کا خیال ہے کہ صنوبی آج بھی کسی بڑے گھرانے میں نوکرانی ہو گی یا اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اس گھر کے مالک نے اس سے شادی کر لی ہو گی اور اس کی شہزادی سچ مچ کی ملکہ بن کر راج کر رہی ہو گی اور ایک نہ ایک دن ضرور ان سے ملنے آئے گی مگر اب میں بچہ نہیں ہوں ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری بہن گل صنوبر ، ماں کی شہزادی کہاں ہے ۔ اس کی قبر اسی

سیف الملوک غار میں ہے جہاں شہزادے نے کسی شہزادی کو لاکر
رکھا تھا مجھے اس شہزادی کا نام معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ اس
کا نام گل صنوبر نہیں تھا۔ صنوبی کو دور دیس کے اس شہزادے نے
ضرور لالچ دیا ہوگا کہ وہ اسے اپنے دیس لے جائے گا اور کار بن
بنانے والی کسی بستی کی ملکہ بنا کر رکھے گا اور پھر دس روپے کا نوٹ
پھینک کر چلا آیا ہوگا اور شہزادی نے باپ کے ڈنڈے کھا کر
اور بستی میں بدنام ہو کر مرنے سے بہتر بھوک، پیاس اور سردی
میں ٹھٹھر کر مر جانے کو بہتر سمجھا ہوگا اور سردی کے باوجود ایک
دن اس کی لاش سڑ کر بو سے اٹھی ہو گی۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتا رہا پھر بولا "وہ دیکھو وہ قافلہ نظر
آرہا ہے جہاں تمہیں جانا ہے۔ ان لوگوں سے زیادہ باتیں نہ کرنا۔
آپا نے ان کو پیسے دے دیے ہیں تم یہ مت بتانا کہ تمہارے
پاس اور پیسے ہیں۔" پھر یکایک وہ بولا "آج کل میں لکڑی کا ایک
بہت بڑا کھوکھا بنا رہا ہوں۔ اس پر نقش و نگار بناؤں گا اور اس کو
لے جا کر صنوبی کی قبر کے دہانے پر رکھ دوں گا پھر یہاں کو لیجا کر
بتاؤں گا کہ اس کی شہزادی کہیں دور نہیں گئی ہے منے کی طرح
یہاں نزدیک ہی ہے۔ وہ روز جا کر اس کی بھی اسی طرح دیکھ بھال

کر سکتی ہے جس طرح ننھے کی کرتی ہے۔" آہستہ آہستہ آنسو اس کے مردانہ گالوں پر بہنے لگے۔ گل نے بھی پشواز کے پلو سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور پھر قافلے کے نزدیک پہنچنے تک ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ گل کو ان کے حوالے کر کے جب ریشم واپس جانے لگا تو گل اسے سڑک تک چھوڑنے آئی اور اسے کچھ روپے دینے چاہے جنہیں لینے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔ ریشم کی آنکھوں میں شکایت تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو "مانا تم صنوبی نہیں ہو مگر ہم نے تو تمہیں صنوبی ہی سمجھ کر رکھا تھا۔"

خانہ بدوشوں کے ساتھ اس کا یہ سفر زندگی کا کبھی نہ بھولنے والا تجربہ تھا۔ گل ریشم کی ہدایات کے مطابق ان لوگوں سے زیادہ باتیں نہ کرتی، اور کچھ نہیں تو ان کی زبان نہ سمجھنے کا ہی بہانہ کر دیتی حالانکہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو ہی بولنے کی کوشش کرتے۔ ان کا قافلہ ہی کیا ہر قافلہ جیپ ڈرائیوروں کے لیے مستقل دردِ سر تھا۔ سڑک پل صراط سی پتلی تھی ایک طرف پہاڑ دوسری طرف دریا۔ اس پہ بیک وقت چڑھائی اور دہرے ہو جانے والے موڑ طرفہ قیامت اور قدم قدم پہ یہ قافلے۔ گھوڑوں پہ سامان، گدھوں پہ بچے اور مرغیاں، ان کی ٹانگوں کے درمیان الجھتے بے شمار چھوٹے بڑے بچے، ہاتھوں میں لکڑیاں تھامے مرد اور عورتیں اور ان کے

ساتھ موٹی عقل کی بھینسیں اور کیچڑ میں سنی بھوہڑ گائیں. جیپ کو دیکھتے ہی عورتیں اور مرد بغیر سوچے سمجھے جانوروں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیتے جس سے سیدھے سبھاؤ چلتے جانور ایک دم بھڑک کر ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے اور خوب افراتفری پھیلاتے۔ ڈنڈوں کی بارش، جیپ کے ہارن جانوروں کا اصل راستے کے سوا ہر جگہ گھسنے کی کوشش، خانہ بدوشوں کی گھبراہٹ، مسافروں کا خوف بذات خود اک تماشہ تھا جسے دیکھنے میں گل کو بڑا مزہ آتا۔ ایک وقت آیا جب اس نے سوچا کیوں نہ وہ اس قافلے میں مل کر انہیں کی ہو رہے۔ تہذیب کی دُنیا سے دُور بس یہ چلتی پھرتی دُنیا ہی اسے راس آئے گی مگر تہذیب کا مزہ چکھے ہوئے شخص کے لیے فطرت کی گود میں لوٹنا بھی ایسا آسان کام نہیں جلد ہی گل کو اس کا اندازہ ہو گیا. وہ اُونٹ کے بالوں کے بنے ہوئے خیمے میں اُونٹ کے بالوں کے کمبل پر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان میں اجنبی تھی اور یہ اجنبیت قیامت تک دُور نہیں ہو سکتی تھی. پھر اس کے لیے سالوں ایک ہی جوڑے میں گزارہ کرنا ناممکن تھا. مکئی کی روٹی اور لوری کے بھونسڑے ناہرا مکھن کھاتے ہوئے اسے ابکائی آ جاتی تھی. گھوڑے سے گدھوں کی

غلاظت پر ایسے اطمینان سے بیٹھے رہنا جیسے منقش قالینوں پر بیٹھے ہوں
اس کے لیے آسان نہیں تھا اور پھر قافلے کی عورتیں اسے کیسی شک بھری
نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ گل کے پیسے نے ان کی زبان بند کر دی تھی
مگر ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جو ہر وقت تاڑتی تھیں کہ کہیں ان کے
مردوں کی نگاہیں تو گل پہ نہیں پڑ رہیں۔ پیدل چلتے چلتے اس کا سانس
پھول جاتا تھا۔ سخت جوتے سنے اس کے پاؤں زخمی کر دیے تھے اس
لیے اسے اونٹ پر بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی، عورتیں اس کی نازک
مزاجی پر اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنستی تھیں۔

ان عورتوں کے کپڑے زیادہ تر کالے یا سرخ چھینٹ کے تھے۔
سردی کی وجہ سے وہ سب مختلف میل خورے رنگوں کے چھوٹے بڑے
کئی کپڑوں میں لپٹے رہتے جو سالوں کی گرد اور میل سے اَٹ کر بدرنگے
ہو چکے تھے اُوپر تلے کئی قمیصیں چڑھائے رکھنا تو عام بات تھی۔
عورتوں کی شلواریں خوب گھیر دار تھیں جن کے جھول کو وہ آگے رکھنے
کے بجائے مردوں کی طرح ایک طرف سرکائے رکھتیں۔ کیچڑ پانی میں
وہ ننگے پاؤں ہی چلتی تھیں جس سے کیچڑ کا ایک قدرتی جوتا ان کے

پاؤں کے گرد بن جاتا تھا۔ جوتے وہ اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں یا سامان میں ٹھونس دیتی تھیں۔ یہ جوتے سلیم شاہی وضع کے بھدے سے، بھاری اور مردانے جوتے تھے جن کو سلیم شاہی کہنا اس نرم و نازک جوتے کی توہین کرنا ہے۔ سب سے زیادہ مرد جوتے پہنے ہوئے تھے اس کے بعد عورتیں بچوں میں سے کوئی خال خال ہی یہ بوجھ باندھتا۔ ان لوگوں کے پاس سے طرح طرح کی بدبوؤں کے بھبکے نکلا کرتے جو شروع میں تو گل کو ناقابلِ برداشت معلوم ہوئے مگر آہستہ آہستہ اس کی ناک ان سے مانوس ہو گئی۔

گل نے محسوس کیا کہ ان سارے لوگوں کے رنگ گورے اور ناکیں اونچی تھیں۔ ادھیڑ عورتوں اور مردوں کے رنگ جھلسے ہوئے اور کملائے ہوئے تھے مگر جوانوں کے چہروں پہ شادابی تھی۔ اسی قافلے میں دو لڑکیاں ایسی بھی تھیں کہ آدمی دیکھے اور سانس روک لے۔ بے داغ سفید رنگ، پہاڑی سیبوں کے سے سرخ گال، کالی بھنورا سی آنکھیں، لمبے لمبے بال اور جنگلی ہرنیوں کا سا الہڑپن۔ اس سفر میں گل پہ ان کے بالوں کی باریک باریک مینڈھیاں بنانے کی حکمت بھی

کھلی۔ یہ مستقل ہیئر اسٹائل انہیں بہت سے جھنجھٹوں سے بچائے رکھتا تھا۔
لیٹنے بیٹھنے میں نہ یہ اُلجھتے تھے نہ چلنے پھرنے میں اڑتے تھے ورنہ روزانہ
روز کہاں انہیں سلجھاتی پھرتیں۔ قافلہ صبح دم چل کر رات کو ٹھہرتا۔ درمیان
میں کھانے کے اوقات ان کے آرام کے اوقات ہوتے، جانوروں
کے پیٹھ پر سے لکڑیاں اتاریں، آگ جلائی، مکئی کی روٹیاں تھوپیں۔
اور مکھن کے ساتھ کھالیں، مکھن کے جمے ہوئے تودے ہر وقت ان کے
ساتھ ہوتے تھے۔ اونٹ کی ہلڑ جلڑ چال اس کا جوڑ جوڑ ہلا دیتی
تھی اور وہ زخمی پیروں سے پیدل گھسٹنے کو اونٹ پہ بیٹھنے پر ترجیح دیتی
تھی۔ ہر پڑاؤ پر اور ہر نئے سفر میں ساری زندگی خانہ بدوشوں کے
ساتھ رہنے کے عزم پہ زد پڑتی، چنانچہ بہت جلد اس نے ساری
عمر کو پنڈی تک ان کے ساتھ رہنے سے بدل دیا، پھر جلد ہی یہ منزل
پنڈی کے بجائے ایبٹ آباد ہوگئی اور اس کے بعد بالاکوٹ ہی میں
موقع پا کر اس نے ایک ریسٹ ہاؤس میں جا کر اپنا لباس بدلا اور
بس میں سوار ہوگئی۔

پنڈی پہنچ کر ماجد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے گل سوچ رہی

تھی۔ کیا وہ سب لوگ اب بھی ویسے ہی ہوں گے؟ کیا اسے مصیبت میں پاکر ماجد اسے کسی طرح کا سہارا دینے کو تیار ہوگا اس کے باوجود کہ جب اس نے سہارا مانگا تھا تو گل نے صاف انکار کر دیا تھا۔ شاید وہ ان نیکدل سیدھے سادے لوگوں میں رہ سکے۔ گھر سے کچھ دور تانگے سے اُتر کر وہ آگے بڑھی۔ بغیر دروازہ کھٹکھٹائے وہ اندر داخل ہو گئی دیکھیں سب سے پہلے اسے کون ملتا ہے۔ ماجد کی امّی سامنے کھڑی ستونوں کے ساتھ رکھے ہوئے بیلے کے گملے میں پانی ڈال رہی تھیں۔ سفید موٹے موٹے بیلے کے پھولوں نے گل کو حیرت سے دیکھا۔

"امّی!" بے ساختہ گل کے منہ سے نکلا۔ ماجد کی امّی نے پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہ گئیں۔

"گل ہو؟ —— یوں حیران ہو کر کیا دیکھ رہی ہو، یہ ماجد کی آنکھیں ہیں۔" انہوں نے لوٹا زمین پر ٹپکا اور لپک کر اسے گلے سے لگا لیا۔ گل کے ذہن میں بے شمار پٹاخے سے چھوٹنے لگے۔

"امّی آپ کی آنکھیں؟"

"میری کہاں ہیں بچی، کہا تو ماجد کی ہیں —— جانے سے پہلے

مجھے دے گیا ___ کیسا پیارا، کیسا معصوم کیسا ہر ایک کا خیال کرنے والا بچہ تھا۔"

"جانے سے پہلے، کہاں؟" گل نے ذہن کے اُلجھے دھاگوں کو بغیر سلجھائے پوچھا۔

"ارے بیٹی، اس دُنیا سے کہاں جاتا ہے انسان، دوسری دُنیا میں اللہ میاں کے پاس اور کہاں۔"

دفعتاً گل نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور تخت پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ماجد کی امی بھی اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بیٹی نیک روحوں کو خدا جلد اپنے پاس بلا لیتا ہے ___ اسے خون کا کینسر ہو گیا تھا۔ نیا خون نہیں بنتا تھا۔ اُوپر سے خون دے دے کر ڈاکٹروں نے اس کا بدن چھلنی کر دیا تھا مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ اس لیے کہ مجھے تکلیف ہو گی۔ سب کچھ چپ چاپ سہتا رہا ___ جانے کب چپکے ہی چپکے اس نے ڈاکٹر سے یہ اٹ سٹ کر لی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی آنکھیں میرے لگا دیں، دیکھو کیسی فٹ بیٹھی ہیں کوئی کہہ سکتا ہے یہ میری آنکھیں نہیں ہیں۔

کہیں پہلے زمانے میں یہ باتیں سنی تھیں ؟ اور اب دیکھو وہ منوں مٹی کے نیچے چلا گیا مگر میں اس کی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ کاش اس کا سارا جسم اسی طرح میرے جسم میں سما جاتا تو میں کتنی خوش ہوتی؟
ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر ایسے ہی جیسے کھل کر برس جانے والے بادلوں میں پانی کا ایک آدھ قطرہ۔ گل زار و قطار رو رہی تھی۔ ماجد کی امی نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور کہا "بس کر بچی ——— میرے لیے تو نہیں مگر دنیا کے لیے یہ بات پرانی ہو گئی، ارے نجمہ! رخسانہ آؤ دیکھو کون آیا ہے۔"

کمروں سے لڑکیاں نکل نکل کر آئیں اور وہ سب سے لپٹ کر دل پھاڑ کر روئی۔ ہائے اس کھل کر رو لینے میں کتنا سکون تھا! ساری بہنیں اسے دیکھ کر بڑی خوش ہوئیں اور سب نے ہی اس کے اس قدر کمزور ہو جانے پر تعجب کا اظہار کیا۔ خود گل کو احساس نہیں تھا کہ وہ اتنی دبلی ہو گئی ہے مگر ان لڑکیوں کے بار بار ذکر پر اسے یقین ہو گیا کہ یہ تبدیلی خاصی نمایاں ہے۔ وہ سب بڑی اپنائیت اور خلوص سے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اسے ماجد کی بیماری کے

قصّے سناتی رہیں۔ نجمہ اسے اپنا اسپتال دکھانے لے گئی۔

"ماجد بھیّا نے اپنی زندگی ہی میں یہ کلینک شروع کروادی تھی۔ ہم سب بہنیں اور امی ملا کر اسے چلا رہی ہیں۔"

"کیا اس میں مجھے جگہ نہ دے دو گی نجمہ؟" گل نے کہا۔ نجمہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"گل یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ——— آپ کے شوہر؟"

"ہم دونوں علیحدہ ہو چکے ہیں، نوکری کی تلاش میں ہوں ——— اگر اسی کلینک میں مجھے نرس کی جگہ ———"

"گل ایسی بات نہ کہو" نجمہ نے گل کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "تم جب تک چاہو، ساری عمر ہمارے پاس رہو ہم تمہیں کبھی غیر نہیں سمجھیں گے۔ ماجد بھیّا نے زندگی میں صرف ایک تمہیں کو چاہا تھا۔"

اس کی آواز رندھ گئی۔ گل نے حیران ہو کر اسے دیکھا، پھر پلکیں جھکا لیں۔

"کیا انھوں نے یہ بات کہی تھی؟"

"ہاں، صرف مجھ سے ——— مرنے سے چند دن پہلے انھوں نے

تمہارے دیے ہوئے گلدان کی طرف اشارہ کر کے مجھے سارا قصّہ سنایا تھا۔ ان کے سنانے سے پہلے بھی ہمیں اس بات کا شک ضرور تھا۔ تمہاری موجودگی سے انہیں جو خوشی ہوتی تھی وہ ہم سے چھپی نہیں تھی۔"

"نجمہ! بعض دفعہ کھونے کے بعد ہی انسان کو پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی بے وقوفی سے کیا چیز گم کر دی۔" گل نے کہا۔

"گئی گزری باتوں کا کیا ذکر گل —— بھیّا جذباتی تھے۔ ہم پانچ بہنوں اور امی کی خوشیوں کے واحد مرکز تھے اس لیے ان میں اور بھی جذباتیت آ گئی تھی۔ نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں پا کر ان کا رویہ کیا ہوتا مگر تمہیں نہ پا سکنے کی وجہ سے وہ تمہیں کبھی نہ بھول سکے۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو کچھ اور باتیں کرو۔"

"یہ بتلاؤ کیا آخری وقت تک امی کو پتہ نہیں چلا کہ ماجد کی ایک ٹانگ نہیں ہے۔"

"ہاں انہیں پتہ نہیں چلا، ہم نے اب تک یہ بات ان سے چھپا رکھی ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ امی کی آنکھیں بعد میں روشن ہو گئیں سچ

ہے اللہ میاں کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔"

"امی تو ماجد کو یاد کر کے بہت روتی ہوں گی۔"

"نہیں، گل تمہیں حیرت ہو گی کہ وہ ہم سے زیادہ نہیں روتیں۔ ان میں کچھ عجیب ناقابلِ یقین قسم کا صبر ہے۔ تم یہاں رہو گی تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیسی باہمت اور صابر عورت ہیں، ہم لڑکیاں تو ان کے سامنے بہت ہی حقیر نظر آتی ہیں، بجائے اس کے کہ ہم ان کو سہارا دیں وہ ہماری ہمت بندھاتی ہیں اور جب تم ہمارے ساتھ رہو گی تو تمہیں یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنی ترقی پسند ہیں۔ وہ روایتوں کو توڑنے میں ہم سے زیادہ جی دار ہیں" نجمہ گل کے اس گھر میں رہنے کا ذکر یوں کر رہی تھی جیسے یہ بات قطعی طور پر طے ہو چکی ہو۔ "آؤ اب چلیں کچھ دیر آرام کرو تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔" نجمہ نے اس کی پتلی سی کلائی تھامی اور بولی۔ "واقعی تم کتنی دُبلی ہو گئی ہو" اور پھر یکایک وہ چلائی۔ "ارے تمہیں تو بخار ہے"

گل کو خود بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم ڈھیر ہوا جا رہا ہو مگر وہ اسے ذہنی کوفت اور مستقل چلتے رہنے کا سبب سمجھ رہی تھی

اس کو فوراً لٹا دیا گیا اور ساری بہنیں اس کی تیمار داری پر جٹ گئیں۔ نجمہ اس کے کاموں میں سب سے آگے آگے رہتی تھی۔ وہ دونوں پکی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ماجد کی امی اس کے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آتی تھیں جیسے وہ ان ہی کی بچی ہو۔ بعض دفعہ گل کو لگتا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے جلد ہی یہ خواب ٹوٹ جائے گا اور وہ پھر بکھر کر تنہا رہ جائے گی۔ کبھی کبھی جذباتی ہو کر جب وہ ایسی باتیں کرتی تو نجمہ اسے یقین دلاتی کہ اس کے لیے کوئی بھی تو خاص طور پر کچھ نہیں کر رہا۔ گھر کا اسپتال ہونے کی وجہ سے سارے کام خود ہی انجام پا رہے ہیں گل جانتی تھی کہ اس کی دوا اور غذا ہی نہیں چھوٹی سے چھوٹی ہر ضرورت کا اہتمام خاص طور پر ہوتا تھا۔ اس کی وجہ انسانی ہمدردی تھی یا یہ بات کہ ان کے لاڈلے ماجد کی نظرِ عنایت اس پر رہی تھی۔

ایک رات گل کی آنکھ اچانک کھلی تو کوئی سایہ اس کے نزدیک کھڑا اس پر دم کر رہا تھا۔ جب سایہ پلٹا تو وہ پکاری "امی"

ماجد کی امی لوٹیں اور خفیف ہو کر بولیں "شاید میری آہٹ سے تمہاری آنکھ کھل گئی، سو جاؤ بیٹی، میں تو دم کرنے آئی تھی"

دفعتہً مکمل رو پڑی۔ اتنی محبت، اتنا پیار اس ہستی کے لیے جسے
آج تک صحیح معنوں میں کسی نے نہیں چاہا۔ انہوں نے پیار سے گل
کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس رات گل نے اپنی ساری داستان،
وہ داستان جو شاید اپنی سگی ماں کو نہیں سنا سکتی انہیں سنا دی۔ اس لیے
بھی کہ وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی اور یہ احساس بھی تھا کہ اگر
باقی عمر ان کے ساتھ گزارنی ہے تو ان کا حق ہے کہ وہ اس کے ماضی سے
آگاہ ہوں، اگر وہ اسے اس قابل نہیں سمجھیں گی تو وہ خاموشی سے یہاں
سے چلی جائے گی اور شہناز کے اسپتال میں رہ پڑے گی۔ اس کی کہانی کے
دوران ان کے چہرے پر گہری افسردگی اور سکوت طاری رہا۔ اس کی
بات ختم ہوئی تو انہوں نے اسے لٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا "اللہ تمہیں
صبر دے گا۔" انہوں نے کہا اور آہستہ سے دروازہ بند کرتی ہوئی باہر
چلی گئیں اور آج جب وہ لاہور کے لیے روانہ ہو رہی تھی تو انہوں نے
تنہائی میں اس سے کہا۔

"واپس ضرور آ جانا گل، تمہارے بیٹے کو ہم ماجد سمجھ لیں گے اگھر
میں کوئی مرد تو ہوگا اور کیا، ہم اس کی خدمت کریں گے سب مل کر،

اللہ نے چاہا تو وہ اچھا ہو جائے گا۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے امّی" گل نے کہا۔

"بیٹی، دنیا کے دکھ دیکھ کے انسان اپنے غم بھول جاتا ہے۔ تم ایسی پھول سی بچی کو بے سہارا دیکھ کر دل پھٹتا ہے ــــ ایک ہی بچہ اور وہ بھی اپاہج ــــ میرے بیٹے کی ٹانگ تو اس عمر میں گئی تھی پھر مجھے یہ تسلی تھی کہ اس نے ملک اور قوم کی خاطر ایک ٹانگ کی قربانی دی اور وہ نقلی ٹانگ کے ساتھ چل پھر تو سکتا تھا مگر تمہارا بچہ ــــ"

"امّی ــــ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ماجد کی ایک ٹانگ ــــ؟"

"ہاں بیٹی ــــ وہ بیمار تھا، راتوں کو اٹھ کر اسے دیکھا کرتی تھی۔ ایک رات اس کی ٹانگوں پہ بل ڈال رہی تھی تو میں بہت دیر تک اس کی دوسری ٹانگ ڈھونڈتی رہی، پھر مجھے پتہ چل گیا کہ اس کی دوسری ٹانگ نہیں ہے۔ مگر میں نے اس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی ٹانگوں کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لڑکیوں کو بھی پتہ نہیں کہ مجھے یہ راز معلوم ہو گیا تھا۔

انسان کے نصیب میں ایک دکھ یہ بھی ہے بیٹی کہ ایک دوسرے سے اپنے گھاؤ چھپائیں۔" وہ رونے لگیں، گل بھی رونے لگی۔ پھر انہوں نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا "میں بھی کبھی نہیں اپنی کہانی سناؤں گی —— پھر کل آجاؤ گی نا، ابھی تو تم بالکل ٹھیک بھی نہیں ہوئی ہو۔"

"شاید شہناز روک لیں مگر دو چار دن میں ضرور آجاؤں گی۔"

"ضرور —— دیکھو میں انتظار کروں گی۔"

"ہاں ہاں امی ضرور، وعدہ ہے۔"

گل نے امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پھر باری باری ان کی دونوں آنکھیں چوم لیں۔

جس وقت گل پہنچی شہناز اسپتال میں مریضوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے وہ سیدھی گھر چلی گئی۔ گھر میں چکر لگاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ پچھلے برآمدے میں کوئی مرد آرام کرسی پہ دراز اخبار دیکھ رہا ہے، اس کے ہاتھ میں کافی کی پیالی ہے۔ اس کے لباس اور انداز نشست سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ اس گھر میں خاصا بے تکلف ہے، دنوں سے نہیں تو گھنٹوں سے ضرور یہیں بیٹھا ہے۔ تجسس نے

اکسایا۔ ایک کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا اور ٹھٹک گئی "ارے شمسی"۔
وہ فوراً پلٹی۔ اب وہ کیسے ان کا سامنا کر سکتی ہے۔ نہیں وہ کبھی ان کے
سامنے نہیں آئے گی۔ ان کی گل ——— اگر وہ ان کی تھی تو برف کے نیچے
دب کر ختم ہو چکی ہے۔ وہ گھر سے نکلی اور اسپتال کے چکر کاٹنے لگی۔
شہناز کام سے فارغ ہو کر نکلیں تو برآمدے میں گل کو کھڑے دیکھ کر
حیران رہ گئیں۔

"ارے تم کہاں چلی گئی تھیں اور اتنی کمزور کیسے ہو گئی ہو؟"

"میں اپنے بچے کو لینے آئی ہوں" گل نے ان کے سوال کو نظر انداز
کر کے کہا۔

"شمسی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں ——— عجیب بات ہے
آخر تم تھیں کہاں، جمال وہاں اکیلا پہنچا اور اس نے کہا کہ تم اس کے ساتھ
آنے کو تیار نہیں ہوئیں یہ کیا معمہ ہے، شمسی صاحب نے کئی خط بھیجے اور
پریشان ہو کر خود چلے آئے، آؤ چلیں، وہ گھر میں ہیں"

"میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گی"

"کیوں؟ کیا لڑائی ہو گئی ہے ان سے؟"

وہ چلیں تو گل کو بھی قدم ملانے پڑے۔ مگر ان کو گھر کی طرف جاتے دیکھ کر وہ اسپتال کے ایک خاموش کنج کی طرف مڑ گئی۔ مجبوراً شہناز اس کے ساتھ آئیں۔ وہاں پتھر کی ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے گل نے کہا "شہناز آپ نے ایک دفعہ میری مدد کی تھی، آپ مجھے ثریا کی جگہ سمجھتی ہیں نا آج میں آپ سے آخری درخواست کرتی ہوں کہ آپ شمسی کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے گل، وہ تمہاری خاموشی سے پریشان ہو کر اتنی دور آئے ہیں۔ جب انہوں نے آن کر تمہاری بابت پوچھا تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ قصہ کیا ہے، احتیاطاً میں نے کہہ دیا کہ تم اپنی سہیلیوں سے ملنے پنڈی چلی گئی ہو۔ اب تم آئی ہو تو میں انہیں اندھیرے میں کیسے رکھ سکتی ہوں۔"

تو انہیں کچھ معلوم نہیں کہ اس پہ کیا بیتی۔ ابھی وقت ہے کہ وہ چپ چاپ ان کے ساتھ چلی جائے، مگر کیا وہ ایسا کر سکتی ہے۔ وہ خود کو کب تک دھوکا دے گی آخر۔

"میں انہیں خود اطلاع دے دوں گی کہ میں خیریت سے ہوں مگر

میرے یہاں ہوتے ہوئے آپ انہیں میری موجودگی سے آگاہ نہ کریں۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ اب میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی، قیامت تک بھی نہیں۔"

"کیا وہ اتنے برے ہیں؟"

"وہ برے نہیں ہیں، وہ دنیا کے بہترین انسان ہیں۔ میں خود سے مقابلہ کرتی ہوں، تو اپنی شکل سے نفرت ہو جاتی ہے، میں خود کو ان کے قابل نہیں پاتی۔"

"یہ فلمی مکالمے یہاں نہیں چلیں گے" شہناز دفعتہً بگڑ گئیں "تمہیں جو کچھ کہنا ہو ان کے سامنے کہنا، آخر تمہیں ان سے کیا شکایت ہے۔"

"مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دینا چاہتی ہوں میں اپنا سارا وقت اور ساری توجہ صرف کر کے اس کو مکمل طور پر

صحت مند کر دینا چاہتی ہوں تاکہ وہ بڑا ہو تو اپنے وجود پر شرمسار نہ ہو۔"

"کیا شمسی صاحب نے اسے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا ہے؟"

"میں نے ان سے نہیں پوچھا نہ اس کا موقع ہے جب کہ میں خود ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔"

"کیا تم کسی اور کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟" انہوں نے گل کو گہری نگاہ سے دیکھا۔

"نہیں میں کسی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، میں پنڈی کے ایک اسپتال میں کام کروں گی اور اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گی"

"تم اتنے دن نوکری تلاش کرتی رہیں؟"

"اتنے دن میں ایک طویل ذہنی اور جسمانی سفر سے گزری ہوں۔ اب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا دل کھنکھناتا ہوا خالی ٹین ہے جس میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"اس سفر میں جمال تمہارے ساتھ تھا؟" شہناز نے پوچھا۔

"شروع میں۔"

"پھر اس نے تمہیں چھوڑ دیا؟"

"اس نے مجھے نہیں چھوڑا ـــــ مجھے یکایک احساس ہوا کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے، مجھے کسی سے محبت نہیں ہے، کسی سے بھی نہیں۔"

"پھر خودکشی کا ارادہ ہے؟" شہناز نے تلخی سے پوچھا۔

"نہیں" گل بولی "نہ خودکشی کا ارادہ ہے نہ سنیاس لینے کا خیال ہے۔ بہت سے طوفانوں سے گزرنے کے بعد تھوڑا سا سکون چاہتی ہوں۔"

"تاکہ آرام کے بعد اس سے بھی اونچی پرواز کر سکو۔"

"شہناز آپ میری محسن ہیں، آپ کو تلخ ہو جانے کا بھی حق ہے مگر میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں شمسی کی راہ کا پتھر ہوں میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتی، البتہ آپ یہ کام کر سکتی ہیں، آپ ان کی صحیح معنوں میں ساتھی بن سکتی ہیں، جیون ساتھی بھی اور کام کی ساتھی بھی۔"

"کیا بک رہی ہو؟"

"شہناز آپ پریکٹیکل عورت ہیں اور میں بھی جذبات سے بلند ہو کر

یہ بات کہہ رہی ہوں کہ آپ ان کا ہاتھ تھام لیجیے۔ آج انہیں آپ کے لان میں بیٹھا دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے وہ یہیں ہونے چاہئیں۔"

"تم بڑی بہن کے ساتھ ایسی گستاخی بھی کر سکتی ہو۔"

"یہ گستاخی نہیں چھوٹی سی التجا ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ شمسی آپ کے کام میں رخنہ نہیں ڈالیں گے، وہ تو بہتا دریا ہیں۔ وہ آپ کے پاس ہیں انہیں دیکھئے، پرکھیے، سچ کہتی ہوں میرے تصور میں اس سے بہتر جوڑا نہیں آتا۔ آپ چاہیں گی تو وہ آپ کے ساتھ لاہور آ رہیں گے۔ وہ اپنی مرضی کو یوں آپ کے مطابق ڈھال لیں گے کہ آپ کو شبہ بھی نہیں ہوگا کہ یہ خود ان کی رضا نہیں ہے۔ وہ احسان جتانے کے نہیں کرنے کے عادی جیسے آپ، بالکل آپ —— دنیا انہیں بے وقوف اور زن مرید سمجھتی ہے مگر ایسا نہیں ہے، وہ بہت عظیم انسان ہیں، وہ غلطی کر کے اسے قبولنا بھی جانتے ہیں اور معاف کرنا بھی۔ وہ اپنے خیالات انسان پر مسلط کیے بغیر بھی انہیں بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھ میں ایک بہت بڑا اور ناقابلِ یقین تغیر کر دیا ہے وہ یہ کہ میرے دل میں مردوں کی نفرت نہیں رہی۔ اگر دنیا میں شمسی اور ماجد جیسے مرد ہیں تو ان سے

نفرت نہیں کی جا سکتی۔"

"اگر شمسی اتنے ہی اچھے ہیں تو تمہارے پاس ان کے ساتھ نہ رہنے کا کیا جواز ہے؟"

"بتا تو رہی ہوں کہ شاید میرے لیے کسی کو دل میں بسانے کا وقت گزر گیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنانے کا بھی ایک خاص وقت ہوتا ہے اگر اس وقت انسان کسی کا نہ ہو سکے اور کسی کو اپنا نہ بنا سکے تو پھر وہ کبھی کسی کا نہیں ہو سکتا۔ محرومی اس کی ذات سے چمٹ جاتی ہے۔ وہ بار بار محبّت کے فریب میں مبتلا ہوتا ہے مگر محبّت نہیں کر سکتا۔ وہ جادو کی اس بوتل کی طرح ہو جاتا ہے جیسے سمندر میں پھینک کر گھر آؤ تو وہ جوں کی توں طاق پہ دھری ہو۔"

"تمہاری یہ ادبی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ اب میں کسی کی نہیں ہو سکتی، اب میں صرف اپنے نجم سے محبّت کرنا چاہتی ہوں، ماجد کی بہنوں سے پیار کرنا چاہتی ہوں اور اس کی بوڑھی ماں سے جس کی آنکھوں کے حلقے میں ماجد کی آنکھیں ہیں اور جو مجھے آج بھی بڑے پیار سے دیکھتی

ہیں۔"

"یہ ماجد کون ہے، آج تمہاری باتوں میں اس کا ذکر بار بار آرہا ہے؟"

اس سے پیشتر کہ گل جواب دے اسپتال کی عمارت کے پیچھے سے اچانک ایک سایہ اُبھرا، ٹھٹکا اور پکارا۔ "گل!"

گل نے چونک کر ادھر دیکھا۔ پھر اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گری اور سبز مخملیں گھاس پر ڈھیر ہوگئی۔

شمسی صاحب اور شہناز دونوں ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے۔

ختم شد

رضیہ فصیح احمد

کا

"آدم جی" ادبی انعام یافتہ ناول

آبلہ پا

قیمت بارہ روپے

مقبول اکیڈمی، چوک انارکلی پوسٹ بکس نمبر ۸۲۴ لاہور

زبیدہ سلطانہ
کے
مشہور و معروف ناول

ابرِ بہاراں	9—00
سدرہ	9—00
نذرانہ	9—00
جوہر	9—00
طاہرہ	9—00
فیروزہ	7—50

مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور